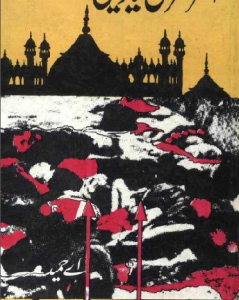


امرتسر کی یادیں



احمد

امرتسری یادیں

پیارے بیٹے حافظ محمد رفیع فراہ کے لئے
محبت سے لکھی گئی

احمد حمید

اس کے محمد

الذکر ۶۹۹

۱۲/۱۱

۱۰۶

مکتبہ عالیہ لاہور

"امبرسریوں"

فہرست کے نام

آمرتسری کی یادیں

اے حمید

ناشر : محمد جمیل انبسی

طابع : ایف۔ ڈی پرنٹرز، لاہور

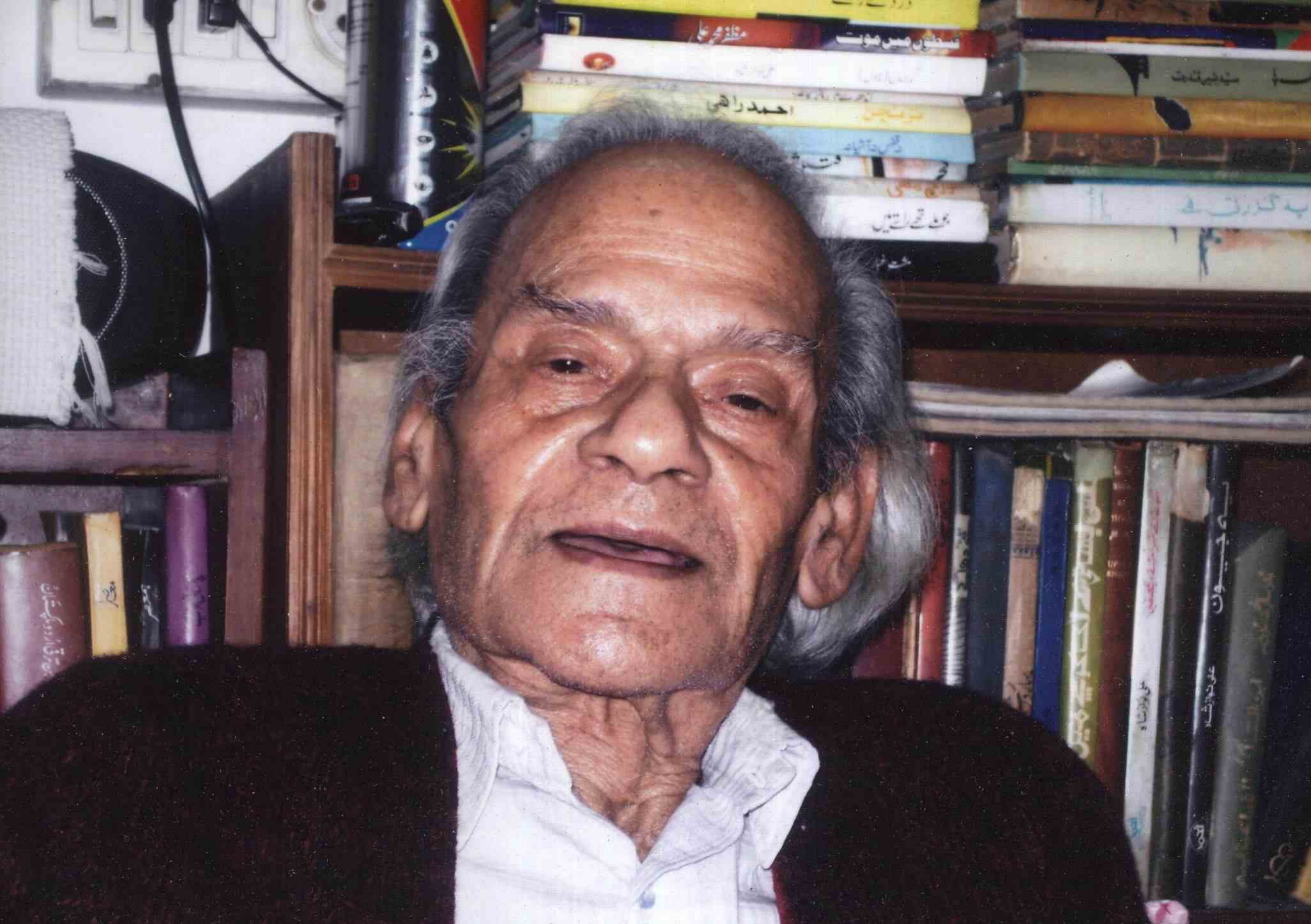
سرورق : طاہر رشید

قیمت

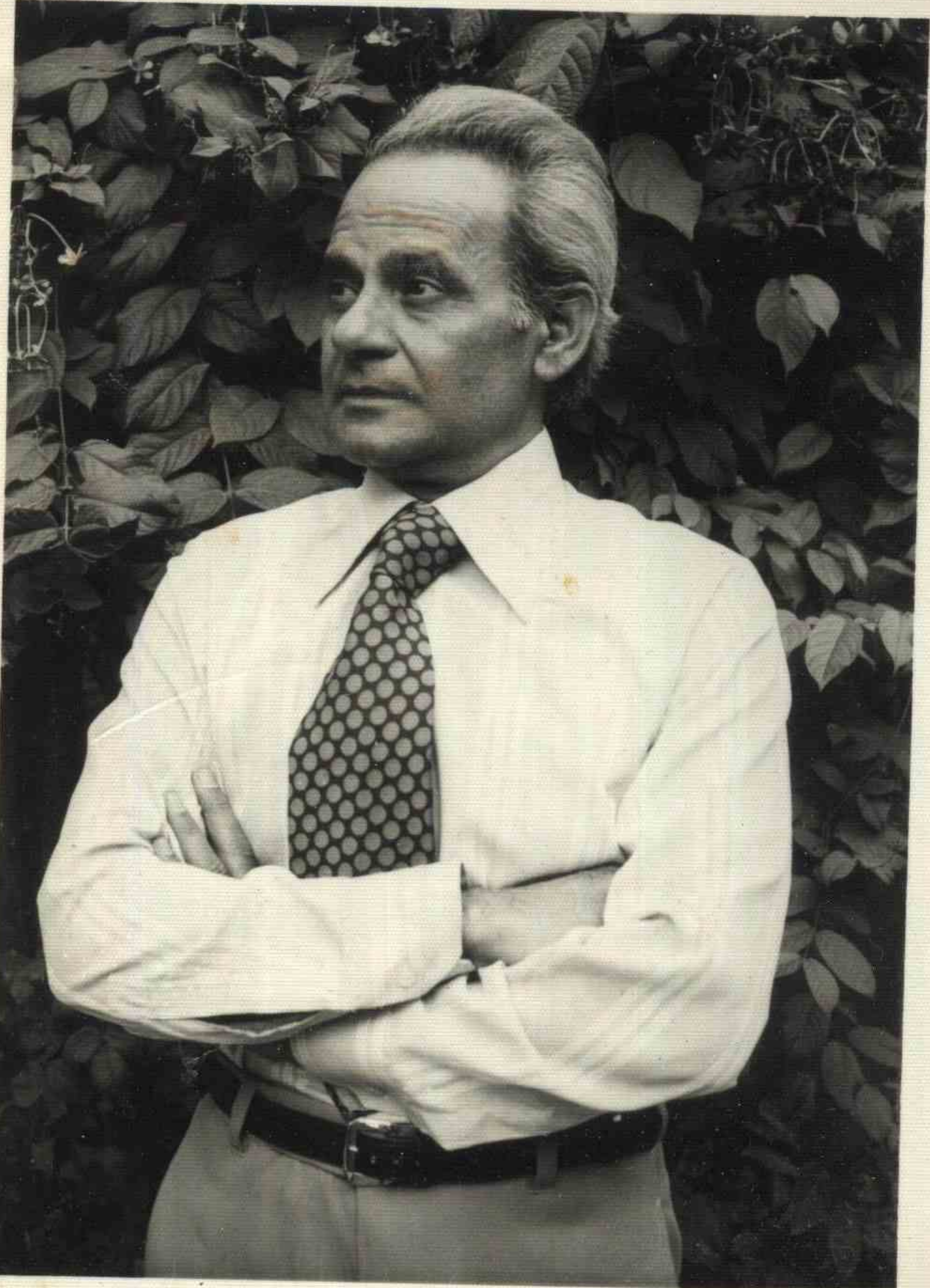
۲۰۰/-

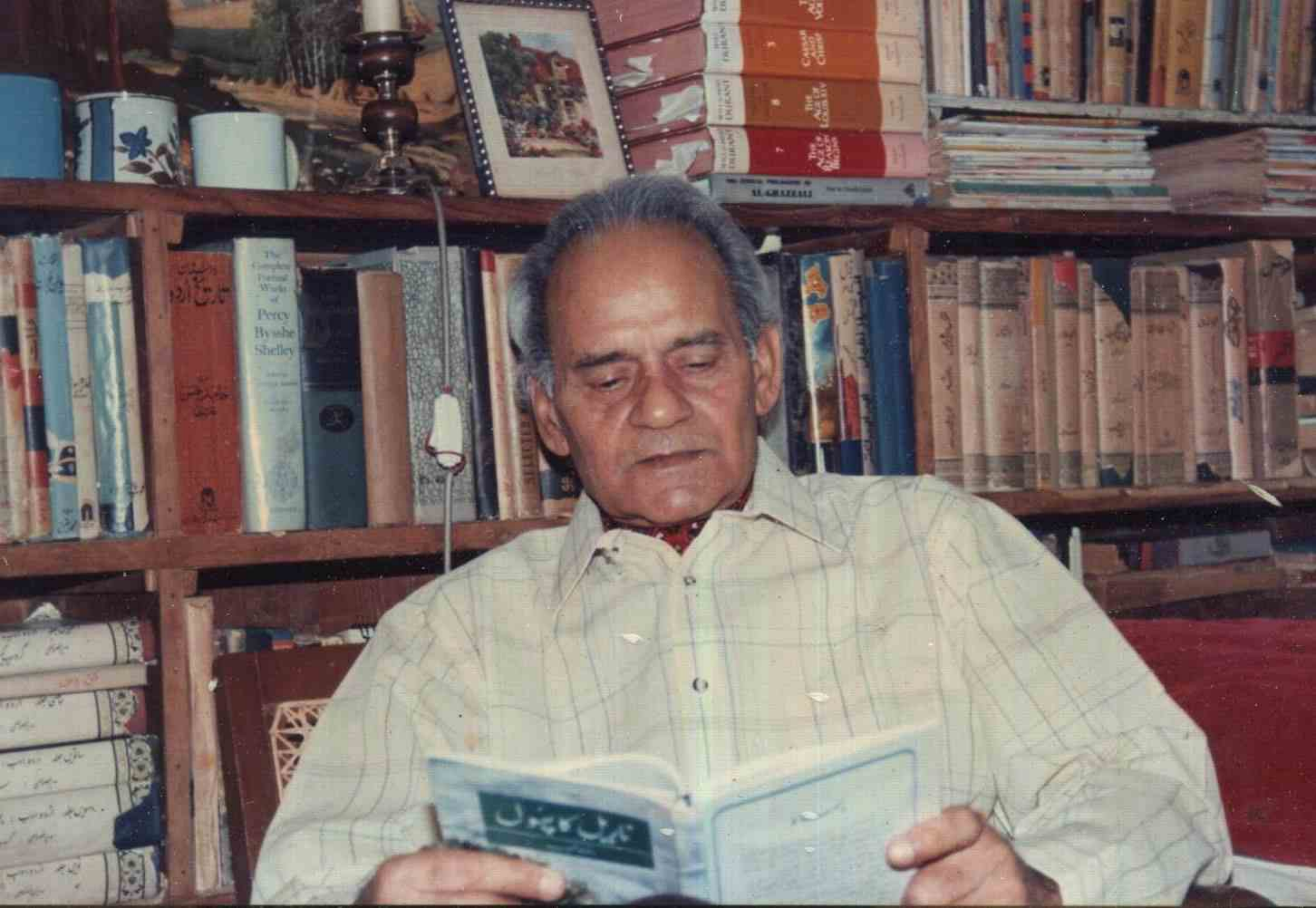
یکے از مطبوعات

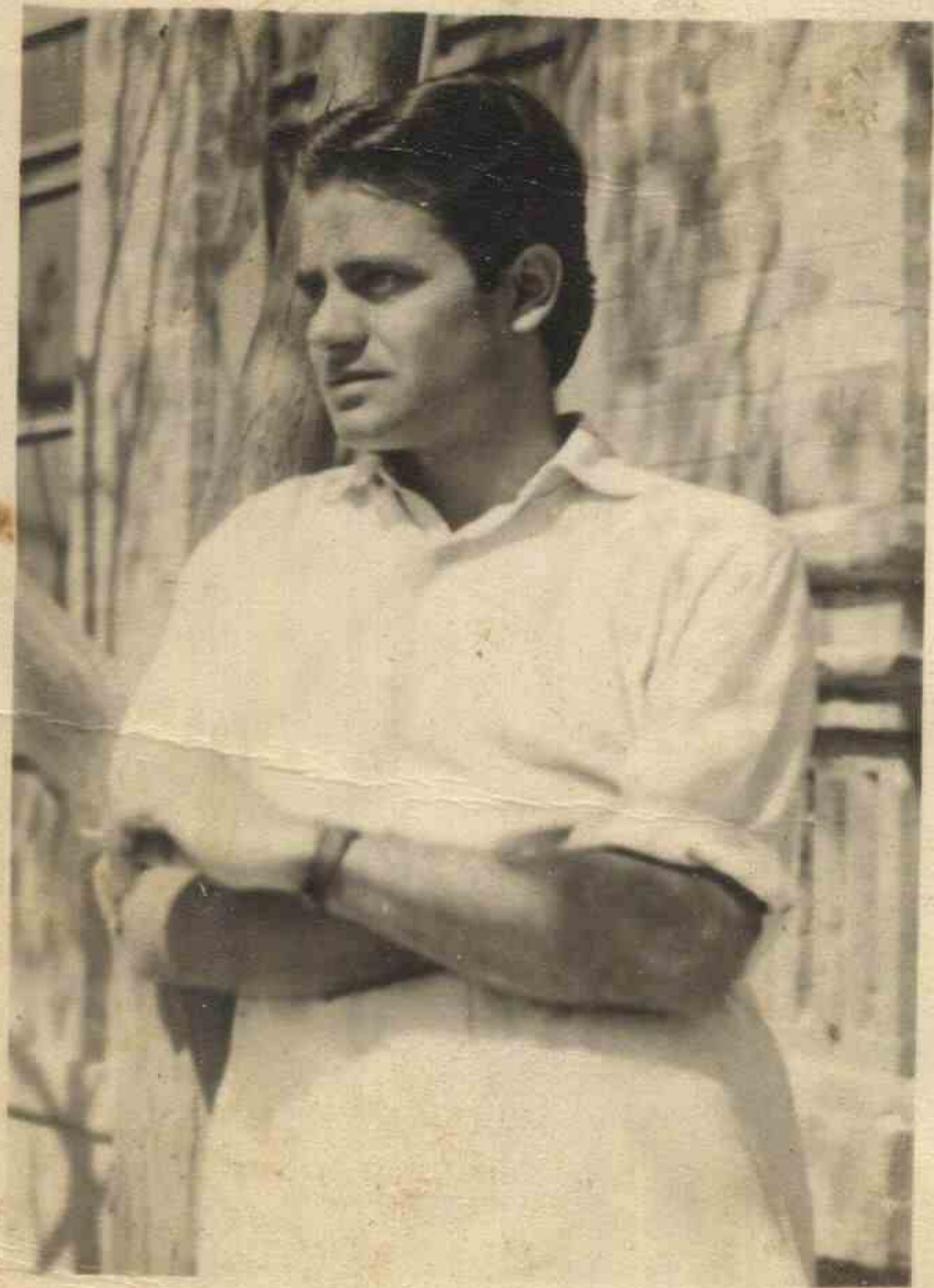
مکتبہ عالیہ آفس : ایک وڈ (انارکلی) لاہور
شوروم : اردو بازار















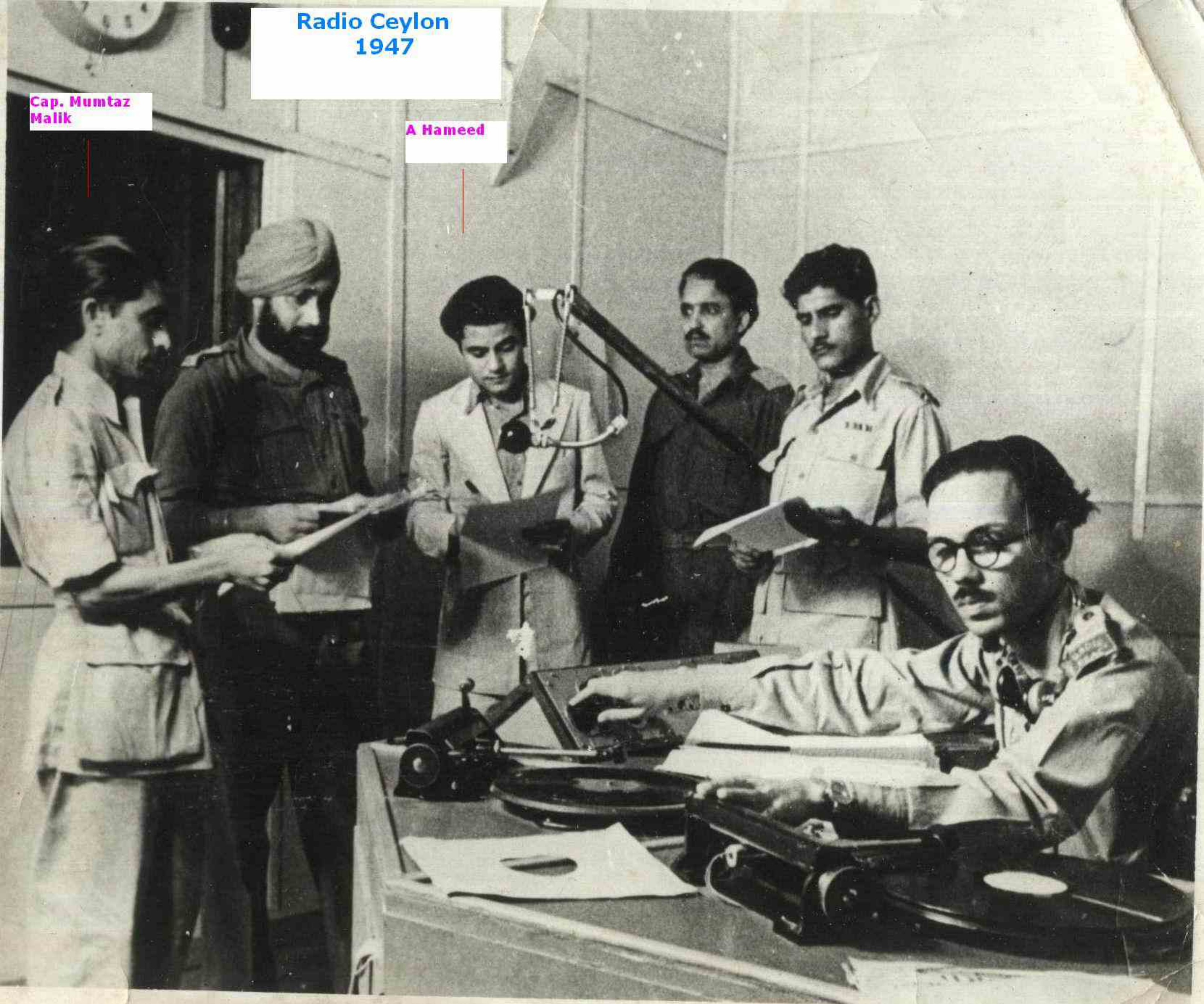


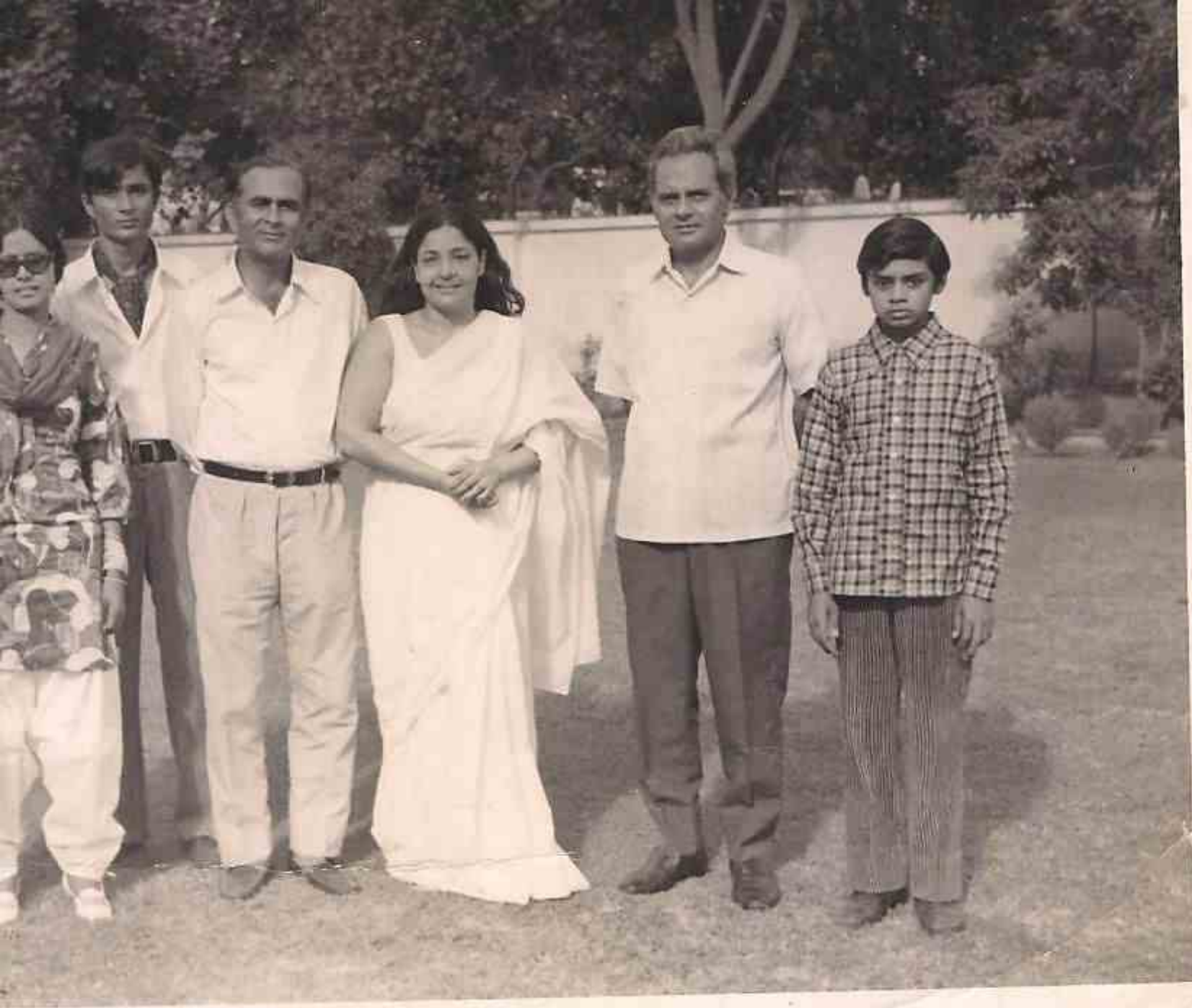


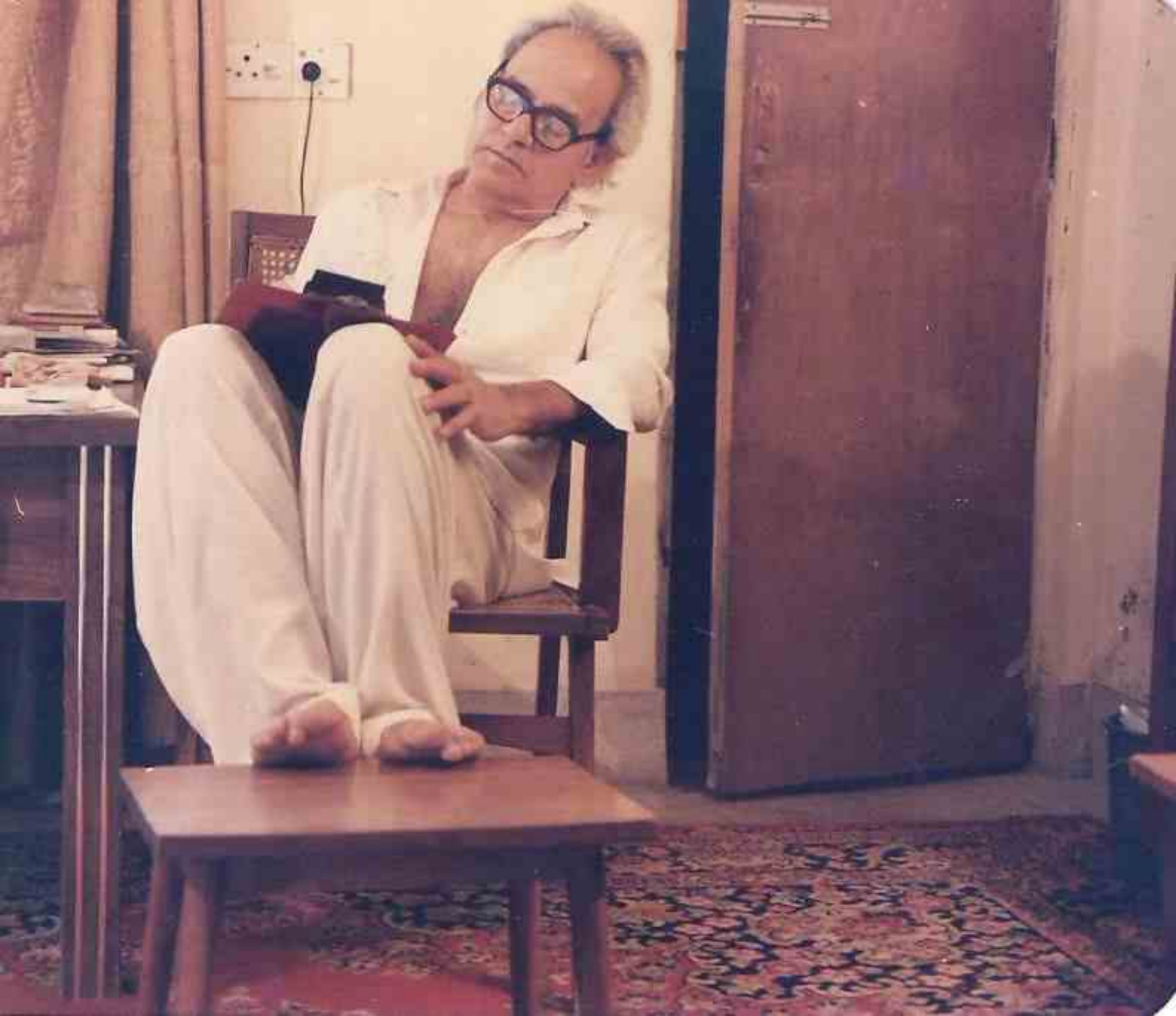
Radio Ceylon
1947

Cap. Mumtaz
Malik

A Hameed

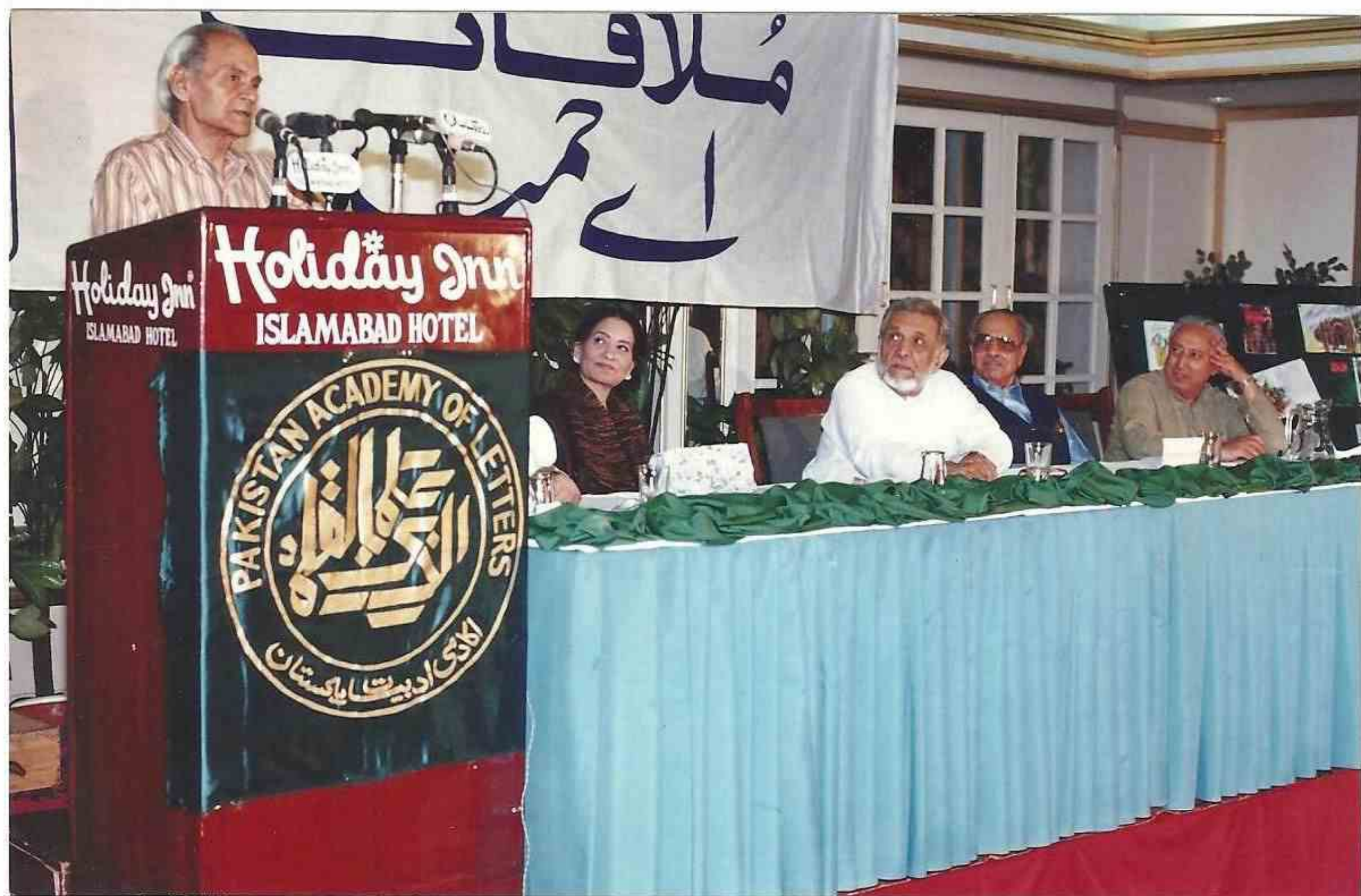


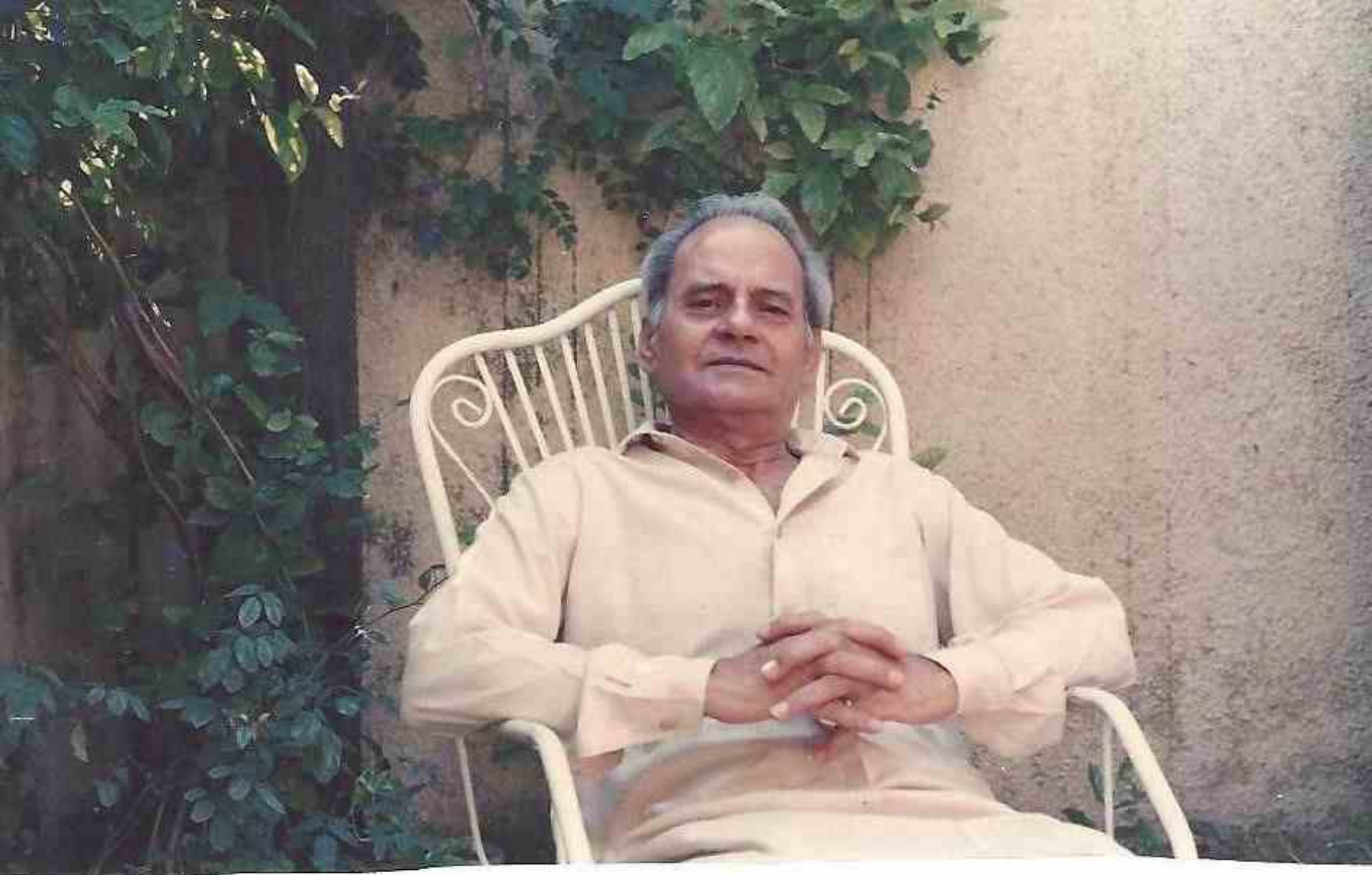




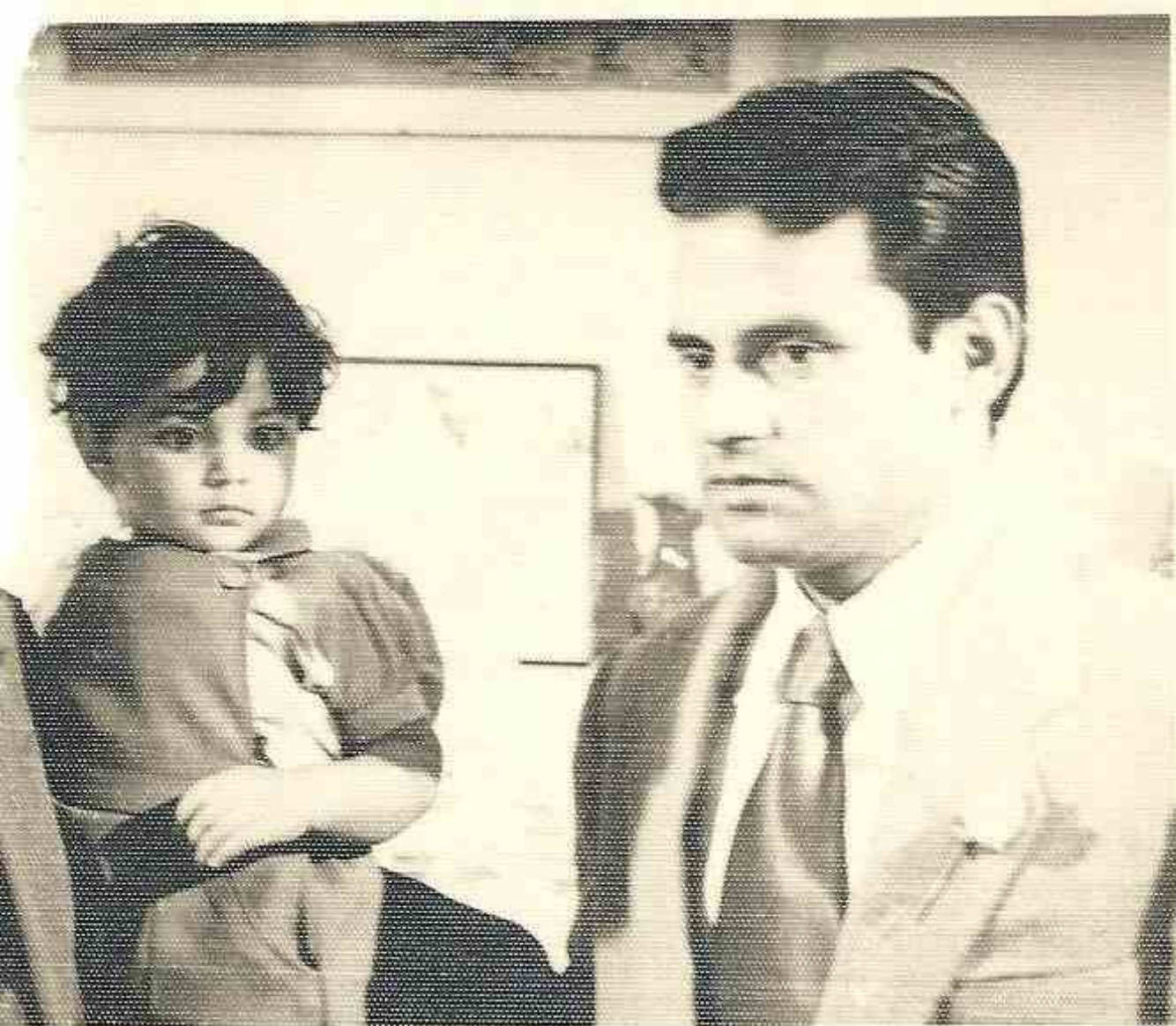
A Hameed













A Hameed at his Residence,
Lahore-Taken By: Rashid Ashraf in
March 2007





(ساحر لہ بھانوی کے پسے ہوئے اور کوٹ میں) ائمہ حمید- احمد راہی- عبدالستین عارف
راچینی پنچ ہوم کے باہر

نیاں کرنا

مذاکرہ

امریکی کونسل

مشرقی : محمد علی انیس
مشرقی : احمد شکر و شریف
مشرقی : حاکم و شریف

قیمت

۲۰۰

کے دستخط

آخری ایک

مجموعہ

حقائق اسلام - مختصر

۸۶۱

۲۵۵

۳۵۱

۴۲۶

۵۰۶

۵۸۶

فہرست

- ۱۔ چند یادیں - چند باتیں
- ۲۔ امرتسر میں فساد کا پہلا شعلہ
- ۳۔ آگ اور خون کے گلاب
- ۴۔ امرتسر میں ۱۴ اگست
- ۵۔ امرتسر کا جیاناوالہ باغ
- ۶۔ امرتسر کا کمپنی باغ
- ۷۔ امرتسر کی ایک گلی
- ۸۔ امرتسر کی مسجدیں
- ۹۔ امرتسر کا رمضان المبارک
- ۱۰۔ امرتسر کی عید
- ۱۱۔ امرتسر کی ایک درگاہ
- ۱۲۔ امرتسر اور سیب کا درخت
- ۱۳۔ امرتسر کی ایک ہولناک رات
- ۱۴۔ امرتسر کے دانشور
- ۱۵۔ امرتسر کا ماسٹر نثار

۱۳

۲۷

۴۷

۵۶

۶۷

۸۸

۱۰۸

۱۱۶

۱۲۹

۱۴۱

۱۵۵

۱۶۹

۱۸۶

۲۰۲

۲۱۰

بند مت شریعت جاب

نور: ۱۶۸۸۱

انجمن ترقی اردو • لامور • حمید شاہد

۱۰۰ اردو لکڑی، مٹاں روڈ
لاہور

لازم آمد:
لاکڑی سید مہک

تاریخ: ۱۶/۵/۷۹ حوالہ نمبر: _____

پیارے منصف عزیز دوست! حمید!

امرتسر کی مسجدوں پر پارا مضمون لکھنے والے

حمید کو میرا سلام پہنچے۔

کتنے پیاری تصویر کھینچی ہے آپ نے امرتسر
کی (قبل از پاکستان کی) معاشرت کا۔ یہ سکھوں

کا اور انگریزوں کا دور تھا کس قدر آباد

تھیں قریبہ کی بیٹیاں، کتنے اچھے اہل صاحب

اور ان کے بیٹے جو آپ کے دوست تھے۔ قریبہ

کے حوالے نے تاریخ کے درتے کھول دیے جن سے

اس ملک کے مستقبل پر دھندلی دھندلی روشنی

— ذرے ذرے کچھ چمکے ہوئے کھڑے تھے ہر

۲۱۹

۲۲۹

۲۳۸

۲۴۹

۲۵۷

۲۶۵

۲۸۰

۲۸۹

۲۹۳

۲۹۷

۱۶۔ امرتسر کی میاں پوٹرو

۱۷۔ امرتسر کا ایک درویش

۱۸۔ امرتسر کا اسدجو

۱۹۔ امرتسر کا ایک گیٹ کیپر

۲۰۔ امرتسر کا ایک جواری

۲۱۔ امرتسر کا پروفیسر مندی

۲۲۔ امرتسر کے جن ادر بھوت

۲۳۔ نور کبھی ہاتی جیک نہیں ہوتا

۲۴۔ الوداع مسجد کے مینارو

۲۵۔ امرتسر کی آخری جھلک

اے حمید کے نام۔ ہنگلہ ویش کے ایک پاکستانی کا خط

نظر آئے۔ اشارت نے چہرہ طبعی روشن کر دیے
پیرا حمید پھر جاگ اٹھتے مگر معلوم نہیں ایسا
مکمل بھی جاگتا رہے گا یا نہیں۔ کاشن ایسی
شاکر تحریریں دو تین اور لکھ ڈالے۔
شاید میرا جذبہ دل میرا پتہ آپ
بک پہنچا دے۔
منسلک

میرا جذبہ دل میرا پتہ آپ
بک پہنچا دے۔
منسلک

کھلنا
ہنگلہ ویش
اے حمید
میرا نام
اسلام علیہ السلام

میرا مزاج پتہ ہو گا!
آپ کے لئے کہہ رہی ہوں۔ اور میرا دادا جان بھی اسی لئے تھے۔
شہینہ پورہ میں رہتے تھے۔ بس اتنا جانتا ہوں۔ آپ کے بھائی
اس کے سے متعلق جو آئے ہیں۔ پڑھتا ہوں۔ وہ بھی کبھی کبھار۔
آپ سے گزارش ہے کہ اگر کوئی کتاب ہو تو اس کی قیمت
اور ڈاک خرچہ تحریر کریں۔ میں پاکستان کرشمہ میں مطلوب رقم ارسال
کروں گا۔
حالیہ ہندو پاک ادب نمبر میں آپ کا افسانہ "پرانے باغ کا لکڑہ"۔
نظر آئے ہیں۔ خوبصورت افسانہ ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔

میں آپ کو لکھ رہا ہوں کہ پاکستان کے نام پر قسم دیتا ہوں
کہ آپ میرے خط کا جواب دیجئے گا۔ بے پاکستان اور ہجرت کرنے والوں سے
جو لکھتے ہیں۔ وہ نامعلوم ہیں۔ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نظر بند سے بچائے۔
پاکستان بے (موجودہ پاکستان) بلا دیانہ بھائی۔ مگر وہ آباد رہے۔ فوس رہے
کا پیسے کی راہ پر گامزن رہے۔ سب سے پہلی درجہ پستہ ہر اتنا رہے۔ پاکستان
کی صورت اور سالمیت برقرار رہے۔

جواب سے سدا منتظر ہوں

محمد نور الہودا

MOHAMMED NOORUL HODA
STR NO. 5-59
HOUSING ESTATE
P.O. KHALISH PUR
DIST. KHULNA 9000

چند یادیں - چند باتیں

دروازہ مہان سنگھ سے باہر نکلیں تو سیدھی سرٹ سکول کے پہلو سے گزرتی، دائیں جانب بودی شاہ کے ٹکے کو اور بائیں طرف پاتھی گراؤنڈ کو پیچھے چھوڑتی سامنے تحصیل پورے کی طرف نکل جاتی ہے تحصیل پورے کی آبادی ختم ہوتے ہی دو طرفہ لوکاٹ کے گہرے سبز چھاؤں والے باغوں کے بچوں بیچ ایک تنگ سا کچا راستہ جالندھر بٹالہ ریلوے لائن کی طرف نکل جاتا ہے۔ اس کچے راستے پر کھٹے کے پودوں نے چھت بنا رکھی تھی۔ مارچ، اپریل کے دنوں میں جب کھٹے کے جھاڑوں میں سفید پھول کھلتے تو سارا راستہ مہک جاتا۔ میں باغ کی سیر کو جلتے یہاں سے لمبے لمبے سانس لیتا، آہستہ آہستہ گزرا کرتا تھا اور سفید پھولوں کو — لیکن یہ میں کہاں نکل آیا؟ کھٹے کے سفید پھولوں کی خوشبو مجھے ایک ہی میں کہاں سے کہاں لے کر نکل گئی۔ میں واپس دروازہ مہان سنگھ میں آتا ہوں۔

دروازہ مہان سنگھ ہمارے محلے کا دروازہ تھا۔ اُن دنوں مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا تھا کہ یہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہ بھید ہندو مسلم فسادات کے بعد کھلا۔ اس دروازے سے باہر نکل کر آپ دائیں طرف سرٹ گھوم جاتیے۔ ایک طرف شیشم کے سایہ دار درختوں کی قطار قدر تک چلی گئی ہے اور دوسری طرف گلاب، ڈیلیا اور چیلی کے پھولوں سے مہکتا باغ سرٹ کے ساتھ ساتھ دروازہ گھی منڈی تک چلا گیا ہے۔ اس باغ میں یو کلیٹس کے نو عمر چہرے درخت ہوا کرتے تھے جن کی لمبوتری پتوں والی ٹہنیاں گرمیوں کی صبح کی ٹھنڈی ہوا میں جھٹکرتی تھیں۔

۱۴ اگست کی خون آلود۔ دھواں دھواں، دہشت زدہ دوپہر کو جب ہم افراتفری کے عالم میں دروازہ مہان سنگھ سے نکل کر شریف پورہ کیمپ کی طرف بھاگے تو گورڈا سپور ریلوے لائن کے پار مقبول پورے کی مسلم بستی سے ٹھٹھے دھوئیں کے بادلوں میں آگ کی سرخ زبانیں لپک رہی

سنگھ

یادیں

۱۴

تھیں اور اس باغ کے نو عمر پوکپٹس کے درختوں کی لمبی نازک ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ساکت و جامہ نشیں جیسے وہ پتھر ہو گئی ہوں۔

قیام پاکستان کے پانچ سال بعد جب میں امرتسر گیا تو ان درختوں نے مجھے دُور سے آتا دیکھ کر اپنی شاخیں ہلا ہلا کر مجھ اپنی طرف بلایا۔ مجھے اپنی بے زبانی میں خاموش آوازیں۔ اپنی سونفنی خوشبو کی آواز میں میرا نام لے لے کر پکھا۔ اور جب میں اُن کے پاس گیا تو وہ چپ ہو گئے۔ میں نے ایک درخت کے تنے پر ہاتھ رکھا۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ درخت کی ایک ٹہنی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا۔ میرا بھی دل دھڑک رہا تھا۔ ہم دونوں کے دل ایک ہی تال پر دھڑک رہے تھے یہ محبت کی تال تھی۔ ہمہ گیر، ہمہ ازا دوست، ہمہ تن گوش، کبھی نہ بھلائی جانیوالی، کبھی نہ چڑھنے والی کبھی نہ یاد آنے والی محبت کی تال۔ کبھی نہ چڑھنے والی، کبھی نہ اترتے والی شراب کا نشہ کبھی نہ طلوع ہونے والے، کبھی نہ غروب ہونے والے سورج کی روشنی! میں اور درخت کتنی ہی دیر باتیں کرتے رہے۔ اُس نے کہا۔

”تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے؟“

میں نے کہا۔

”سبھی چلے گئے تھے۔ تم نے دیکھا نہیں؟ امرتسر تو مسلمانوں کے لیے جہنم بنا دیا گیا تھا اور مسلمان جہنم میں نہیں رہا کرتا۔ لاہور کے چیرنگ کراس اور سمن آباد میں کچھ پوکپٹس کے درخت ہیں۔ میں اُن سے تمہارا حال پوچھ لیا کرتا ہوں۔ ویسے بھی صبح دم جب سمن آباد کی مسجدیں اذان کی صداؤں سے گونجتی ہیں اور نیم روشن صحن میں ٹمٹماتے تاروں بھرے آسمان سے اگر گہرے سانس لیتا ہوں تو مجھے تمہاری خوشبو آتا کرتی ہے۔ تمہارے پتوں کی سرگوشیاں سنائی دیا کرتی ہیں۔“

پوکپٹس کی ٹہنیاں خوشی سے لہرانے لگیں اور۔۔۔۔۔

معاف کیجئے گا میں پھر اپنے موضوع سے بہٹ گیا۔ میری اور درخت کی باتیں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ یہ سلسلہ تو موت کے بعد بھی جاری رہے گا۔ ہاں۔۔۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ جہاں یہ باغ ختم ہوتا ہے وہاں اگالی سکھوں یعنی نہنگوں کا ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جسے

بُرج ٹھولا سنگھ کہتے ہیں۔ سکندر حیات کی وزارت میں سکھوں نے اپنے گردوارے کے پاس اس کی تعمیر شروع کی تو امرتسر کے مسلمانوں نے حکومت پنجاب سے شدید احتجاج کیا۔ جلسے ہوئے مرسکندر کے پاس مسلمانوں کے وفد گئے لیکن کچھ نہ بنا اور قلعے کی تعمیر شروع رہی۔ قلعہ بن گیا۔ اس قلعے کے سوراخوں سے گھی منڈی اور مہاں سنگھ دروازے کے مسلمانوں پر اندھا دھند فائرنگ کی۔ ہمارے محلے کا جوان جیر اٹال والا انہی سکھوں کی گولی لگنے سے شہید ہوا۔

اس قلعے کے سامنے ایک چھوٹی سی پختہ سرنگ نیچے کو اترتی ہے۔ کوٹنے پر ایک مسجد ہے کنواں اور اکھاڑہ ہے۔ ذرا اگے جا کر ہسلی آجاتی ہے اور پھر قبرستان شروع ہو جاتا ہے۔ جس درگاہ کے بارے میں میں کہنے والا ہوں وہ اسی قبرستان میں واقع تھی۔ ہم سب نے ایسی بہت سی درگاہیں دیکھی ہوں گی جو صدیوں سے آباد ہیں اور جن کی رونقوں اور گنگا ہٹوں میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے لیکن امرتسر کے قبرستان والی یہ پہلی درگاہ تھی جو میری آنکھوں کے سامنے عالم وجود میں آئی۔ برقی قمقموں سے بقیعہ نور بنی، اس کی نقائیں بیدم وارثی کے عارفانہ کلام سے گونجیں، وہاں دودھ کی نہریں بہیں اور میری آنکھوں کے سامنے وہ اُجڑ گئی۔ لوگ اُس کے برقی قمقموں اور ٹونٹیاں اُتار کر لے گئے اور دودھ کی نہروں میں مکڑیوں نے جا لے تن لیے۔ یہ درگاہ امرتسر کی بھاری کشمیری برادری کے ایک قریبی عزیز خواجہ صاحب نے اپنے نانا کی قبر پر بنائی تھی۔ میں اُن دنوں ایم اے او ہائی سکول میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ خواجہ صاحب کے پاس اچانک کہیں سے دولت آگئی انہوں نے فوراً قبرستان میں اپنے نانا کی قبر پر (جیسا کہ والدہ مرحومہ اور خالہ جان بھی بتایا کرتی تھیں) ایک عظیم الشان درگاہ کی بنیاد رکھ دی۔ درگاہ کی تعمیر شروع ہو گئی۔ دُور دراز سے کارگر مزدوروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ میرے خالہ زاد بھائی رشید لال نے وہاں بجلی کی ساری فیکٹ فوکی۔ میں آج بھی چشم تصور میں اُسے تیرج کس دانٹوں میں دبائے سیر می پر جھک کر تاروں کو ایک دوسرے سے جوڑتا دیکھ رہا ہوں۔ درگاہ کے گنبد کے اندر جو روشنیاں لگیں وہ سبز انگوروں کے گچھوں کی شکل میں لٹک رہی تھیں۔ اگر وہ دلی اور کھنٹھ سے نہایت قیمتی اور حسین جھاڑ خانوس منگوا کر اندر لٹکائے گئے گنبد کے اندر تین قبروں کے تعویذ تھے۔ ایک خواجہ صاحب کے نانا کی قبر کا تعویذ تھا۔ دوسرا غالباً اُن کی تانی صاحبہ کی قبر کا تعویذ تھا اور تیسرا تعویذ اُن کی اپنی قبر کا تھا جو تعویذ کے نیچے تھپتھپتے

میں کھلی پڑی تھی۔ انہوں نے وصیت کر رکھی تھی کہ مرنے کے بعد انہیں وہیں تہہ خانے میں دفن کیا جائے۔ ایک دفعہ میں تہہ خانے میں اتر گیا۔ چھوٹا سا لحد نما تہہ خانہ تھا۔ چھت اور دیواروں پر سینٹ کیا ہوا تھا۔ جگہ جگہ چمکتی برکیٹوں والے دو دھیا غبارہ منالبل لگے تھے۔ وہاں مرنے کے بعد خواجہ صاحب کی قبر تعمیر ہونی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں امرتسر کا یہ قبرستان بڑا خوبصورت تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ لاہور میں مسلمانوں کے ننگے قبرستانوں پر گرہوں میں پھلتی دھوپ پڑتی ہے اور سردیوں میں کہہ اگر تباہ ہے جب کہ لاہور میں عیسائیوں کے قبرستانوں میں سایہ دار درختوں کے جھنڈ ہیں اور قبروں کے کتبے پھولوں سے ڈھکے رہتے ہیں۔ امرتسر کا ہمارے محلے کے باہر والا قبرستان لاہور کے گورا قبرستان سے بھی زیادہ شاداب اور پرسکون تھا۔ دراصل یہ قبرستان آم، لوکاٹ اور امروہ کے باغوں کے بیچ میں اگر بن گیا تھا۔ یہاں کوئی قبر ایسی نہ تھی جس پر کسی نہ کسی درخت کا سایہ نہ ہو اور پھولوں کی گلاب یا گیندے کے پھول نہ کھلے ہوں۔ ہم رات کو بھی قبرستان میں بے دھڑک چلے جاتے۔ ہمیں کبھی کسی قسم کا خوف یا دہشت محسوس نہ ہوتی، بلکہ یوں لگتا کہ واقعی ان قبروں کے اندر بڑے ہی نیک لوگ سو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے بچے ہوتے ہوئے بھی کبھی کسی چھوٹی سے چھوٹی قبر پر بھی پاؤں نہ رکھا تھا۔ یہاں پھلدار باغوں میں ندی کے ٹپا لے ٹھنڈے پانی کے چھوٹے چھوٹے ٹالے بہتے تھے برسات میں ان ٹالوں میں درختوں سے ٹپکے ہوئے آم اور امروہا کرتے جنہیں ہم وہیں کسی پتیا پر بیٹھ کر مزے لے لے کر کھاتے۔ برسات میں گنگھور گھٹائیں برتیں اور ہم یہاں امروہ کے درختوں پر چڑھے اور امروہ پاؤں پھسائے امروہ توڑ توڑ کر نیک کی جیبیں بھر کرتے۔

عید کی صبح کو منہ اندھیرے لوگ قبرستان جا کر فاتحہ اور قرآن خوانی کرتے۔ میں بھی اپنے چھوٹے کرٹس بجائی کے ساتھ ضرور جاتا۔ ہم لوگ گمی منڈی والے دروازے سے نکل کر کونے والی مسجد کے پاس آتے تو ہمیں سٹے گلاب کے پھولوں کی خوشبو محسوس ہوتی۔ سڑک کنارے گلاب کے پھول بیچنے والے بیٹھے ہوتے۔ بڑی بڑی چنگیری سڑخ گلابوں اور ان کی تپیوں سے بھری ہوتیں۔ دوپہے کے پھول لے کر وہاں میں باندھ لیتے اور گرم کشمیری شالوں میں دیکے ٹھنڈی سردی میں قبرستان میں داخل ہو جاتے ان دنوں بڑی سخت سردی پڑا کرتی تھی۔ ہمارے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے اور بات کرتے وقت منہ سے بھاپ نکلا کرتی۔ اوپر نیلے آسمان پر طلوع آفتاب سے پہلے کی روشنی میں ٹٹھکتے تارے نردھورہ

ہرتے تھے۔ چھوٹی سی سڑک کے دونوں جانب خانہ بدوش قسم کے فقیر جھولیاں پھیلائے بیٹھے، اپنی اپنی بولیوں میں خیرات مانگ رہے ہوتے۔ ان کے پیچھے امروہوں اور اناروں کے باغوں میں گھنٹ اندھیرا چھایا ہوتا۔ اب امروہ سے دھیمی اثر انگیز آوازیں قرآن شریف کی تلاوت کی آوازیں سنائی دینے لگتی۔ لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی قبروں پر مٹی کے دیے اور موم بتیاں جلا رہے ہوتے۔ پھول اور چاول بکھیر رہے ہوتے۔ کہیں کہیں ان کے آداس چہرے چرخوں کی پھڑپھڑاتی روشنی میں ابھرتے اور پھر غائب ہو جاتے۔ مٹی جون کی تپتی سنسان دوپہروں میں یہاں سے گزرتے ہوئے گلاب کے پھولوں اور لکیر کے پیسے پھولوں کی گرم خوشبو آیا کرتی۔ ذرا پر سے ایک نہر بہتی تھی۔ امروہ سے جو ہوا آتی اُس میں بھنگ کی جھاڑیوں کی مرطوب بو ہوتی۔

اس قبرستان کا جو حصہ حالندھ کی طرف جاتی جی ٹی روڈ کو لگتا تھا امروہ یہ درگاہ تھی۔ اس درگاہ تھی۔ اس درگاہ پر پہلا عرس ہوا تو امرتسر کے گلی کوچوں کی دیواروں پر قد آدم اشتہار چسپاں ہو گئے۔ ان اشتہاروں پر بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا تھا: امرتسر میں دودھ کی نہریں بہنے لگیں۔ اس کے بعد درگاہ کے بارے میں تفصیل درج تھی اور اس بات کا اعلان تھا کہ عرس شریف تین روز تک جاری رہے گا۔ پہلے روز کی محفل سماع کی صدارت حضرت بیہم وارثی فرمائیں گے۔ دکانداروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ میلہ شروع ہونے سے پہلے وہاں آکر اپنی اپنی دکانیں سجالیں۔ ایسا نہ ہو بعد میں بچھٹانا پڑے۔ قوالوں کا باقوال اینڈ پارٹی کے علاوہ محمد علی فریدی قوال کا نام بھی درج تھا۔ میرے خالو جان مرحوم یہ اشتہار چھوٹے میں ڈال کر ہمارے گھر لائے اور سب کو پورے کا پورا پڑھ کر سنایا۔ پھر بولے۔

”میں اس درگاہ کے عرس کے خلاف ہوں یہ سب جھوٹ کا کھیل ہے۔“

خالو جان ساٹھ سینٹھ برس کے دیو قامت، بھاری بھر کم اونچے لمبے بزرگ تھے۔ لمبی ڈاڑھی کھٹا گنڈی رنگ، لمبا کھدر کا کرتہ۔ کھدر کی دھوٹی، لال چمڑے کی جوتی، ہاتھ میں موٹا عصا۔ بازار بکرواناں کی روڑاں والی مسجد کے پیش امام تھے۔ تحریک خلافت میں میری والدہ سمیت اپنے سب گھر بار والوں کو لے کر کابل چلے گئے جہاں سے انتہائی کس مہر سی کے عالم میں واپس امرتسر آئے۔ کابل میں خواجہ مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ بڑے موثر انداز میں کھینچا کرتے۔ انہیں ایک بات کی بڑی خوشی تھی کہ انہیں کابل میں شہنشاہ بابر کے مزار کی زیارت نصیب ہوئی۔ بابر کے سنگ مزار پر لکھی ہوئی فارسی لکائی

بڑے جوش و فوش سے پڑھ کر سنایا کرتے۔ کشمیری بزرگوں کی طرح ڈٹ کر کھاتے۔ میلوں پیدل چلتے۔ جمعے کے جمعے ہر عزیز اور رشتے دار کے گھر خیریت معلوم کرنے جاتے۔ ڈیوڑھی میں ذرا کھنکار کر گھر کے کسی فرد کا نام لے کر پکارتے۔ جن دنوں میں فلمینگ روڈ پر راکر تاتھا خالو جان کی پاٹ دار آواز ہر جمعے کی صبح کو مکان کی ڈیوڑھی میں گونجتی۔

”بابو عبدالحمید۔“

خالو جان کی سب سے بڑی خصوصیت میرے نزدیک یہ تھی کہ اُن میں ظرافت کی جس بڑی تیز تھی۔ بڑے لطیفے سناتے۔ بات کو خوب مزہ مسالہ لگا کر پیش کرتے۔ ذرا سی بات پر خوب کھل کھلا کر بچوں کی طرح ہنستے۔ ایک روز میں خالو کے ہاں گیا ہوا تھا۔ ہم نو عمر لڑکوں کو ایک جگہ اکٹھے دیکھ کر ہمارے پاس آئے اور عھا دیوار سے لگا کر تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”لو بھی آج تمہیں عبدالرحمان جن کا قفقہ سناتا ہوں۔ وہ مجھے خود بھی کبھی کبھی سن لگتے تھے۔ چھ فٹ سے نکلتا قد، بھاری جسم، رعب دار آواز اور قدیم یونانی فلاسفوں ایسا بھر پور چہرہ۔ لیکن اُس روز انہوں نے ہمیں جس جن کے بارے میں سنایا وہ اُن کی مسجد کے حجرے میں رہتا تھا۔ کہنے لگے

”لو بھی دوستو! کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک روز میں نے اُن بچوں کو جو میرے پاس

قرآن شریف پڑھنے آتے ہیں کہا کہ میرا بدن دالو۔ میں پہلو بدل کر لیٹ گیا اور سارے بچے

میرے بدن پر ہلکی ہلکی ٹکیاں مارنے لگے۔ مجھے کچھ ایسا مزہ آیا کہ سو گیا۔ آنکھ کھلی تو سارے

بچے جاچکے تھے صرف عبدالرحمان نامی لڑکا میری پنڈلیوں پر ٹکیاں مار رہا تھا۔ حجرے

میں کافی پرے طاق میں دیا جل رہا تھا۔ میں نے عبدالرحمان سے کہا کہ بیٹا دیا گل کر دو۔

اور تم بھی جا کر آرام کرو۔ عبدالرحمان نے وہیں بیٹھے بیٹھے پھونک مار کر دیا بھجوا دیا۔ پس پھر

کیا تھا۔ میں وہیں اٹھ کر فوراً عبدالرحمان کی کلائی پکڑ لی اور کہا۔ سچ بتا تو کون ہے؟ عبدالرحمان

گھبرا گیا۔ جب میں نے کلائی نہ چھوڑی تو بولا۔ میں عبدالرحمان جن ہوں۔ لو بھی دوستو!

اب وہ جن میرا بار ہے اور مجھے کبھی کبھی کابل کے قندھاری انار لاکھلا تا ہے۔ پس

چنگی بجا ہے اور سرنج قندھاری اندر اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔“

وہ کہے ہمارے میں بھی خالو جان نے میرے والد صاحب کو کھٹے لفظوں میں کہہ دیا۔

مجھے عبدالرحمان جن نے سب کچھ بتا دیا ہے عبدالعزیز! خواجہ نے وہاں درگاہ کی عمارت تعمیر کر کے اچھا کام نہیں کیا۔ عمارت کے نیچے کئی نیک آدمیوں کی قبریں آگئی ہیں۔ ہمیں شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

لیکن درگاہ کے پہلے عرس میں خالو جان پیش پیش تھے۔ درگاہ کے پچھاڑے اپنی نگرانی میں زردے بریانی کی دلیکیں دم کروا رہے تھے۔ مہنتی نانی کو کام کرتے ہوئے بار بار ٹوکتے۔

”زردے میں سنگرتے کے ترنج ڈال دیئے؟“

”مہنتی! مجھے کی آگ تیز لگتی ہے مجھے۔۔۔۔۔“

”بریانی تیار ہو گئی ہو تو ایک برکی چکھانا مجھے۔۔۔۔۔“

پہلے عرس پر درگاہ کے اندر باہر بڑی رونق تھی۔ شہر سے زیادہ تر لوگ دودھ کی نہروں کا سن کر آئے تھے۔ دودھ کی نہر درگاہ میں ایسے چلائی گئی تھی کہ سینٹ کے پختہ ایک لمبوترے ٹینک کو کچھ دودھ کی لسی سے بھر دیا گیا۔ تانبے کا ایک پائپ گنبد کے گرد گرد چاروں طرف لگا تھا جس میں ٹوٹیاں تھیں لوگ ٹوٹیاں کھول کر گلاس، پیالے اور ڈول بھر بھر کر دودھ کی لسی پیتے اور حیران ہوتے کہ واقعی خواجہ صاحب نے دودھ کی نہر چلا دی۔ درگاہ کے سامنے سڑک کے کٹے ہوئے کھیتوں میں تہو قناتیں لگا کر لوگوں نے دکانیں کھول رکھی تھیں۔ قتلے تلے جا رہے تھے۔ جھولے لگے تھے۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل گرج رہی تھی۔ درگاہ رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجی تھی۔ شہر کے علاوہ دیہات سے بھی عورتیں بچے بوڑھے اور جوان دعا مانگ رہے تھے۔ فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ جالیوں میں اٹیاں باندھ کر مٹیں مانگ رہے تھے۔ میں نے ایک جالی کی ٹنڈی آنکھ میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ تینوں قبروں پر پھولوں کے ڈھیر لگے تھے۔ اُس قبر پر بھی جس کی لحد میں ابھی خواجہ صاحب دفن نہیں ہوئے تھے۔ لوگ اُن کی جالی قبر پر بھی فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

ہماری امرتسر کی ساری کشمیری برادری سارے رشتے دار عرس پر جمع تھے۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے کسی نے بھی درگاہ کے تقدس کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ مقبرے میں کون دفن ہے۔ چنانچہ اپنے رشتہ دار میں میں نے کسی کو مقبرے کی جالیوں کے پاس کھڑے ہو کر دعا مانگتے نہیں دیکھا۔ ہاں بھنڈارا کھانے میں وہ سب سے آگے تھے۔ پلاؤ سے لبالب بھرے ہوئے

قالبوں پر وہ چُن چُن کر قورنے کی بوٹیاں رکھوا رہے تھے۔ پھولدار قناتوں کے پاس دریوں پر پالتی پالتی مار کر بیٹھے وہ جن بھوتوں کی طرح خود بھی کھا رہے تھے اور اپنے بال بچوں کو بھی مار مار کر کھلا رہے تھے۔ رات کو گیس کے نہڈوں کی تیز روشنی میں قوالی شروع ہوئی تو ہمارے ایک رشتے دار کو حال آگیا۔ وہ لوگوں کو ٹکڑی مارنے لگا۔ کسی کے قابو میں ہی نہ آتا تھا۔ بڑی مشکل سے چہ آدمیوں نے پکڑ کر اُسے رسیوں سے باندھا اور گھر چھوڑ کر آئے۔ اگلی صبح اُس کی رسیاں کھولی گئیں تو وہ پھر حال کھیلنے لگا۔

قوالی کی انہی محفلوں میں، میں نے پہلی بار مشہور شاعر حضرت بیدم وارثی کو دیکھا۔ پُر سکون و بلا چہرہ ملائم چمک والی آنکھیں، زرد رنگ کی چادر اوڑھے اگلی قطار میں خاموش بیٹھے تھے۔ قوال اُن ہی کا عارفانہ کلام گارہے تھے۔ محمد علی فریدی قوال اُن دونوں جو بن پر تھے۔ درگاہ کے کونے کونے میں اُن کی پُرسوز آواز گونج رہی تھی۔ میں اپنے خاندان کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ تمبوؤں کے نیچے اُس حصے میں بیٹھا تھا جو عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ درسی کے نیچے تازہ بنا ہوا اینٹوں کا فرش ٹھنڈا ٹھنڈا تھا۔ قوالی میں میرا بالکل جی نہ لگا۔ میں اپنے پھوپھی زاد بھائی کے ساتھ مقبرے کے گنبد کے پاس آگیا۔ یہاں والان کے کونوں کھدروں میں لوگ کھل اوڑھے سو رہے تھے۔ گنبد کے اندر جھاڑ فالو کس روشن تھے۔ بے شمار گر بیاں سنگ رہی تھیں جن کی بھاری خوشبو سے ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ درگاہ کے اپنے چڑیا گھر سے موروں کے گونگنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت مقبرے کی جالی سے منہ لگائے، آنکھیں بند کیے کچھ بڑبڑا رہی تھی اُس کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ والان کے مغزی حصے میں سجادہ نشین، نائب سجادہ نشین، متولی، خزانچی اور سیکرٹری سجادہ نشین کے کمرے تھے جن کے باہر اردو میں اُن کے ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں گھومتے گھاتے اُدھر کو نکل گئے۔ ہم نے جالیوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ فوجہ صاحب گاؤ تکیے کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ بلب کی روشنی میں بڑی بڑی مونچھوں والا اُن کا سرخ و سپید بارعجب چہرہ چمک رہا تھا۔ کچھ لوگ بڑے ادب سے اُن کے سامنے بیٹھے اُن کی باتیں سن رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے کی جالیوں سے اندر جھانکا تو ایک بھولی ہوئی توند والا موٹا تازہ آدنی گرم کشمیری شال کی ٹیکل مارے قالین پر اکیلا پالتی پالتی مارے بیٹھا زروہ اڑا رہا تھا۔ ہم یہاں سے نکل کر درگاہ کے پچھوڑے چڑیا گھر کی طرف آگئے۔ دس بارہ مرے زمین کے گرد باڑھ لگا کر اندر مختلف خانوں

میں مورو، تیتڑ، طوطے، کبوتر اور تین چار بہن چھوڑ دیئے گئے تھے۔ یہاں بھی اوپر و حط میں ایک بڑا سابلب روشن تھا۔ روشنی میں جانور کچھ بے چین سے دکھائی دے رہے تھے۔ ہمیں جھگکے کے پاس آتا دیکھ کر بہن آہستہ آہستہ چلتے ہمارے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ اُن کی بڑی بڑی ہلکتی آنکھیں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ ہم بڑی دیر تک اُن سے کھیلتے رہے۔ قوالی کی آواز یہاں بھی آرہی تھی۔ اچانک پیچھے آہٹ سی ہوئی۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ ہمارے پیچھے امرود کے جھکے ہوئے درختوں کے گہرے سالیوں میں قبریں ہی قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ڈر گئے اور وہاں سے بھاگ کر دالان کی رونق اور روشنیوں میں آگئے۔

رات، منجے کے بعد محفل سماع ختم ہوئی۔ خالوجان اپنا بھالے کر ہمارے خاندان کی عورتوں اور بچوں کی ٹولی پیچھے لگائے گھر کی طرف چل پڑے۔ سارا راستہ قبرستان میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ مجھے بڑا ڈر رہا تھا۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ لگا چلا رہا تھا اور دل کو اس خیال سے طاقت دے رہا تھا کہ خالوجان ساتھ ہیں اور جن بھوت چڑیلیں اُن کی مطلع ہیں۔ درختوں پر اندھیرا اور سکوت چھایا ہوا تھا کسی وقت کوئی آواز نہ لگتا اور فضا اور زیادہ ڈراؤنی ہو جاتی۔ عورتیں اونچی اونچی آواز میں باتیں کر کے اپنے خوف کو دور کر رہی تھیں۔ لمبے ترنگے خالوجان موٹا معزاز زمین پر بار بار مارتے، بار بار کھنکارتے کوئی بیس قدم آگے آگے چل رہے تھے۔ کسی وقت بلند آواز سے وہ کلمہ شریف کا ورد کرنا شروع کر دیتے۔ خدا خدا کر کے قبرستان کا رستہ ختم ہوا اور ہم دروازہ گئی منڈی سے نکل کر بازار کبر و اماں میں آگئے لگے روز خالوجان نے ایک من گھڑت کہانی مشہور کر دی۔ کہنے لگے۔

رات اگر میں تم لوگوں کے ساتھ نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔ تم لوگوں کو قبرستان سے لے کر گزر رہا تھا کہ کھائی کے پاس پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چڑیل پل پر بیٹھی ہے۔ اُس کے بال کھلے ہیں۔ ہاتھ پیر اٹھائے ہیں۔ دانست باہر کو نکلتے ہوئے ہیں۔ آنکھیں سرخ از کارہ ہو رہی ہیں۔ مجھے دیکھ کر جھپٹ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا السلام علیکم پیر جی! یہاں پہنچ کر خالوجان باقاعدہ اُٹھ کر چڑیل کی نقل اتارتے۔ ہاتھ اٹھا کر، سر جھکا کر چہرے پر کجا جت بھری مسکراہٹ لا کر چڑیل کے سلام کرنے کا انداز بتاتے۔

”میں نے عصا اٹھا کر چڑیل سے کہا: اونا مراد! تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟
مجھے خبر نہیں کہ پیچھے میرے بچے آرہے ہیں! چل دفع ہو جا میری آنکھوں سے۔ اٹھ
بھاگ! — اور چڑیل ہی ہی ہی ہی سلام پیر جی سلام پیر جی! کہتی اُلٹے
پاؤں بھاگ کر اوروں کے درختوں میں غائب ہو گئی۔“

رشتے دار عورتوں نے سنا تو انہیں قبرستان والی رات یاد کر کے پسینے آ گئے۔ مجھ پر یہ اثر ہوا
کہ اس کے بعد میں دوپہر کے وقت بھی قبرستان جاتے گھبرانے لگا۔
سرس کے علاوہ بھی ہم دن میں اکثر کھینٹے اور پتنگ اڑانے درگاہ پر جایا کرتے تھے۔ باغوں
میں گھس کر کچے کپے اوردوڑتے۔ کھیتوں میں جا کر مولیاں اکھاڑتے اور انہیں درگاہ کے حوض پر لا کر
دھوتے اور نمک مرچ لگا کر کھاتے۔ میرے دادا جان سردیوں کی دوپہر میں عام طور پر درگاہ پر ہی
گزارتے۔ وہ مقبرے کے پاس فرش پر درسی بچا کر بیٹھ جاتے۔ روٹی کے بھورے کر کے چڑیوں
کو ڈالتے۔ پانی سے لبالب بھرا ہوا کٹورہ پاس رکھ لیتے۔ چڑیاں وہاں آکر بڑی آزادی سے دانہ دُلکا
چیتیں اور کٹورے پر بیٹھ کر چرنچ ڈباڈبا کر مزے سے پانی پیتیں۔ وہ دادا جان سے ذرا بھی نہ گھبراتے
دادا جان بھی اُن سے بڑا پیار کرتے تھے۔ انہیں پانی پیتا دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہوتے۔ کسی وقت
اُن سے باتیں کرنے لگتے۔ ہم دونوں بھائی گڈی میں ڈور ڈالتے۔ جب ہماری گڈی یا پتنگ سرسوں
کے کھیتوں کے اوپر نیلے آسمان کی ٹھنڈی ہواؤں میں لہرانے لگتی تو دادا جان ماتھے پر ہاتھ کا چھپا
بنا کر اُسے دیکھتے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے۔

شباباش! ڈھیل مت دینا۔ ہوا تیز ہے ڈور کس کر رکھنا۔ میرا خیال ہے بائیں طرف کئی کھاتی ہے۔
درگاہ پر دو باتیں سرس ہی ہوئے تھے کہ اُس کا زوال شروع ہو گیا۔ ایک روز میں سکول سے بستر
لے کر گھر میں داخل ہوا تو قالہ میری والدہ کے ساتھ رازداری میں باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے بستر ایک
طرف پھینکا۔ چنگیر میں سے روٹی نکالی۔ ہانڈی میں سے ایک آلو، ایک بوٹی نکال کر اُس پر رکھی اور
وہیں کھڑے کھڑے کھانے لگا۔ قالہ جان اور والدہ محترمہ کی باتوں سے معلوم ہوا کہ درگاہ شریف والے
خواجہ صاحب اپنے ایک ساتھی کے ساتھ امرتسر سے اچانک غائب ہو گئے ہیں۔ میں نے اس
بات کو زیادہ اہمیت نہ دی، مگر چونکہ والدہ مکر مند تھیں، اس لیے میں بھی فکر مند ہو گیا اور مجھے محسوس

ہوا کہ خواجہ صاحب کے ساتھ ضرور کوئی افسوس ناک حادثہ ہوا ہے۔ اس کا ثبوت مجھے بہت جلد مل گیا، کیونکہ
درگاہ اُجڑنا شروع ہو گئی۔ چوکیداروں کو تنخواہ نہ ملی تو وہ درگاہ چھوڑ کر چلے گئے۔ خواجہ صاحب کے بڑے لڑکے
خود پریشان تھے وہ درگاہ کی حفاظت پوری توہرے سے نہ کر سکتے تھے۔ تیجہ یہ تبلا کہ لوگ حوض کی ٹونیاں اور دودھ
کی نہروں والے تانبے کے پائپ اکھاڑ کر لے گئے۔ رشید لالہ اگر مقبرے میں سے جھاڑ خاتوس اتار کر
خواجہ صاحب کے گھر نہ پہنچاتے تو لوگ وہ بھی اتار کر لے جاتے۔ سجادہ نشین، نائب سجادہ نشین، فرائضی
اور متولی کے جانی دار دروازے بھی راتوں رات چوری ہو گئے۔ چڑیا گھر کے کبوتر، طوطے اُلٹ گئے۔ عورتوں
کو قبرستان کے جنگلی بٹے کھا گئے، کیونکہ اب رات کو اُن کی چوکیداری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ خواجہ صاحب
کا بڑا لڑکا ایک روز دونوں ہرن کھول کر گھر لے گیا، ورنہ اُن کا بچنا بھی محال تھا۔ میں کبھی اُن کے گھر
جاتا تو وہاں دالان میں سناٹا چھایا ہوتا۔ دو منزلہ بڑا اونچا لمبا جالیدار دروازوں اور نیم روشن ٹھنڈے کمروں
پرانے وکٹورین صوفوں اور مسہریوں، قدیم آئینوں اور پرانی طرز کی روغنی تصویروں والا گھر تھا۔ کبھی وہاں
کشمیری عورتوں اور لڑکیوں کی مسرور آوازیں گونجا کرتی تھیں ادب و ہاں خاموشی طاری تھی۔

ایک روز دوپہر کو میں ڈور پتنگ لے کر درگاہ پر گیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ سامنے کھیتوں میں
پیلی پیلی سرسوں بھولی ہوئی تھی۔ درگاہ کے صحن میں ویران مقبرے کے پاس درسی کا ٹکڑا بچھائے دادا
جان اُسی طرح بیٹھے چڑیوں کو روٹی کے بھورے ڈال رہے تھے۔ چڑیاں شور مچاتی اُن کے کندھوں
سراور زانوں پر آکر بیٹھ رہی تھیں۔ اُن کے ہاتھ سے بھورے چھین کر لے جا رہی تھیں اور دادا جان
ہنس ہنس کر اُن سے توگلی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ سامنے کی طرف سجادہ نشین اور نائب سجادہ
نشین کے اُجڑے ہوئے ٹھنڈے سج کمروں کے باہر دھوپ میں خواجہ صاحب کا بڑا لڑکا چنگیر میں تنور
کی روٹی رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں موٹی تھی۔ وہ خشک موٹی سے تنور کی روٹی کے ٹکڑے توڑ توڑ کر
کھا رہا تھا۔ اس بات کو جانے کتنے برس بیت گئے ہیں لیکن یہ عبرت انگیز منظر آج بھی میری آنکھوں
کے سامنے ہے۔ یہ وہ سجادہ نشین تھا جو سرس کے موقعوں پر اپنے ہاتھ سے پلاؤ اور بریانی کے طشت
بھر بھر کر رشتے داروں کے گھر پہنچایا کرتا تھا۔ اُس کا چہرہ بھرا بھرا گول مٹول ہوتا تھا۔ اب وہ چہرہ
اُتر گیا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ وہ عمر میں مجھ سے خاصا بڑا تھا۔ میں ڈور اور
پتنگ ہاتھ میں لیے ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ میری موجودگی سے بے نیاز بڑی مشکل سے روٹی

کے خشک نوالے نگل رہا تھا۔ ایک چڑیا چوں چوں کرتی میرے سر پر سے اڑتی ہوئی دادا جان کے کندھے پر جا کر بیٹھ گئی۔ دادا جان کی یہ عادت تھی کہ جب چڑیا اُن کے کندھے یا سر پر آگے بیٹھتی تو وہ ساکت ہو جاتے اور زیادہ ہلکا جھلا نہیں کرتے تھے۔ میں نے دادا جان کو دیکھا تو وہ بُت بنے بیٹھے تھے اور بوڑھی لکڑیوں سے چڑیا کو دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہے ہیں۔

آج پچیس برس بعد مجھے اُس چڑیا کی یاد آئی ہے۔ کیا وہ گندنی چونچ اور بھولے بھالے چہرے والی معصوم چڑیا زندہ ہوگی؟ وہ تو مجھے نہیں بھولی ہوگی۔ پرندے کبھی محبت کرنے والوں کو نہیں بھولتے وہ انہیں زندگی میں بھی یاد رکھتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی اُن کا انتظار کرتے ہیں۔ کسی حیرت انگیز باغ میں۔ اُس باغ کے حسین ترین درختوں میں۔ شگاف پانیوں والی نہروں کے کنارے اُن دیکھے پھولوں کی وادیوں میں اور۔

”تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“

درگاہ کے عرس، اُس کی رونقیں، اُس کی روشنیاں بجھ گئیں۔ گرمیوں کی تپتی دوپہروں کو اُس کے صحن میں گہریاں دوڑتی پھرتی اور اُس کے سجادہ نشینوں کے تاریک دیوان خانوں میں ٹلکتے جالوں والی چیتوں کے نیچے ٹنگ چرس، بھنگ پی کر سوئے رہتے۔ وقت اس درگاہ کے ایوانوں میں زوال کے جالے بٹنا گزرتا چلا گیا۔

پاکستان بن گیا۔ ہم لوگ امرتسر کو بھڑکتے شعلوں کے سپرد کر کے اپنے نئے شہر نئے وطن میں آ گئے۔ چھ یا شاید پانچ برس بعد یوم اقبال کے موقع پر جالندھر میں پاکستانی ہائی کشن کی جانب سے ایک زبردست مشاعرہ ہوا جس میں لاہور کے معروف شعرا کو شرکت دعوت دی گئی۔ یہ لوگ میرے دوست تھے۔ پاسپورٹ میرے پاس موجود تھا۔ میں بھی اُن کے ساتھ جالندھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ دل میں یہ خیال تھا کہ چلو اسی بہانے امرتسر کے کپہنی باغ، ریالٹو سینما، ٹینگو پارک اور دروازہ وہاں سنگھ کے باہر والے باغ کے یو کلیٹس کے درخت سے ملاقات ہو جائے گی۔ حاتی دفعہ ہم لاہور سے سیدھا جالندھر چلے گئے۔ واپسی پر جالندھر سے امرتسر آتے ہوئے بس تحصیل پورے کے پاس پہنچی تو میں وہیں اُتر گیا۔ جانے کس شاعر نے کہا۔

”اے حمید! تمہیں راستہ معلوم ہے ناں؟“

میں سڑک پر کھڑا کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ قیوم نظر کی آواز آئی۔

”یہ اُس کا اپنا شہر ہے۔ وہ راستہ کیسے بھول سکتا ہے؟“ میں جانے کتنی دیر سگریٹ پیتا، ویران اور اجنبی امرتسر کے بازاروں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ یہاں سنگھ دروازے والے یو کلیٹس کے درخت سے ملا۔ اس تاریخی ملاقات کا حال میں اس مضمون کے شروع میں لکھ چکا ہوں تیسرے پہر میں بڑج پھولا سنگھ کے قریب سے ہو کر قبرستان کی سڑک پر اُتر گیا۔ قبروں پر بل پھیر دیا گیا تھا۔ جہاں کل قبروں پر اگر تیاں سلگتی تھیں۔ چراغ جلتے تھے، آج وہاں مکئی کے کھیت تھے اور بعض جگہوں پر نئے مکانوں کی بنیادیں کھڑی تھیں۔ لوکاٹ اور امرود کے باغ اُڑ گئے تھے، کیونکہ امرتسر میں باغبانی مسلمانوں کے پاس تھی۔ میں نے کسی ہندو اور کسی سکھ کو باغبانی کرتے نہ دیکھا تھا۔ اب میں درگاہ کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ میں اُس کھائی کے پاس سے گزرا جہاں خالو جان مرحوم کے بیان کے مطابق انہیں اُلٹے ماتھے پاؤں والی چڑیل ملی تھی۔ اس کھائی کا پل آدھا ڈھے گیا تھا اُن ندی نالوں کا نام نشان تک باقی نہ تھا جو ناشپاتی اور امرود کے باغوں کی آبپاری کیا کرتے تھے۔ اسی قبرستان میں ایک عورت کی قبر تھی جس پر سنگ مرمر بارہ در کی بنی ہوئی تھی۔ بیخود بھرت قبر مرمر کے خاوند نے بڑی محبت سے بنوائی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ محبت کرنے والے خاوند نے سنگ مزار پر اپنی بیوی کی یاد میں بڑے ہی درد انگیز شعر کندہ کرائے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُڑے ہوئے قبرستان میں یہ سنگ مرمر کی بارہ در کی والی قبر چوں کی تول موجود تھی۔ اب میں درگاہ کی طرف چل پڑا۔ اب میں درگاہ کے سامنے تھا۔ لیکن وہاں درگاہ نہیں تھی۔ نہ والان۔ نہ چوڑہ نہ کمرے، نہ سجادہ نشینوں کے دیوان خانے اور نہ مقبرہ۔ میری آنکھوں کے سامنے گنبد کی آدھی دیوار تھی جس پر تھا پیاں نیچے سے اوپر تک لگی ہوئی تھیں۔ جہاں نائب سجادہ نشین کا کمرہ تھا وہاں ایک جٹادھاری سادھو بیٹھا، انگ بھیموت رمائے چرس کے سونے لگا رہا تھا اور جہاں کبھی دودھ کی نہریں بہا کرتی تھیں وہاں آگ اور تھوہر کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اس کے بعد مجھ سے کچھ نہ دیکھا گیا۔

ہاں۔۔۔ پلٹتے ہوئے میں نے ایک نظر اُس طرف دیکھا جہاں دادا جان در کی

پر اٹھتی پالتی مارے بیٹھے چڑیوں کو بھورے ڈالا کرتے تھے۔ چڑیوں کو پانی پلایا کرتے تھے، اور جب کوئی چڑیا ان کے کندھے پر بیٹھ جاتی تو اس سے باتیں کیا کرتے تھے۔ وہاں کوئی چڑیا نہیں تھی۔ کوئی دامچان نہیں تھے، لیکن ایک بڑی ہی پیاری آنکھوں والی گھبری، شیشم کے پتوں پر بیٹھی، سورج کی تابناک روشنی میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

امرتسر میں فساد کا پہلا شعلہ

ابھی امرتسر کو آگ نہیں لگی تھی۔

ابھی امرتسر زندہ تھا۔ اُس کے گلی کو چھ زندگی کی ہنگامہ آرائیوں سے بھر پور تھے۔ اسکی رگوں میں حسن اور زندہ دلی کا خون گردش کر رہا تھا۔ اُس کے باغوں میں کھلے ہوئے گلابوں پر کوئی رات کو شبیہ گر کرتی اور باغوں میں ہو کر گزرنے والی نہروں میں ٹھکی ہوئی ٹہنیوں کے ٹوٹ کر گرے ہوئے امرود ترا کرتے۔ ابھی امرتسر کو آگ نہیں لگی تھی۔ ابھی امرتسر کی مسجدوں کے دو دروازے گنبد سنہری دھوپ میں چمکا کرتے اور کمپنی باغ والی نہر کے کنارے پر وہ مکب کے غوت میں ناشپاتی کے درختوں پر مارچ اپریل میں سفید اور گلابی شگوفوں سے شاخیں جھک اٹھتیں تحصیل پورے والی مانی کی بیری موٹے اور پیٹھے سیو بیروں سے لہ جاتی اور ہم روڑے مار مار کر ہیر گراتے اور جب مانی گالیاں دیتی باہر نکلتی تو بھاگ جاتے۔ ابھی مال بازار والی مسجد خیر الدین میں پانچوں وقت اذان ہوتی اور اُس کے صحن والے تالاب میں نہری اور سُرخی مچھلیاں وضو کرتے نمازیوں سے چھلیں کیا کرتیں اور بوہڑ والی مسجد کے باہر جمعہ کی نماز پر ایک طرف بکلی والے چوک اور دوسری جانب بھاڑیاں والی گلی تک صفیں بچھ جاتیں۔ مسجد جان محمد کے محراب ابھی سلام بابا کے پُر جوش خطبات کے گونج رہے تھے اور سکری باغ کی فضاؤں میں عید میلاد النبی کے پُر شکوہ جلوسوں کے سبز و سرخ ہلالی پرچم لہرا رہے تھے۔ رمضان کے مہینے میں پچھلے پیر امرتسر کے گلی کوچوں میں بگائے والے ڈھول تاشے بجاتے آیا کرتے اور نعت خوانوں کی ٹولیاں گیس اور لائٹیں اٹھائے نعتیں پڑھتی گھوما کرتیں۔ عید کی صبح رنگ برنگ غباروں، بچوں کے معصوم تہقبول اور

گرما گرم سیویوں کی خوشبو اور ننھی ننھی بچیوں کے لال پیلے گورے گے آنچلوں کے ساتھ طلوع ہوتی۔
گلی گلی بچے غبارے اڑاتے، بابے بجاتے نکل آتے اور آلو کچا لوٹگنیاں اور اڑی چورن بیچنے
والوں کی چھابڑیوں کے آگے بیٹھ جاتے۔ چوکوں میں علوانیوں کی دکانوں پر شامیانے
تن جاتے اور قسم قسم کی مٹھائیوں کے بھرے ہوئے محال تحت پوشوں سے لے کر
چھت تک سچ جاتے۔

ابھی امرتسر گواگ نہیں لگی تھی۔ ابھی امرتسر زندہ تھا اور ہر جہزات کو فتح شاہ بخاریؒ
کے مزار پر تہاری کا لنگر بٹتا تھا اور شکر شاہ کا پُر جلال مقبرہ گیندے اور گلاب کے پھولوں
سے جھک رہا تھا۔ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول میں مسلمان لڑکیاں ہندو سکھ لڑکیوں کے
ساتھ بیٹھ کر سبق یاد کر رہی تھیں اور فرنیچر میل کا دیو ہیکل سیاہ انجن دھوئیں کے بادل
چھوڑتا دھک دھک کرتا امرتسر شیش سے لکڑی کر سیرٹھیوں والے ٹی کے نیچے سے
گزر رہا تھا اور بوڑی سائیں کے تکیے میں مجدم زمر کی انگوٹھیوں سیاہ لمبے بالوں اور سرخ
آنکھوں والہ فقیر گھڑے کی تال پر اپنی درو بھری آواز میں گار رہا تھا۔

قیر بدل جو آئے ہیں

دھوئیں میرے دل والے۔ اسماناں تے چھائے ہیں

اور اکھاڑے میں پہوان اور کٹر، میاں سنگھ اور تحصیل پورے کے نوجوان زور کر
رہے تھے اور دروازہ کھی منڈی والے قبرستان میں لوگ قبروں پر پھول ڈال کر فاتحہ
پڑھ رہے تھے اور انجن پارک کے جلے میں کلاہ، اچکن اور سفید براق ڈاڑھی والے
مولوی ہمدانی اپنا نورانی چہرہ لئے، گے میں پھولوں کے ہار ڈالے کرسی صدارت پر
بیٹھے تھے اور الیگزینڈرا پارک اور میٹنگ پارک میں ڈی اے وی کالج اور ایم او کالج
کی ٹیموں کے درمیان کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ مروت شاہ باولنگ کر رہے تھے اور
ہمارے دینیات کے مولوی صاحب دم پڑھ پڑھ کر پھونک رہے تھے، ہل بازار
والی میوہ منڈی میں مسلمان آڑھتی خریداروں کے شور میں بھی کھاتے کھولے کاروبار
میں مصروف تھے۔ بازار سان سنگھ میں کالا عمر کی دکان پر اونچا لمبا اسد جو جھوم جھوم

کر قلعے تافانے اور گردے لگا رہا تھا۔ کالا عمر دھوپانی والے ہینڈ پمپ کے پاس کھڑا
اوپر منہ کئے اپنے لڑکے بشیر کو آواز دے رہا تھا کہ اپنی آپوسے کہے کہ سماوار نیچے بھجوا دے۔
ابھی امرتسر میں کشمیریوں کے سماوار نمکین چائے اور گرم تہوے سے نمک رہے
تھے اور قاندر روڈ کی دکانیں، باقر خانیاں، اراروت، شیر مال، کھنہ قلموں، ٹکیوں قلموں
اور ورق لگی روغنی روٹیوں سے جی ہوئی تھیں۔ ابھی اس شہر بے مثال کا دل امرتسر کی کشمیریوں
کے کچر اور تہذیب کی گرمی سے دھڑک رہا تھا۔ ابھی آگ جو گھروں کے چولہوں میں جلتی
تھی اور اس آگ نے گھروں، محلوں، بازاروں، مسجدوں اور پورے شہر کو اپنی لپیٹ
میں نہیں لیا تھا۔ گرمیوں کی شام کو کمپنی باغ والی ٹھنڈی کھولی پر مسلمانوں کا ہجوم ہوتا۔
پردہ بارغ میں مسلمان بچیاں، لڑکیاں اور عورتیں جھولے جھولتیں اور نوجوان بھری ہوئی،
نہروں کے ٹھنڈے پانی میں چھلا لگیں لگاتے۔ جھیل روڈ والے دورویہ گھسنے درخت کالی
کالی میٹھی جامنوں سے لد جاتے اور نہر پار والے باغوں کی دفنائیں آم، ناشپاتی، لکڑ
اور امرود کی دھیمی دھیمی خوشبوؤں سے لبریز ہو جاتیں بازار رام باغ والی مارکیٹ حکم
سنگھ کی تنگ گلی میں، آسنے سامنے کامریڈ ہوٹل اور صوفی ترک ہوٹل میں امرتسر
ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور دانشوروں کی محفلیں بھی اپنے عروج پر تھیں۔ تمام چینی
کی پرائی زرو چکیوں میں پکی ہوئی چائے کے دور چل رہے تھے۔ کامریڈ ہوٹل کے
انگلیٹھیوں کے پاس بوریے کی گدی پر بیٹھا سرخ و سپید خلیفہ بڑی چٹک میں چائے
کو بار بار جوش دے رہا ہے سامنے ترک ہوٹل کی گدی پر امرتسر کی سیاسی تاریخ کی نامور
شخصیت صوفی غلام محمد ترک براہاں ہے۔ صوفی صاحب گردن گھما کر غازی عبدالرحمان سے
کسی سیاسی مسئلے پر بحث بھی کر رہے ہیں اور چٹک کے کھولتے پانی میں چائے
کی پتی بھی ڈال رہے ہیں۔ ساتھ والے ہوٹل میں الہ دیا تھاں میں چٹک اور پیالیاں
رکھ کر لوگر کو آواز دے رہا ہے۔

”پل بے پخیر ہے۔“

یرتینوں چائے غاتے چوک گول ہٹی سے دروازہ رام باغ کو جاتے بازار کی

بغلی لگی میں تھے۔ چھتیں دھوئیں سے کالی ہو رہی تھیں۔ بوسیدہ پنچوں کے درمیان میں دو تین لمبی میزیں رکھی تھیں جن پر چائے، پان اور سگریٹوں کے جلے ہوئے نشان تھے۔ یہاں صبح سے رات کے دو دو بچے تک چائے کے دور چلتے اور افلاطون سے لے کر برٹینڈرل اور ولی دکنی سے لے کر اقبال تک گرم گرم بحثیں ہوتیں۔ آئیے آپ کو صوفی ترک ہوٹل کی ایک محفل کی جھلک دکھائیں۔ یہاں سیف الدین سیف نے اپنی محفل سجا رکھی ہے۔ ایک طرف موٹی موٹی نشیلی آنکھوں والا دُبلّا پتلا نازک احساس شاعر۔ علا الدین کلیم گرم کشمیری مثال اوڑھے سگریٹ سگارا رہا ہے۔ دوسری جانب فلک شگاف قہقہے لگانے والا اور ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ پوٹ ہو جانے والا خوش گوش شاعر اقبال کوثر بیٹھا سیف کے کسی شعر پر سروصن رہا ہے۔ سامنے احمد راہی اور اسے حمید بیٹھے کسی بات پر ہنس رہے ہیں۔ سنہری وارھی اور لمبے لمبے سنہری بالوں والا ظہیر کشمیری بھی یہیں بیٹھا تھانیر لب مسکراتے ہوئے چائے کی چسکیاں لے رہا ہے اس کے سامنے ممتاز لغت گو شاعر چاچا عیسیٰ بھی طرہ نکالے کرسی پر اکڑوں بیٹھا پان چہا رہا ہے۔ لیجئے خوش وضع اور خوش گفتار شاعر شہزاد احمد شہزاد اور صلاح الدین ندیم بھی آگئے۔ آتے ہی دوستوں سے دوچار چلیں ہوئیں۔ اور ہنستے مسکراتے بیٹھ گئے۔ اب عارف عبدالمیتین بھی صوفی کریم کے ساتھ نیلی شال اوڑھے پہنچ گئے ہیں۔ کونے میں پنجابی شاعر معراج دین اختر، استاد محبت اور ناظر وغیرہ بیٹھے ہیں۔ بھاری بھر کم سیاسی لیڈر گلشن بیٹھا کسی بات پر ہنس ہنس کر رشید عینکوں والے سے ہمکلام ہے۔ گھنگھریالے چمکیلے نسواری بالوں والا رشید ادب و سیاست پر بے لگان بولتا ہے۔ ظرافت اور بذلہ سخی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ سنہری فریم والی عینک کے شیشوں میں گول گول زندگی سے بھرپور آنکھیں بے قراری سے چمکتی رہتی ہیں۔ لطیفہ سنا کر، محفل کو لوٹ پوٹ کر کے بڑا ایکا منہ، بنائے عینک اتار کر اسے رومال سے صاف کرنے لگتا ہے اور کنکھیوں سے دائیں بائیں دیکھ کر پھر زیر لب خود بھی مسکرانے لگتا ہے۔ کامریڈ ہوٹل میں سرخ و سفید، ادھر عمر زمین اور دقت استاد غلش کشمیری اپنے چہتے شاگرد ضبط قریشی کے ساتھ بیٹھے

منطق، فلسفہ، عروض اور بیان پر بحث بھی کر رہے ہیں اور پنجابی شاعر استاد محبت پر پھبتیاں بھی کس رہے ہیں۔

متھ۔
تو بھیاں ویاہ سبجان اللہ

ادھر دن متھے اور دھر گنڈ پے گئی

تن سیر روپے دے چاؤل آئے

پنچ سیر کئی اوتے کھنڈ پے گئی

ننھو بھی جوڑے کے پٹھاں ورتاؤں لے

جدھر کھنڈ لگی اور دھر ڈنڈ پے گئی

سیف الدین سیف اپنی تازہ کہی ہوئی طویل نظم "ساربان" میں سے کچھ بند سنانے کے بعد اپنی سلگتی پُر سکون نیم وا گرم آنکھوں سے باہر لگی میں تک رہا ہے اور ایک ہاتھ میں سگریٹ سگائے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں آہستہ آہستہ اپنی باریک مونچھوں کے کونوں پر پھیر رہا ہے۔ اب صدیق کلیم بھی بڑی خاموشی اور سکون کے ساتھ سست قدم اٹھاتے آگئے ہیں۔ چاچا عیسیٰ نے آواز لگائی۔

"صوفی صاحب چائے اور آٹے گی۔"

اور صوفی ترک نے دہکتے کوٹوں پر تام چینی کی ایک اور چینک رکھ دی ہے۔ کلہریڈ ہوٹل کے پھٹے پر ادھیر عمر کا بھاری بھر کم حوالہ رفضل آکر بیٹھ گیا ہے اور خلیفے سے تیز چلنی والی چائے بنوا رہا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے وہ ایک چھٹانک افیم ادھر سیر حلوے کے ساتھ روزانہ کھاتا ہے۔ الہ دے کے ہوٹل میں چاق و چوبند، تیز و طرار امرتسر کار جڑگو شاعر نفیس خلیلی آگیا ہے اور تمباکو والا پان منہ میں دبائے دینے جہالتی، حاجی حرامدے اور جیرے گوئے کو اپنا تازہ کلام سنار رہا ہے۔

جہاں جا کے جھنڈے کو گاڑا وطن ہے۔ جہاں شیر ناگہاں دھاڑا وطن ہے

وطن ہے مجاہد کے پاؤں کے نیچے۔

موٹی آنکھوں، تیکھی ناک اور زنانہ چال ڈھال والا جیرا گویا نفیس خلیلی کا تئیس

کلام سن رہا ہے اور واہ واہ کر رہا ہے۔ حاجی حرامہ اپنی کافی آنکھ سے پانی پونچھتے ہوئے نفیس خلیلی پر بھیتی کسے کو پرتول رہا ہے۔ دنیا جہالتی بھری بھری مونچوں پر ہاتھ پھرتے ہوئے بڑے غور سے شعر سن رہا ہے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے کالے پمپ شو والا پاؤں ہلاتے ہوئے گردن ٹیڑھی کئے اس فکر میں ہے کہ خلیلی کے کس شعر پر اعتراض کرے۔

اب بچپن ساٹھ کے سن کا چوڑا چکلا، راجپوتی شان کی سفید گچھے دار مونچوں اور چکیلی آنکھوں والا ایک بزرگ سلیٹی شیرانی پہنے چھڑی ہاتھ میں لئے کامریڈ ہوٹل میں داخل ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر مغل بادشاہوں کے شاہی چوہداروں کا خیال آتا ہے ان کا نام شیخ حبیب ہے۔ غالباً پٹیا لے کے ہیں۔ موسیقی پر بڑی دسترس رکھتے ہیں۔ وہ پوپے منہ والے کالے بھنگ مشہور ربانی استاد فیروز کے پاس جا کر بیٹھ گئے ہیں۔ استاد فیروز کو امرتسر کے بے مثال فارسی شاعر استاد کی فارسی غزلیں زبانی یاد ہیں جنہیں وہ اپنی خشک و پرسوز آواز میں لہک لہک کر گایا کرتا ہے۔ خود بھی روتا ہے۔ اوروں کو بھی رلاتا ہے۔ وہ درو بھری آواز والے، وہ آنکھوں سے محبت کے اتمول موتی گرانے والے لوگ کہاں چلے گئے؛ امرتسر کو آگ لگ گئی۔ کامریڈ ہوٹل اور صوفی ترک ہوٹل جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ محفلیں اجڑ گئیں۔ پھول مڑھاکر سوکھ گئے۔ ڈالیوں سے ٹوٹے پتوں کو ہوا اڑا کر لے گئی۔

اب کے بچے کہاں میں گئے؟۔ دُور پڑے ہیں جا۔

لیکن ابھی تو خلیفے اور صوفی ترک کے ہوٹل میں یاروں کی محفلیں سبجی ہیں۔ نفیس خلیلی انقلابی شعر سنانے کے بعد لطیفے سنا سنا کر فلک شکات قہقہے لگا رہا ہے ترک ہوٹل میں علا الدین کلیم کے بعد اقبال کو ترنم سے شعر پڑھ رہا ہے۔ چوک والی دکان سے پانوں کا تھاں بچ کر آگیا ہے۔ چائے خانے کی فضا پانسنگ شو، قینچی ٹاون ٹاک۔ پلیئر زنیوی کٹ اور کیپشن بیگم کے دھوئیں سے بھر گئی ہے۔ اب ماسٹر ابراہیم اور ماسٹر حبیب بھی آگئے ہیں۔ دونوں بڑے گہرے دوست ہیں ضلع

اور پھبتی نوک بزدبان رہتی ہے۔ بازار ولے حمام کے ایک خوش شکل نو عمر کارگر سے دونوں پیار کرتے ہیں اور ہر روز اُسی سے جا کر ڈاڑھی منڈواتے ہیں۔ ایک روز سیف نے مذاق کیا تو ماسٹر حبیب نے کہا۔

”سیف صاحب! معاملہ الٹ ہو رہا ہے۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ ہم اُس کی شیو بنائیں اُٹا اُس سے ہمیں شیو بنوانی پڑتی ہے۔“

لیجئے۔ بابو غلام محمد بیٹ اور شریف متین کی جوڑی بھی آگئی۔ بابو غلام محمد بیٹ کا ہال بازار کی ایک گلی میں قالینوں کا کارخانہ ہے اور شریف متین قالینوں کی لکھنٹی کرتا ہے اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی امرتسر شاخ کا غالباً سکرٹری بھی ہے۔ درمیانے قد اور لمبوترے چہرے والا گول مٹول بابو غلام محمد بیٹ بڑا جذباتی اور ہنس مکھ ہے۔ عروض منطق اور فلسفے پر لمبی لمبی بحثیں کرنا اور گونگو گوشت کھانا اُسے بہت مرغوب ہے سیف اور ضبط سے اُس کی بحث کسی کئی روز جاری رہتی اور مجھے یاد ہے ہیگل کی جدلیات کا ذکر بار بار آیا کرتا۔ اقبال کو ٹرکے لطیفوں پر وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتا اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ فارسی، اردو یا انگریزی کی کوئی نہ کوئی کتاب ہمیشہ بغل میں ہوتی ہے بحث کرتے ہوئے آنکھوں میں ہلاکی چمک آجاتی ہے بحث علمی مسائل سے نکل کر ذاتیات کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کے ہونٹوں سے جھاگ اڑنے لگتا ہے۔ طبیعت میں شوخی اور شجاعتی دونوں اعتدال کی حد میں ہیں۔ قالینوں کے نقشے بنانے میں بھی وہ ایک ماہر نقاش ہے۔ ایک بار اُس کے کارخانے میں سمرقند کا ایک قالین آیا جس پر میکیم گورکی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ بابو غلام محمد بیٹ نے آنکھیں سکیڑ کر اُس کا ایک ایک مربع ٹکون اوڑھ لیا دیکھی۔ پھر کتاب میز پر رکھی اور سگریٹ کا لمبا سونا رگاکر چٹکی سے گل جھاڑتے بولا۔

”میں اگر قالین پر جناح کی تصویر بنوا کر سمرقندیوں کو نہ دکھاؤں تو بابو غلام محمد

بیٹ نہ کہتا۔“

اور اُسی روز اُس نے پرانے میز پر موٹے کاغذ کا تاؤ پھیلا کر کالی سیاہی سے قالین کا متن تیار کرنا شروع کر دیا۔

کامریڈ ہوٹل اور ترک ہوٹل کی یہ زندگی سے بھرپور محفلیں رات کے بارہ ایک بجے تک جی رہتی ہیں۔ یہاں بنگال کے دیہشت پسندوں، تلنگانہ کے اشتراکیوں، امرتسر کے نیلی پوشوں، اصراریوں، مسلم لیگیوں اور پٹیا لہ گھرانوں کے گائیڈوں، رام باغ کی طوائفوں کٹرہ کنہیا کی رقاصاؤں اور شہابو کے فالوورے تک — ہر موضوع پر باتیں ہوتی ہیں۔ آغا شہر والی داری کا مکان قریب ہی ہے۔ اُس کا ذکر ہوتا ہے تو ماسٹر فیروز رگیں پھلا لیتا ہے اور بھیکم پرنگیا کھیل کا کوئی متطر اس طرح سناتا ہے کہ محفل پر وجد طاری ہو جاتا ہے، ترک ہوٹل کے دروازے پر لکڑی کے آدمی کی طرح چلتا اونچا لمبا، دُبلہ خوش شکل، بے باک رشید لمبو نمودار ہوا ہے۔ خوب شور مچا کر بولتا ہے اور گے پیچھے جھول جھول کر قہقہے لگاتا ہے۔ اُس کا بڑا بھائی خورشید کم گو اور اکڑ مزاج ہے۔ دونوں پاؤں میز کے کنارے پر ٹکا کر کرسی پر بیٹھتا ہے۔ پنڈلیوں پر سے دھوتی کھسکا لیا کرتا ہے اور مقوڑی مقوڑی دیر بعد رگڑ رگڑ کر موڈھی ہوئی پنڈلیوں کو رومال سے جھاڑتا رہتا۔ بہت کم بولتا ہے۔ جب بولتا ہے کفن پھاڑ کر بولتا ہے اور جملے کا لٹھ گھما کر ملتا ہے۔ اُس کی بیٹھک میں انیسویں صدی کے مصوروں کے بڑے شہکار آویزاں تھے جو فسادات کی آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔ اور امرتسر میں فسادات کی آگ کا پہلا شعلہ گول ہٹی سے بلند ہوا تھا۔

گول ہٹی ہال بازار سے کٹرہ کنہیا کی طرف مڑتے ہوئے کونے والی تین کاناں پر مشتمل تھی۔ یہ تینوں دکانیں موٹے تازے، گول مٹول تین سیکھ بھائیوں کی تھیں۔ دو دکانیں منہابی کی تھیں اور ایک دکان پر عمارتی روغن، سپرٹ اور تارپین کا تیل فروخت ہوا کرتا تھا۔ یہ تینوں سیکھ امیر تھے اور ان کی دکانیں مال سے بھری رہا کرتیں۔ منیاری کی دکانوں کے آگے چمڑے کے بیلٹ، اذار بند پراندے اور تلواریں کرپائیں ملکی رہا کرتیں فروری ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز دن تھے۔ پاکستان کی حمایت میں اور ہندو سیکھ پاکستان، اُسے خلافت جلوس نکال رہے تھے۔ فروری کے آخر میں یا غالباً مارچ کی پہلی دوپہر کو ماسٹر تارا سنگھ نے لاہور اسمبلی ہال کے باہر تلوار لہرا کر اعلان کیا کہ سیکھ

پاکستان نہیں بلکہ مسلمانوں کا بھارت میں قبرستان بنائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی لاہور میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ امرتسر کی فضا میں بھی بے حد کشیدگی پیدا ہو گئی۔ غالباً مارچ کی تیسری یا چوتھی تاریخ تھی۔ ٹاؤن ہال والے باغ میں موسری اور کھٹے کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دوپہر کے بعد میں دکان سے حسبِ عادت دو دھپ کر دھوتی قمیض اوٹیلیں پہنے ترک ہوٹل جانے کے لیے ہال بازار میں آگیا۔ میں نے اُن ہی دنوں کا لزوری کا ناولٹ "سیب کا درخت" پڑھا تھا اور سیب کے شگوفوں، موسیقی، لمبوں کی کلیوں کی جھلک اور بلیک فارسٹ کی سرسبز ڈھلوانوں پر اگنے والے سویٹ پیسز کی خوشبوؤں کے ساتھ ساتھ اڑا کرتا اور تصویر ہی تصویر میں اُس نیلے سر و چہرے پر پہنچ جاتا جس کے اوپر سیب کے گھنے درخت کا سایہ تھا اور جس کے برقاب میں ڈوب کر خیال پرست رومانی لڑکی میگن نے اپنے بے وفا محبوب اشٹریٹ کی یاد میں جان دے دی تھی۔ میں سیب کے گلابی شگوفوں کو چومتا، غم زدہ میگن کو یاد کرتا پانگ شوگرٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے ہال بازار میں سے گزر رہا تھا۔ امرتسر کی فضا میں کشیدگی ضرور تھی۔ مگر ہم امرتسر والے اس کے عادی تھے۔ کیونکہ قریباً ہر فہم پر ہندو مسلم فساد ضرور ہو جاتا تھا اور پلٹے ہمیشہ مسلمانوں کا بھاری رہا کرتا۔ چنانچہ امرتسر کے مسلمان بڑے مطمئن اور بغیر کسی خوف کے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ میں جب سکندر خان کی اونچی مسجد سے گزر کر گول ہٹی والے چوک میں آیا تو پیچھے سے ایک تانگہ آکر چوک میں رُک گیا۔ اس تانگے میں تیلی پیلی پگڑیوں والے اکالی سیکھ بیٹھے تھے۔ پیچھے ایک نوبت رکھی تھی۔ ایک اکالی نے دھما دم نوبت پیشی شروع کر دی۔ میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ کافی لوگ جمع ہو گئے۔ گول ہٹی والے سیکھ بھائی بھی اپنی اپنی گدیوں پر کھڑے ہو گئے۔ نوبت بجنی بند ہو گئی۔ اب تانگے کی اگلی جانب سے ایک ہٹاکٹا اکالی سیکھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے کھلے اور اشتعال انگیز لفظوں میں کہا کہ ماسٹر جی نے لاہور میں اعلان کر دیا ہے کہ سیکھ پاکستان نہیں بننے دیں گے۔ مسلمانوں کا پاکستان نہیں قبرستان بنے گا۔ گورو دے پیارو! اٹھ کھڑے ہو جاؤ اور اس گورو کی نگری کو مسلمانوں سے پاک

کر دو۔ وغیرہ وغیرہ۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اُس اکالی سکھ نے مسلمانوں کے خلاف انتہائی زہریلی اور اشتعال انگیز تقریر کی تھی۔ وہ بمشکل کوئی ڈیڑھ ایک منٹ بولا ہو گا کہ رام بارغ والے بازار کی جانب جو مسلمان نوبت کی آواز سن کر جمع ہو گئے تھے انہیں اللہ اکبر کا فلک شکاف نعرہ بلند کیا۔ اس کے جواب میں اکالی سکھوں نے صحت سری اکال کا نعرہ لگایا۔ میں گول ہٹی کے آگے نکلے کے پاس ٹھہرا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے گول ہٹی کے گول مٹول سکھ نے دکان کے آگے ٹٹکتی ہوئی تلواریں دونوں ہاتھوں سے جھٹکا دے کر کھینچیں اور تانگے میں کھڑے اکالی سکھوں کی طرف اُچھال دیں۔ جو تلواریں اور کرپائیں سونت کر مسلمانوں پر پل پڑے۔ یہ وہاں سے بھاگ کر خراسیوں والی گلی میں آگیا۔

یہ امر تسر شہر کے مسلمانوں پر سکھوں کا پہلا مسلح حملہ تھا۔ مسلمانوں کے پاس سوئے زور بازو کے اور کچھ نہ تھا۔ کسی نے دکان پر سے بٹہ اٹھایا۔ کسی نے ساٹھان کا بانس کھینچا اور کرپانوں تلواروں سے مسلح سکھوں کا مقابلہ شروع کر دیا۔ کچھ مسلمان زخمی ہوئے۔ بہر حال پولیس آگئی معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ یہ بات سب کو اچھی طرح معلوم تھی کہ گول ہٹی والوں نے اکالی سکھوں کو مسلمانوں کا قتل عام کرنے کے لئے تلواریں دی تھیں چنانچہ اسی رات رام بارغ چوک فرید اور گلی خراسیاں کے نوجوان مسلمانوں نے گول ہٹی والی تینوں دکانوں کو آگ لگا دی۔ یہ امر تسر میں فساد کی پہلی آگ تھی۔ فساد کا پہلا شعلہ تھا جو نصف شب کے بعد تک اچانک بھڑک اٹھا۔ نے اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر آگ کے سرخ و زرد شعلے بلند ہوتے دیکھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وارنش اور سہٹ سے بھرے ہوئے ڈرموں کے دھماکے کے ساتھ پھٹنے کی آوازیں بلند ہوئیں تھیں۔ سارے محلے میں پینٹ اور وارنش کی بدبو پھیل گئی اگلے روز پولیس نے کچھ مسلمانوں کو گرفتار کر لیا۔ شہر میں مسلمانوں اور ہندو سکھوں کے درمیان زبردست کشیدگی پھیل گئی۔ مسجدوں میں پاکستان کی حمایت میں اور گروداروں مندروں میں پاکستان کے خلاف تقریر ہونے لگیں۔ گلیوں کے منہ دھڑا دھڑا لوہے کے دروازوں سے بند کئے جانے لگے۔ ہندو سکھ ایک عرصے سے

اپنے محلوں میں اسلحہ جمع کر رہے تھے۔ اب مسلمانوں کو بھی ہوش آیا اور مسلم محلوں میں کلباڑے اور بلیں تیار ہونے لگیں۔ ہمارے محلے کے مسلمانوں نے چندہ جمع کر کے گلی کے ایک سربراہ کپڑے کے تاجر کو پیش اور اسلحہ خریدنے بھیجا۔ وہ سارے پیسے ہضم کر گیا اور کچھ پیسے نہ آیا۔ اسی روز لاہور میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ اُس کی خبر امر تسر پہنچی تو اشتعال اور بڑھ گیا اگلے روز جمعہ تھا۔ کٹرہ میاں سنگھ چوک فرید اور گلی رنگریزاں کے بہت سے مسلمان جمعہ کی نماز پڑھنے چوک پر اگر داس ڈالی مسجد میں گئے۔ یہ مسجد سکھوں کے محلے میں گھری ہوئی تھی۔ اس اقدام سے مسلمان غیر مسلموں کو اپنی شجاعت اور اسلام سے محبت دکھانا چاہتے تھے۔ مگر جذبات کے جوش میں نہتے ہی دشمنوں کے بیچ چلے گئے۔ چنانچہ وہ نماز پڑھ رہے تھے کہ سکھوں نے کرپانوں اور تلواروں سے اُن پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے دھوکے لوٹے چلانے شروع کر دیئے جہاں سے لوٹا ہم کی اصطلاح عام ہوئی۔ لیکن دھوکے لوٹے تلواروں کا کہاں تک مقابلہ کر سکتے تھے بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ بہت شدید زخمی ہوئے سکھوں نے چوک پر آگ داس کے مسلمانوں کے مکانوں کو آگ لگا دی مسلمان عورتیں ننگے پاؤں ننگے سر عزت بچا کر کٹرہ میاں سنگھ اور شریف پورے پہنچیں۔ میں اُس وقت ہال بازار کے بنگلہ بازار میں تاج محل ہوٹل کے اوپر احمد راہی کے ماہنامہ ”محور“ کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ ہم دونوں باتیں کر رہے تھے کہ نیچے شور مچا۔

”مسلمانو! چوک پر آگ داس میں سکھوں نے تمہارے بھائیوں کو شہید کر دیا“ ہر طرف ایک جوش اور ہیجان پھیل گیا۔ ہال بازار میں سکھوں اور ہندو اپنی دکانیں بند کر کے بھاگ گئے۔ مسلمانوں نے اُن دکانوں کو لوٹ کر آگ لگا دی۔ ہمارے محلے میں کیسر سنگھ اور لکھتی ٹال دے کے لڑکے کی منیاری کی دکانیں لوٹ لی گئیں۔ کیسر سنگھ سے جب کوئی گاہک نمبر آٹھ مارکہ ڈور کی گوٹ لینے آتا تو وہ سیڑھی لگا کر بند کی طرح اوپر چڑھتا اور ایک ڈبے میں سے گوٹ نکال کر لے آتا تھا۔ لوٹ مار کے دن میں نے اسی طرح سیڑھی دیوار کے ساتھ لگائی۔ بند کی طرح پھرتی سے اوپر چڑھا اور نمبر آٹھ کی ڈور کی پوری درجن گوتیں لے کر نیچے آگیا۔ لکھتی والی دکان سے میں نے جیلٹ بیڈ کے کتے ہی پیکٹ

لوٹے اور گھر میں سنبھال کر رکھ دیئے۔ یہ سب کچھ وہیں پڑے کا پڑا رہ گیا۔ نہال سنگھ عطار کی دکان لٹی تو میں نے محلے کے اوجیر عمر داروغہ کو دیکھا کہ دکان کے پھٹے پر ایک طرف بیٹھا سیب کا مرتبہ کھا رہا تھا۔ دروازہ میاں سنگھ والے سکھ کا شراب کا ٹھیکہ بھی لوٹ لیا گیا۔ ہماری گلی کا جان بد معاش میٹھ مالٹا شراب کی بوتلوں کی بوری بھر کر اپنے گھر لے آیا اور پورے چھ مہینے یعنی امرتسر چھوڑنے تک وہ شراب کے نشے میں دھت رہا۔ محلے کے ایک سکھ کے مکان میں سے اُسے ایک برجس اور دونالی بندوق مل گئی تھی۔ پھولی ہوئی برجس پہنے کندھے پر دونالی لٹکائے۔ شراب کے نشے میں جھومتا جھامتا وہ راتوں کو گلی کے آہنی دروازے کے گرد پہرہ دیا کرتا۔ جب موج آتی دھائیں دھائیں ہوا میں ایک دو فائبر کر دیتا۔

شہر کے دوسرے علاقوں میں مسلمان، ہندو سکھ مخلوں میں گھرے ہونے کے باوجود بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کر رہے تھے خنجر زنی اور چھرا گھونپنے کی جگہ جگہ وار داتیں ہو رہی تھیں۔ جس روز مسلمانوں نے کٹرہ کنہیا لال کی ساری ہندو دکانوں کو آگ لگا دی اُس سے اگلے روز شہر میں پہلی بار دودن کا کر فیو لگا دیا تھا۔ ایک ہوائی جہاز نے شہر پر اشتہار پھینکے۔ ایک اشتہار اتفاق سے میرے پاس محفوظ ہے۔ اُس کی ایک طرف گورکھی اور دوسری طرف اردو میں کر فیو کا حکم درج ہے۔ میں اسے یہاں نقل کر رہا ہوں۔

اعلان

”امرتسر شہر میں، مارچ ۱۹۴۷ء دو بجے دن کے دودن کے لئے ۲ گھنٹے کا کر فیو نافذ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد آئندہ پانچ دن کے لئے ۲۰ گھنٹے کا کر فیو جس میں ۱۰ بجے سے ۳ بجے دن ۲ گھنٹے کا وقفہ ہوگا، لاہور جالندھر میں ریلوے لائن کے جنوبی جانب میونپل حدود میں نافذ رہے گا۔ جس شخص کے قبضہ میں کوئی ہتھیار یا کوئی ایسی چیز جو بطور ہتھیار کے استعمال ہو سکے ماسوائے کرپان کے جو میان میں ڈالی ہوئی ہو۔ پائی گئی یا جو کوئی شخص نوٹیا یا آگ لگاتا ہوا دیکھا گیا اُس کو نظر پڑتے ہی گولی مار دی جائے گی۔ ان احکام کو نافذ کرنے کے لئے فوجی دستے دو بجے دن کے بعد شہر میں گشت کریں گے۔“

اعلان

امرتسر شہر میں، مارچ ۱۹۴۷ء دو بجے دن کے دودن کے لئے ۲ گھنٹے کا کر فیو نافذ کیا گیا ہے۔ اُس کے بعد آئندہ پانچ دن کے لئے ۲۰ گھنٹے کا کر فیو جس میں ۱۰ بجے سے ۲ بجے دن ۲ گھنٹے کا وقفہ ہوگا، لاہور جالندھر میں ریلوے لائن کے جنوبی جانب میونپل حدود میں نافذ رہے گا۔ جس شخص کے قبضہ میں کوئی ہتھیار یا کوئی ایسی چیز جو بطور ہتھیار کے استعمال ہو سکے ماسوائے کرپان کے جو میان میں ڈالی ہوئی ہو۔ پائی گئی یا جو کوئی شخص نوٹیا یا آگ لگاتا ہوا دیکھا گیا اُس کو نظر پڑتے ہی گولی مار دی جائے گی۔ ان احکام کو نافذ کرنے کے لئے فوجی دستے دو بجے دن کے بعد شہر میں گشت کریں گے۔

امرتسر میں انگریز حکومت کی طرف سے لگائے گئے کر فیو کا اعلان

”اوئے مار سٹیا اسی“

ਇਲਾਨ

اور تیسری انگریز حکومت کی طرف سے لگائے گئے کریڈو کا گورنر بھی اشتہار

ਭੀਰੋਂ ਪ੍ਰੀਤੀ ਗ ਵਰਕਮ ਪਾਤੀਰ

دروازہ میاں سنگھ کے باہر مشرقی جانب کوئی ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر اکالی اور نینگ سکھوں کا ایک گردوارہ تھا جہاں انہوں نے ایک قلعہ بنا رکھا تھا اس قلعے کی دیواروں میں سے سکھ اس قلعے کا نام بُرج پھولا سنگھ تھا۔ کثرہ میاں سنگھ، چانی دند اور گھی منڈی کے مسلمان محلوں پر ٹانگ کرتے رہتے تھے۔ گرمیوں کے دھواں آلود فساد زدہ گرم دن تھے۔ ہمارے محلے میں لال حویلی والے مکان کی چھت پر خواجہ فیض اپنے ایک دوست کے ساتھ بندوق لئے پہرہ دے رہا تھا۔ وہ اونچا لمبا بھرپور کشمیری جوان تھا۔ اُس نے صرف دھوتی پہن رکھی تھی۔ پہرہ دیتے دیتے خدا جانے کس لئے وہ اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ بُرج پھولا سنگھ کی جانب سے تھری ناٹ تھری کی گولی آئی اور سیدھی فیض کی چھاتی میں لگ کر لگی۔ وہ خون میں لت پت گرا اور وہیں شہید ہو گیا۔ اُسکی لاش نیچے لاکر جب اُس کے باپ کو دکھائی تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ بوڑھا باپ اس صدمے سے حواس کھو بیٹھا بار بار یہی کہتا۔

”میں نے کہا تھا فیض قمعین پہن کر اوپر جا۔ قمعین پہن کر جا۔۔۔۔۔“

ایسے کئی ماؤں کے شیر پاکستان پر قربان ہو گئے اور آج اُن کے نام سے بھی کوئی واقع نہیں۔ لیکن اُن کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ اُن کا خون رائیگاں نہیں جاسکتا۔ شریف پورے سے لے کر مسلم بانی سکول تک جی ٹی روڈ کے ساتھ ساتھ دن رات پہرہ دیا کرتے دروازہ میاں سنگھ کی جانب سے وہ برقعہ پوش عورتیں تحصیل پورے کی طرف جا رہی تھیں۔ جب وہ آدھے راستے میں پہنچیں تو بُرج پھولا سنگھ کی جانب سے کچھ اکالی سکھوں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ اور انہیں اٹھا کر لے گئے۔ پھرے ہوئے شیروں کی طرح شریف پورے کے نوجوان ہاکیاں وغیرہ لے کر نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے لپکے اور آدھے راستے میں ہی اکالی سکھوں کو لیا۔ بڑے زور کی لڑائی ہوئی۔ ایک ارائیں دلیر نوجوان رفیق پونگی کو گولی لگی۔ مسلمان عورتوں کو چھڑا لیا گیا۔ رفیق پونگی کو اُس کے گھر تحصیل پورے لے جایا گیا۔ خون بہت بہہ رہا تھا۔ وہ جوش میں نعرے لگا رہا تھا۔ رات کے پہلے حصے میں اس شہید نے بھی دم توڑ دیا۔ بقول محمد اکرم بٹ آف ریڈیو پاکستان ملی آنکھوں والا یہ ارائیں نوجوان

امر تسر کا پہلا شہید تھا۔

دروازہ رام بارغ کے باہر اکتے اور تانگے رولاں، اجنالہ، فتح گڑھ چڑیاں، جیٹھ اور چیماری جایا کرتے تھے۔ چیماری اپنے میٹھے فروبزوں اور پورن بھگت کی سوتیلی ماں مائی لوٹاں کی جنم بھومی کی وجہ سے مشہور تھا اور جیٹھ پنجاب کے سرکردہ اور امیر ترین سکھوں کا گڑھ تھا۔ جیٹھ کے تمام مسلمان خاندانوں کو سکھوں نے بے دردی سے شہید کر دیا۔ مشہور افسانہ نگار اور پروفیسر غلام علی چوہدری کے گھر کے انیس بیس افراد شہید کر دیئے گئے۔

فساد زدہ امر تسر کی ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی کہ بُرج پھولا سنگھ کے اکالی سکھوں نے ہمارے محلے پر حملہ کر دیا۔ چوٹی بد معاش نے لگی میں لگ کر نعرہ مارا۔
”اوئے کافر آگئے جے۔ نکل آؤ بار مسلمانو“

اس کے ساتھ ہی محلے میں ہیجان پھیل گیا جس کے ہاتھ میں جو آیا لے کر دروازہ میاں سنگھ کی طرف اٹھ دوڑا۔ جان بد معاش نے اپنی کوٹھڑی میں جا کر میٹھ مالٹا کی چکی لگائی، دھنل سنبھالی اور چنگھاڑتا ہوا اکالیوں سے لڑنے کے لئے لپکا۔ اتفاق کہ بات ہے کہ میں نے بھی جوش میں آکر ہاکی پکڑی اور دوسرے محلے داروں کے ساتھ اٹھ دوڑا۔ میں لگی میں بھاگتا بھی جا رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا کہ میرے دہاں تک پہنچتے پہنچتے لڑائی ختم ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ مکاتوں کی کھڑکیوں میں عورتیں چھتیں اٹھائے سہی کھڑی تھیں۔ اُن کو دیکھ کر مجھے بہت جوش آیا اور میں اور تیز دوڑنے لگا۔ میدان کارزار میں جا کر معلوم ہوا کہ اکالیوں کے محلے کو دروازے کے مسلمانوں نے نہ صرف بہادری سے روک لیا بلکہ انہیں پسپا کر کے بُرج پھولا سنگھ کی طرف بھگا دیا۔ ایک اکالی سکھ کی موٹی تازی کٹی ہوئی پینٹلی دروازے کے باہر جی ٹی روڈ پر پڑی ابھی تک پھڑک رہی تھی۔ ہمارے محلے کے دوچار نوجوان زخمی ہوئے۔ شدید زخمی ہونے والوں میں غلام قادر آف قادر شوز بھی تھے۔

امر تسر میں فساد کے شعلے وقت کے ساتھ ساتھ تیز سے تیز تر ہو رہے تھے فضا میں ہر وقت مٹی کا تیل جلی ہوئی لکڑی اور گندے بیروزے کی بو پھیلی رہتی تھی۔ شہر کی قطبی، ثقافتی اور کلچرل زندگی ختم ہو گئی تھی۔ بارغ اُجڑ گئے تھے۔ کمپنی بارغ، سکری بارغ اور

گول بارغ میں خاک اڑتی تھی۔ پھلوں کے بارغ ویران ہو گئے تھے۔ ہواؤں میں ایک دہشت اور خوف کی فضا چلی تھی۔ اب یہ بات بھی کھل چکی تھی کہ امرتسر پاکستان میں نہیں آئے گا۔ ریڈ کلف کی اندھی لکیر نے گورڈ سپر ہو سٹیاں پور اور جموں پٹھانکوٹ کے مسلمانوں پر بھی ایک قیامت برپا کر دی تھی۔ کامریڈ ہوٹل اور صوفی ترک ہوٹل والی ساری کی ساری مارکیٹ نذر آتش کر دی گئی تھی۔ ان ہوٹلوں بیٹھنے والے ادیب، شاعر، نقاد، موسیقار، دانشور اور سیاستدان اپنے محلوں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ جالندھر اور پنجاب کے دوسرے شہروں سے آفت زدہ مسلم مہاجرین کے قافلے پاکستان کی طرف چل پڑے تھے۔ امرتسر کے مسلمانوں نے دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا لیکن اب وہ بھی پاکستان کی طرف ہجرت کرنے لگے تھے مسلمان پولیس سے ہتھیار لے لئے گئے تھے۔ شہر میں گورکھا جاٹ اور سکھ فوج آ گئی تھی۔ شریف پور سے کو مسلم مہاجر کمیپ قرار دے دیا گیا اور اس کے باہر بلوچ جہنم کے سپاہی بیٹھ گئے کوچہ رنگریزاں میں بارغ رامند کے ہندو سکھوں نے فوج کے ساتھ مل کر اچانک حملہ کر کے بہت سے مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ باقی لوگ بڑی مشکل سے جان بچا کر ہمارے محلے گلی ڈبگراں میں آ گئے۔ سوائے ہمارے محلے اور شریف پور سے کے سارا امرتسر ہندو سکھ فوج کی بربریت کی زد میں تھا۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کے گھروں کو ٹوٹ ٹوٹ کر اور آگ لگا کر تھک گئے تھے۔ اب وہ ہمارے محلے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خبر آئی کہ مسلم لیگ کے ٹرک لاہور سے مسلمانوں کو لینے کے لئے آ رہے ہیں۔ ایک روز دو فوجی ٹرک گلی کے باہر آ کر رک گئے ان میں گلی کے ایک سرمایہ دار نے گھر کا سارا سامان لاوا اور غریب مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر پاکستان کو روانہ ہو گیا۔ جائے بد معاش کی ساری بوتلیں ختم ہو چکی تھیں اور وہ سر جھکاٹے ایک دکان کے پھٹے پر اداس بیٹھا تھا۔

اور پھر ایک روز گورکھا فوجیوں نے گلی کے دروازے پر دستی بم پھینک دیا۔ ایک ہیبتناک دھماکہ ہوا اور گلی میں بھگدڑ مچ گئی اور سب لوگ اپنا سامان وہیں چھوڑ لال جوتی اور گوجروں کی گلی میں سے ہو کر شریف پور سے کی طرف بھاگنے لگے جی روڈ پر سے گزرتے

ہوئے ایک سکھ ملٹری ٹرک نے ان پر فائرنگ کی جس سے کئی مسلمان شہید ہو گئے۔ غلام محمد پشینے والے کا جوان بیٹا موسیٰ اپنے ننھے بچے کو گود میں اٹھائے بد رو پار کر رہا تھا کہ گولی لگنے سے دونوں باپ بیٹا شہید ہو گئے۔ پٹھان خانہ بدوشوں کا ایک قافلہ ریلوے سٹیشن سے ہو کر پیدل ہی لاہور کی طرف چل پڑا تھا۔ اس قافلے کے تمام افراد کو چھبرٹ کے پاس سکھوں نے شہید کر دیا۔ ریل گاڑی کی کھر کی تھوڑی سی اوپر اٹھا کر میں نے اپنی آنکھوں سے ان افراد کی لاشیں خورد و جھاڑیوں اور درختوں کے پاس بکھری ہوئی دیکھیں۔

امرتسر کے مسلمان اپنے آباؤ اجداد کے مکانوں، گلی محلوں، باغوں اور مسجدوں کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ ان کے چہرے ویران تھے۔ بالوں میں خاک پڑی تھی اور پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ امرتسر کے آسمان پر دھواں ہی دھواں تھا۔ جلے ہوئے مکانوں، گلی محلوں اور مسجدوں کا دھواں — قرطبہ کی عبادت گاہیں ایک بار پھر ویران ہو رہی تھیں۔ غرناطہ کے باغات ایک بار پھر اجڑا رہے تھے۔ ہسپانیہ کے گلی کوچے ایک بار پھر خونِ مسلم سے لالہ زار بن گئے تھے۔ اندلس کی وادیاں تیرہ و تار ہو گئیں۔ انگور کی بیلوں سے چھتی ہوئی گلاب مسلمانوں کے خون کی پیاس بن گئیں۔ امرتسر! — تیرے پسینے میں ہماری خوشبو تھی۔ تیری سانسوں میں ہماری مہک تھی۔ تیری صبحوں میں ہماری ماؤں کی تلاوت کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ تیری مسجدوں کے ٹھنڈے فرشوں پر ہم نے سجدے کئے۔ تیرے بلند و بالا مناظر پر ہم نے صبح و شام خدا کی عظمت و جلال کی صدا بلند کی۔ ہم نے تجھے اپنا خون دے کر پالا۔ مگر تو نے سنگدل دشمن بن کر اپنے شہر کے گلی کوچوں میں ہمارا خون بہایا۔ ہم تجھ سے اپنے خون کا بدلہ لیں گے۔ ہم ان بہنوں کو نہیں بھولیں گے جن کا سہاگ تیری گلیوں کی خاک میں دفن ہو گیا۔ ہم اپنی ان ماؤں کو فراموش نہیں کریں گے جن کے جگر گوشوں کا خون تیرے بازاروں کو لالہ زار کر گیا۔

ہسپانیہ تو خونِ مسلمان کا امیں ہے
مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

پوشیدہ تبری خاک میں سجدوں کے نشان ہیں

خاموش افانیں ہیں تری بادِ سحر میں

امر نسر! ہم تباہ حال مہاجرینِ کرتیرے شہر کے جلتے ہوئے دروازوں سے نکلے
تھے۔ اب پُر شکوہ فاتح بن کرتیرے شہر میں داخل ہوں گے۔ اپنے طلوع ہوتے سورج
میں ہماری رخ کی روشنی دیکھو! اپنی بے اذال خاموشی میں ہمارے فاتح گھوڑوں کی یلغار سن!

آگ اور خون کے گلاب

مارچ ۱۹۴۷ء کی تیسری تاریخ تھی۔ میں لاہور سے آنے والی ٹرین پر امرتسر ریلوے اسٹیشن کے ایک
نمبر پیٹ فارم پر اترا تو وہاں کی فضا کچھ دیران دیران محسوس ہوئی۔ حسبِ عادت میں نے امرتسر کالٹ
نہیں خریدا تھا اور اب لائینوں لائن شریف پورے والے پھانگ کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔
ٹرین کے انجن کے پاس دو چار آدمی کھڑے کھسکھس کر رہے تھے۔ مجھے ان کے قریب سے ہو کر
پیٹ فارم کی ڈھلان اتر کر آگے ریلوے یارڈ میں جانا تھا اور پھر میری صیوں والے پکی کے نیچے سے
گزر کر شریف پورے والے پھانگ تک پہنچنا تھا۔ ان میں ایک سیکھ بھی تھا۔ ان کی باتوں سے پتہ
چلا کہ شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے۔

میں نے کوئی خیال نہ کیا کیونکہ امرتسر میں ہر محرم شبِ برات پر ہندو مسلم تصادم ہوتا ہی
رہتا تھا۔ محرم کے تہریٹے ہندو سیکھ اکثریت کے گورو بازار، درشنی ڈیورٹی، کر موڈیورٹی اور بازار مائی
سیرال سے گزرتے تھے اور ہندو اوپر سے ایشیں پھینکتے تھے۔ پھر دیکھتے دیکھتے چاقو چھری سے نکل
آتے۔ لیکن امرتسر ریلوے یارڈ میں سے گزرتے ہوئے میں نے دائیں جانب دیکھا تو دور لیک
جگہ دھواں اٹھتا نظر آیا۔ کہیں آگ لگی تھی۔

پھانگ پر پہنچا تو کچھ لوگ چار پائی اٹھائے بڑے ہسپتال کی طرف جا رہے تھے۔ یہ ہمارے
محلے کے لوگ تھے۔ چار پائی پر ہمارے ہی محلے کا ایک گاڑی بان نوجوان خون میں لت پت پڑا تھا۔
پتہ چلا کہ برج پھول سنگھ کے نہنگوں اور اکالیوں نے ہمارے کھڑے پر حملہ کر دیا تھا۔ جب رڑائی ہوئی۔
ہم کھڑا مہان سنگ میں رہتے تھے اور دروازہ مہان سنگ سے گزر کر اپنے محلے میں جاتے
دروازہ مہان سنگ کے سامنے دائیں جانب کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر سکھوں نے ایک چھوٹا سا

قلعہ بنارکھا تھا جس کا نام بُرج بھلا سنگھ تھا۔ اس پر امرتسر کے مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا مگر کہتے ہیں کہ سرسکندر نے سکھوں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ وہاں قلعے کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

بہر حال اس قلعے سے نکل کر سکھوں نے ہمارے دروازے پر حملہ کر دیا۔ اس سے ایک روز پہلے یا اسی روز لاہور میں پنجاب اسمبلی کی سیرٹیفیکیٹ پر سکھوں کے لیڈر تارا سنگھ نے تلوار لہرا کر اعلان کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کا قبرستان بنامیں گے مگر پاکستان نہیں بنے دیں گے۔ اس سے مشتعل ہو کر نہنگوں کی ایک ٹولی تلواریں لے کر جمائے محلے پر ٹوٹ پڑی۔

مسلمانوں کے پاس کبھی کچھ نہیں ہوا کرتا بس خدا کے بھروسے پر ہی لڑا کرتے ہیں۔ اس روز بھی سکھوں کی تلواروں کا مقابلہ مارے محلے کے نوجوانوں نے چار پائیوں کے پایوں سے کیا۔ ہمارے نوجوان زخمی ہوئے۔ پھراؤ سے نہنگ والیں اپنے قلعے کی طرف بھاگ گئے۔

کھڑے کے دروازے پر دیرانی تھی۔ پولیس آگئی تھی۔ محلے میں پہنچا تو بڑا جوش و خروش تھا تیسرے پہر میں مال بازار میں آیا تو ایک تانگہ گول ہٹی کے آگے آکر رکا۔ اس میں زرد کپڑوں والے سکھ نہنگ بیٹھے تھے۔ پیچھے زبیت رکھی تھی۔ نوبت بجا کر لوگوں کو اکٹھا کیا گیا۔ پھر اگی نشست پر اٹھ کر ایک سکھ نے مسلمانوں کے خلاف ایک تقریر کی اور مارٹر تارا سنگھ کا حوالہ دے کر کہا۔

”ہم مسلمانوں کا قبرستان بنا دیں گے۔ پاکستان کبھی نہیں بنے دیں گے۔ گول ہٹی سکھوں کی جنرل مرچنٹ کی دکان تھی اور وہاں تلواریں بھی فروخت ہوتی تھیں میں گول ہٹی کے ایک طرف کھڑا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے گول ہٹی کے سکھ نے تلواریں تانگے میں بیٹھے نہنگوں کی طرف اچھال دیں کہ مسلمانوں کا قتل شروع کریں۔“

چوک میں جگہ ڈچ گز نہنگوں نے تلواریں لہرا کر تانگے سے چھلانگیں لگائیں اور مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمان نہبتے تھے۔ اینٹ، پتھر اور سوڑے کی بوتلوں سے مقابلہ کیا۔ پولیس آگئی۔ بازار بند ہو گیا۔ اُدھی رات کو مسلمانوں نے گول ہٹی کو آگ لگا دی۔ امرتسر کی یہ سب سے پہلی بھیانک آگ تھی جس نے گول ہٹی کی تینوں دکانوں کو جلا کر رکھ کر دیا۔

اب شہر میں فسادات کی آگ جگہ جگہ بھڑک اٹھی دونوں طرف سے تیاریاں ہونے لگیں گیوں پر لوہے کے دروازے چڑھوا دیئے گئے۔ ہندو سکھ محلوں میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔

اور ان کے مکانوں کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ اسی طرح مسلم محلوں میں ہندو سکھوں کے مکان لوٹ کر تندر آتش زدہ ہو گئے۔ اور پھر ۶۔ اپریل ۱۹۴۷ء کو امرتسر شہر پر ایک چھوٹے سے جہاز نے پرواز کی اور اشتہار گراٹے۔ ان پر لکھا تھا کہ شہر میں ۱۷ مارچ دو بجے دن سے دو دن تک کے لیے ۲۲ گھنٹے کا کر فیوگ دیا گیا ہے اس کے بعد آئندہ پانچ دن کے لیے ۲۰ گھنٹے کا کر فیوگ جس میں دس بجے دن سے دو بجے دن چار گھنٹے کا وقفہ ہوگا۔ خدا جانے کس طرح یہ اشتہار میرے ساتھ ہجرت کے بعد لاہور آگیا جواب بھی میرے پاس ایک یادگار کے طور پر محفوظ رہے۔

پھر چوک پر آگ داس کا سانحہ ہوا۔ اس چوک میں سکھوں کی اکثریت تھی۔ وہاں مسلمانوں کے چند ایک گھر تھے۔ سکھوں نے ان سب کو شہید کر کے ان کے مکانوں کو آگ لگا دی۔ اگلے روز جمعہ تھا مسلمانوں نے اعلان کر دیا کہ وہ جمعہ کی نماز چوک پر گلاس والی مسجد میں پڑھیں گے۔ ہر مسلمان اپنے ساتھ ایک ایک لوٹا لیتا گیا۔ نماز کے دوران سکھوں نے حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے لوٹے مار مار کر سکھوں کو بھگا دیا۔ یہاں سے لوٹا ہم مشہور ہو گیا۔ مسجد میں کئی مسلمان شہید ہوئے۔ میں نے حماقت یہ کی کہ حالات کا جائزہ لینے کے لئے ملکہ کے بت سے آگے جلیانوالہ باغ سے ہو کر بازار بھنگیاں کی جانب نکل گیا جو قافلہ سکھ آبادی تھی۔ اصل میں ہم امرتسر ہی بڑے دلیر تھے۔ اور اپنے آپ پر بھروسہ ہوتا تھا کہ سکھ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے یہی وجہ ہے کہ جب تک سارے شہر پر گورکھا اور ہندو سکھ فوج نے قبضہ نہیں کر لیا امرتسر مسلمان ڈٹ کر جگہ جگہ ہندو سکھوں کا مقابلہ کرتے رہے۔

بازار بھنگیاں سے ذرا آگے گیا تو سامنے گورو رام داس کی سرائے تھی اور اس کے پیچھے سیاہ گارڈھا دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایک جگہ ہندو سکھ جمع تھے اور اس عزم کا اظہار کر رہے تھے کہ شہر میں کسی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مجھے بھی انہوں نے ہندو سمجھا کیونکہ ان دنوں میں کھدر کا کرتہ پاجامہ پہنا کرتا تھا۔ گورو رام داس کی سرائے سے سکھوں کی ایک ٹولی تلواریں لہراتی، نعرے لگاتی آئی۔ اب مجھے خطرے کا شدید احساس ہوا۔ پھر بھی میں لوگوں میں کھڑا رہا۔ کیونکہ بھاگنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ مشتعل سکھوں کی ٹولی مسلمانوں کے خلاف نعرے لگاتی باغ راما نند کی طرف نکل گئی۔ میں بظاہر بڑے آرام سے ٹہلتا ٹہلتا وہاں سے نکل کر کسیری باغ میں آیا اور پھر بھاگ کر کوچہ

لگ رہے تھے۔ کوئی راکھا دیاں نظر نہ آیا۔ امرتسر ریلوے اسٹیشن پر آئے ہی معلوم ہوا کہ شہر میں اگلے روز صبح بجے تک کارفیو لگا ہوا ہے۔ پلیٹ فارم پر مجھے اپنا دوست قیوم شیخ مل گیا اس نے کہا کہ قیو ابھی ابھی لگا ہے۔ میرا خیال ہے ہم کوشش کر کے محلے میں پہنچ سکتے ہیں۔

قیوم شیخ کا محلہ میرٹھیوں والے پل کے پار تھا۔ زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ پھر بھی کارفیو لگ چکا تھا لیکن ہم لوگ امرتسر کو اب بھی اپنا گھر ہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ ہم اسٹیشن کے یارڈ سے گزر کر دیوار بھاند میرٹھیوں والے پل کی دوسری جانب سڑک پر آگئے۔ شہر سنان تھا اوپر سے ایک آدمی نے کھڑکی، کھول کر آواز دی۔ ”اوتے منڈیو اکیوں مرن نوں تھال لبھ دے او“

قیوم شیخ کا محلہ بالکل سامنے تھا۔ ہم بھاگ کر اس کے محلے میں آگئے۔ ساری رات میں نے قیوم شیخ کے گھر پر لبر کی۔ حالات واقعی بہت خراب ہو چکے تھے قیوم کے گھر کے پیچھے ہندوؤں کا محلہ تھا۔ وہاں سے دو مسلمانوں کی لاشیں اٹیں۔ ایک عورت شدید زخمی حالت میں تھی۔ چھت پر مسلمان نوجوان بیٹھے اکا دکا فائر کر دیتے تھے۔ شہر میں صرف ہندو سکھ فوجی پھر رہے تھے۔ صبح کر فیو اٹھا تو میں بھاگ کر اپنے گھر پہنچا۔ گھر والے مجھے دیکھ کر خوش بھی ہوئے اور حیران بھی ہوئے کہ میں نے اتنا لمبا سفر کیسے طے کر لیا۔ میں نے انہیں الٹی میٹم دے دیا کہ پانچ منٹ کے اندر نڈر جس نے میرے ساتھ لاہور چلنا ہے تیار ہو جائے۔ بزرگ میرا مذاق اڑانے لگے۔

”پاگل ہو گئے ہو؟ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

لیکن میں والدہ، آپو جی اور دو چھوٹی بہنوں کو ساتھ لے کر گئی میں آگیا۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ محلے والوں نے ہمیں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ میدا ملی موریا شکاری بڑی سپنے کندھے پر سو بھا سنگھ کے مکان سے ٹوٹی ہوئی بندوق رکھے آگیا۔

”لو جی! خیفے کا گھر بھی لاہور جا رہا ہے۔“

میں نے اسی جگہ رہنے کی قسم کھائے ہوئے تھے لیکن میں دہلی سے امرتسر تک کے حالات دیکھ کر آیا تھا۔ میں نے دروازہ نہاں سنگھ میں اگر ایک مسلمان تانگے والے کو دس روپے پر راضی کیا اور ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا، میں نے شریف پورے کی طرف دیکھا، سرکر روڈ والے یو کیش آریٹھیم کے درخت فاموش کھڑے تھے اور دور آسمان پر دھواں اٹھ رہا تھا۔ نویں

رنگریزاں میں گھس گیا جو ہمارے ہی محلے میں تھا۔

اب امرتسر میں ہر طرف آگ اور خون اور لاشیں تھیں۔ انہیں کیا بیان کروں۔ مشرقی پنجاب کے ہر شہر میں یہی خونیں کھیل کھیل گیا۔ لوگ ابھی تک اس آگ کی تپش اور خون کی بو کو بھولے نہیں ہوں گے۔ بازاروں کے بازار جل کر راکھ ہو گئے۔ کارفیو کے ساتھ جگہ جگہ آگ بھڑک اٹھتی۔ کارفیو کھتا تو خنجر زنی کی وارداتیں شروع ہو جاتیں۔ میں فروری ۱۹۴۷ء کے اخیر میں کولمبو سے امرتسر آیا تھا۔ وہاں میں بھائی جان۔ کپٹن ممتاز ملک کے ساتھ کام کرتا تھا اور مجھے پھر واپس جانا تھا۔ لیکن فسادات نے مجھے امرتسر میں ہی روک دیا۔ آخر جولائی کے پہلے ہفتے میں کسی نہ کسی طرح فرنیٹر میل پر سوار ہو کر دہلی پہنچ گیا۔ وہاں سے مدراس ایکسپریز پکڑی اور مدراس آگیا۔ یہاں کی فضا بڑی پرسکون تھی۔ مدراس سے ریل میں بیٹھا تو دھنش کو ڈی پہنچ کر سٹیر میں آدھ گھنٹے کے سمندری سفر کے بعد سیلون کی بندرگاہ ٹالی منارا تھرا۔ یہاں سے کولمبو میل میں سوار ہو کر ایک رات اور ایک دن کے سفر کے بعد کولمبو پہنچ گیا۔

جولائی کے اخیر میں امرتسر سے بڑی بھیانک خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ پاکستان بن چکا تھا اور امرتسر پاکستان میں نہیں آیا تھا۔ اگست کے پہلے ہفتے میں کولمبو سے واپس امرتسر کے لئے روانہ ہو گیا۔ دہلی تک تو حالات قدرے ٹھیک ٹھاک تھے۔ دہلی سے آگے آیا تو انبالے کے اسٹیشن پر مسلمان برقع پوش عورتوں کو بے سرو سامانی کے عالم میں پلیٹ فارم پر ہجوم در ہجوم جمع دیکھا جو اپنے بچوں کو سینے سے لگائے لاہور والی گاڑی کا انتظار کر رہی تھیں۔ سکھ فوجی اور پولیس والے انہیں ہماری گاڑی سے دور رکھے ہوئے تھے۔ لدھیانے کے اسٹیشن پر بھی مسلمان مہاجرین کے ہجوم دیکھے جو پریشان حال تھے اور شہر چھوڑ کر وہاں آن بیٹھے تھے۔ یہی وہ مسلمان تھے جو سیشل ٹرینوں میں سوار ہو کر لاہور کی طرف روانہ ہوئے اور جنہیں راستے میں ہی ہندو سکھوں نے کاٹ کر پھینک دیا۔ بالآخر ریلوے اسٹیشن پر سکھ کرپانی اور تھواریں لئے پھر رہے تھے۔ یہاں کوئی مسلمان دکھائی نہ دیا۔ یہاں سے گاڑی چلی تو دہلی بانیں کھیت ویران تھیں۔ دور کہیں کہیں دیہات میں دھواں اٹھ رہا تھا۔ کرتار پور کے قریب ریلوے لائن کے ساتھ ایک چھوٹا سا گاؤں گزرا۔ اس کے مکانوں میں آگ لگی تھی۔ کھال کے پاس دو لاشیں اونٹنی پر پڑی تھیں۔ گاڑی مانا نالہ سے گزر کر امرتسر شہر کی حدود میں آگئی۔ یہاں بھی وہی مرگ آلود فضا تھی۔ شریف پور کے سامنے والے امرودوں کے باغ اُجڑے اُجڑے

خانقاہ کے باہر بد رو کے کنارے ایک لاش پڑی تھی، شیشی پر مسلمان مہاجرین کے ٹکڑے لگے تھے، یہ لوگ زیادہ تر لوہے کے ہاتھی دروازہ اور دائم گنج سے آئے تھے، چھت پر بلوچ رجمنٹ کے جوان ہونچے لگے بیٹھے تھے کیونکہ سیلا مندر کی جانب سے ہندو فائرنگ کرتے تھے، بوڑھے ایکسپریس اگرز کی بڑی مشکل سے ایک ڈبے میں گھس کر کھڑے ہو گئے، ٹرین چلی، فائرنگ شروع ہو گئی، ٹرین رک گئی، بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے فائرنگ کا ڈٹ کر جواب دیا، ہندوؤں نے فائرنگ بند کر دی، ٹرین پھر روانہ ہوئی، چھ ہرٹھ کے پاس میں نے جھاڑیوں میں جگہ جگہ پٹھانوں کی لاشیں دیکھیں، بعد میں پتہ چلا کہ یہ مسلمان پٹھان اپنے گدھے لے کر پیدل ہی لاہور کی طرف روانہ ہو گئے تھے، لوگوں نے انہیں منع بھی کیا مگر وہ نہ رکے اور چھ ہرٹھ کے پاس سکھوں نے حملہ کر کے انہیں شہید کر دیا۔ گاڑی بڑی ہلکی رفتار سے جا رہی تھی، خاصہ ریوے اسٹیشن پر سکھ کھڑے تلواریں لہرا لہرا کر مسلمانوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ اتاری تک سکھوں کی گالیوں نے بہلا پیچھا کیا، واگہ آیا تو ایک جگہ بانس کے ساتھ پاکستان کا پرچم ہوا میں لہرا رہا تھا لوگوں نے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ گاڑی لاہور کے پلیٹ فارم نمبر ۶ پر آکر کھڑی ہو گئی، مسلم لیگ کے رضا کار بھجنے ہوئے چلے، روٹیاں اور اچارے کرا گئے۔ وہ ایک ایک سے خیریت پوچھ رہے تھے، لاہور کے لوگ بازو کھول کر مہاجرین کو گے لگا رہے تھے۔ ہمیں ریوے اسٹیشن کے پوسٹ اینڈ پارسل آفس کی طرف سے باہر نکالا گیا، معلوم ہوا کہ اسٹیشن کے سامنے گورو دارہ شہید گنج سے سکھ مسلمانوں پر فائرنگ کر رہے ہیں، اسٹیشن کے باہر چھوٹے سے باغ میں تمبوگ تھا یہاں مہاجرین کو عارضی طور پر ٹھہرایا جاتا اور پھر والٹن کے مہاجر کمیپ کی طرف روانہ کر دیا جاتا، ہم اپنی بڑی ہمشیرہ کے ہاں آگئے جو لاہور میں ہی آباد تھی۔ باقی چھوٹے بھائی، والد صاحب اور دادا جان اور دو بڑی بہنیں امرتسر میں ہی تھیں، یہ لوگ محض صندیا ضرورت سے زیادہ اعتماد کی وجہ سے وہاں سے نہیں بلے تھے، لیکن اب حالات بالکل پٹا کھا چکے تھے، مشرقی پنجاب سے کٹی ہوئی ریلیں آنا شروع ہو گئی تھیں، میں روز ریوے اسٹیشن پر آکر باقی گھر والوں کا پتہ کرتا، مشرقی پنجاب سے آنے والی ہر گاڑی دیکھتا، جو بھی ریل آتی اس میں سے مسلمانوں کی لاشیں نکلتیں۔ ڈبوں میں خون ہی خون ہوتا، فیروز پور سے ایک ٹرین آئی تو میں ایک خالی ڈبے میں چڑھ گیا، سیٹ کے نیچے کوئی شے پڑی تھی، میں نے اسے اٹھایا تو وہ کسی عورت کا کٹا ہوا

شہادت کی انگلی اور انگوٹھا غائب تھا ایک انگلی میں چاندی کی انگوٹھی تھی، ٹرلیاں مسلمانوں کی لاشوں سے بھر بھر کر شیشی سے باہر لے جاتی تھیں۔

میرے بعد ہمارے محلے پر کیا گوری وہ بھی سن لیجئے۔ تیرہ اگست کی رات کو ہمارے محلے پر ہندوؤں نے بے پناہ گولیاں چلائیں، ارد گرد کی ساری گلیوں کے مسلمان گھرانے ہماری گلی میں آگئے تھے، ہمارے بازار میں میرے ہم جماعت حامد بیٹ کا مکان تھا جو ہمارے مشہور بیکسر اور آرٹسٹ محمود بیٹ کے بڑے بھائی تھے۔ حامد بیٹ اونچا لمبا سرخ و سپید خوبصورت کشمیری نوجوان تھا، کرفیو لگا تھا۔ بس چک اٹھا کر بازار میں جھانکا ہی تھا گورکھ نے گولی چلا دی، گھر میں کیا کہرام مچا ہوگا، اس کا اندازہ ہر صاحب اولاد کر سکتا تھا۔ حامد بیٹ شہید ہو گیا، ہمارے محلے کا ایک اور کڑی جوان چھت پر گیا، وہ ننگے بدن تھا۔ صوفی دھوتی پہن رکھی تھی، برج پھولا سنگھ سے تھری ناٹ تھری کی گولی آئی اور اس کے سینے سے پار ہو گئی، وہ بھی شہید ہو گیا۔ حالانکہ ہر مسلمانوں کی مہاجر ٹرین امرتسر کے اسٹیشن پر آکر رکی۔ ایک نوجوان پیاس بجھانے سامنے پلیٹ فارم کے تلے پر جاتے لگا، اس کی ماں اور بہنوں نے ہاتھ جوڑے، واسطے ڈالے کہ خدا کے لئے نہ جاؤ، مگر دلیر نوجوان نہ رکا۔

”ایسا بھی کیا ہے، وہ سامنے تو پانی کا تل ہے پانی پی کر ابھی آجاتا ہوں“

اس نے ننگے پر جا کر پانی کا ایک گھونٹ ہی پیا تھا کہ کسی ہندو یا سکھ کی رائفل سے ٹکلی ہوئی گولی سناتی ہوئی آئی اور اس کی کھوپڑی کو توڑ کر نکل گئی، وہ اسی جگہ شہید ہو گیا۔ ماں اور بہنوں کے مین سے ریوے اسٹیشن کے درو دیوار مل گئے، وہ بین کرتی رہیں، ان کے بھائی کی ان کے بیٹے کی لاشیں سامنے پلیٹ فارم کے ننگے پر پڑی رہی اور گاڑی لاہور کی طرف چل دی۔

تیرہ اگست کی رات کی قیامت خیز فائرنگ نے ہمارے محلے والوں کے پاؤں اکھاڑ دیئے سوائے ہماری گلی کے سارے امرتسر شہر پر ہندو سکھ فوج کا قبضہ ہو چکا تھا۔ چودہ کی صبح گلی کے دروازے کو توڑ رہے تھے، لوگ گلی کی مشرقی جانب سے گوبروں کے وارے سے ہو کر سرکار روڈ پر آگئے، یہاں ان پر برج پھولا سنگھ کی طرف سے گولیاں چلنے لگیں، غلام محمد رفوگر کا لڑکا موسیٰ اپنے دو سال کے بیٹے کو سینے سے لگائے بد رو پار کر رہا تھا کہ گولی کھا کر بد رو میں نیچے کے ساتھ گرا اور پھر دونوں میں سے کوئی باہر نہ آسکا، ہماری گلی کے لوگ اپنے بچوں اور عورتوں کے ساتھ پاتھی گراؤنڈ میں سے شریف

کی طرف بھاگے جا رہے تھے، سکھ ان پر گولیاں برس رہے تھے، وہ گر رہے تھے، شہید ہو رہے تھے جو بچ گئے وہ شریف پورے پہنچ کر بے دم ہو کر گر پڑے شریف پورہ مہاجر کیمپ قرار دے دیا گیا تھا اور وہاں بوجرجمنٹ کا پہرہ تھا، بوجرجوان ان لوگوں کو فائرنگ کا کوردے رہے تھے مگر وہ بہت دور تھے، کسی نہ کسی طرح ہمارے گھر والے بھی بچ کر شریف پورے پہنچ گئے۔

پورے شہر پر سوائے شریف پورے کے ہندو سکھوں کا قبضہ تھا۔ شہر میں اگر کہیں کوئی اکا دکا مسلمان رہ گیا تھا تو وہ کیمپ میں آکر اپنے فرار کی حیرت انگیز کہانی سناتا، ایک نوجوان اتھی دروازے سے بدرو میں داخل ہوا اور چھپتا چھپاتا، بدرو کے اندر سے گزرتا شریف پورے پہنچ گیا، وہ کچھڑ میں لت پت تھا، اور سر اور منہ پر جالے لگے تھے، دروازہ وہاں سنگھ سے شاید آخری تانگہ کھانے عورتوں کو لے کر شریف پورے کی طرف آ رہا تھا کہ برج پھولا سنگھ سے سکھوں نے حملہ کر دیا اور وہ عورتیں اٹھا کر لے گئے۔ شریف پورے سے اسی وقت مسلمان جوان غضب ناک ہو کر باعلیٰ کے نعرے لگاتے نکلے اور دیوار پھاند کر دشمن کے قلعے میں داخل ہو گئے، کہتے ہیں تنگ سنگھ ان کی جرات دیکھ کر ہی ششدر رہ گئے۔ یہ جیلے جوان دونوں خواتین کو واپس لے آئے لیکن خود سخت زخمی حالت میں تھے۔ یہ آتش نمرود میں نہتے ہی کود پڑے تھے۔ گران کے جذبے کی سپائی انہیں سرخرو کر کے واپس کیمپ میں لے آئی۔ شریف پورے سے مہاجرین کو لے کر ٹوئیں پاکستان کی طرف روانہ ہونے لگیں ایک ریل میں بیٹھ کر کسی نہ کسی طرح ہمارے باقی گھر والے بھی لاہور پہنچ گئے۔

یہاں آکر ایک نئی زندگی، ایک نئی جدوجہد کا آغاز ہوا، یہ ایک الگ کہانی ہے، پاکستان کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ یہ کن سیاسی حوال کا نتیجہ ہے؟ امرتسر ہم سے کیوں چین گیا؟ اس پر بہت کچھ لوگوں نے لکھا ہے جو مجھ سے زیادہ سیاسی اور دینی بصیرت رکھتے ہیں اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ میں تو ایک افسانہ نگار ہوں، میں تو صرف اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ امرتسر کی ٹھنڈی کھوئی پر بیٹھا ہوا ہندو کنوئیں کا ٹھنڈا پانی مسلمانوں کو اوک میں پلاتا تھا اور ہندو سکھوں کو شیشے کے گلاسوں میں پلاتا تھا، شانتی سروپ میرا گہرا دوست تھا لیکن میں اس کے گھر کے باورچی خانے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ درشنی ڈیوڑھی والا سکھ غیر مسلموں کو تانبے کے گلاسوں میں اور مسلمانوں کو بانس کی نلکی سے پانی پلاتا تھا جس طرح جانوروں کو دوا پلائی جاتی ہے۔ شانتی سروپ نے مجھے بتایا تھا کہ اگر کبھی میں اس کے گھر میں چائے پی لوں تو

اس کی برہمن ماں میرے جھوٹے کپ کو توڑ دیا کرتی ہے کیونکہ میں مسلمان ہوں، پاکستان تو امرتسر کے محلے محلے میں بنا ہوا تھا، اس کے لئے کہاں کی سیاسی بصیرت اور کہاں کا تاریخی پس منظر؟ آپ آج کسی ہندو کے ساتھ اس کے گھر میں چوبیس گھنٹے بسر کریں، پچیسویں گھنٹے میں آپ اپنے آپ ایک پاکستان کی ضرورت محسوس کرنے لگیں گے۔ شانتی سروپ میرا بچپن کا دوست تھا، اس کی ماما نجد سے بہت سیار کرتی تھی لیکن ہمیشہ نجد سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہو کر، منہ پر کپڑا رکھ کر بات کیا کرتی تھی، کیونکہ میں مسلمان تھا۔ پاکستان بننے میں تو شانتی سروپ کی ماں کا بڑا گہرا ہاتھ ہے، اور اس سکھ کا بھی جو درشنی ڈیوڑھی میں مسلمانوں کو بانس کی نلکی سے پانی پلا کرتا تھا یہ لوگ آج بھی ویسے ہی ہیں، آج بھی پاکستان سے کوئی مسلمان ان کے پاس چلا جائے تو پرانے صندوق میں سے بانس کی نلکی نکال لیتے ہیں، آج بھی شانتی سروپ کی ماما آپ سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہو کر بات کرے گی۔ اس نے منہ پر کپڑا رکھا ہو گا جیسے آپ اچھوت ہوں۔

ان باتوں کو کہاں تک دہرایا جائے، پھر بھی اگست کے مہینے میں جب تیز دھوپ لگتی ہے اور تاریک بجلی ہوئی راتیں سنان ہو جاتی ہیں تو مجھے نعروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، آگ میں جلتی لاشوں کی بو آتی ہے۔ میں ان عورتوں کی چیخیں سنتا ہوں جنہیں جالندھر سے لاہور آتے قافلے میں سے اغوا کیا جا رہا ہے، میں اس عورت کے کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا ہوں جو فیروز پور سے لاہور آنیوالی ریل کے ڈبے میں پڑا تھا، اور جیسے میں نے اٹھا کر پھینک دیا تھا، کبھی اس ہاتھ نے کسی کا ہاتھ تھام کر ہمیشہ ساتھ نبھانے کا عہد کیا ہو گا کبھی اس ہاتھ نے اپنے معصوم بچے کا یا بھائی کا منہ دھلایا ہو گا، کبھی اس ہاتھ نے قرآن شریف جزدان میں لپیٹ کر چھپتی پر رکھا ہو گا، کبھی یہ ہاتھ دعا کے لئے بھی اٹھا ہو گا، کبھی یہ ہاتھ باپ کی انگلی پکڑ کر گھر سے باہر نکلا ہو گا، کبھی اس ہاتھ پر مہندی بھی لگی ہو گی۔ لیکن اب خون آلود خالی ڈبے کی سیٹ کے نیچے پڑا تھا۔ کوئی اس ہاتھ کو پکڑنے والا نہیں، کوئی ہاتھ اس ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے والا نہیں۔

الوداع! میرے خوبصورت ادا اس لوگو!

ایک بار پھر الوداع! ہزار بار الوداع!

کتنے حسین اور خوشبودار تھے تمہارے گلاب کے پھول!

امرتسر میں ۱۲ اگست

ایک نیم سرکاری ثقافتی ادارے میں چودہ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریب منائی جا رہی تھی۔ چودہ اگست کی یادوں کو تازہ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ لاہور شہر کی سب سے جنگلی، سب سے سہوار اور سب سے خوبصورت سڑک کی اٹھ منزلہ عمارت کی چھٹی منزل کے ایگزیکٹو ڈسٹریکٹ میں فوم کے گدوں والی آرام کرسیاں سجی تھیں۔ ڈانس پر میز رکھی تھی جس پر شیشے کے چمکیلے جگ میں ٹھنڈا پانی تھا اور گلدان میں کارنیشن کے زرد پھول سجے تھے۔ بیل باٹم پاجاموں، آدم جی کی ٹوٹوں، سمارٹل کے پرنٹوں، کموپیٹر کا جمل اور جیولری کے چمکتے ہیرن اور ٹیڑھوں کے سوٹوں، امریکی کونوٹوں، اطالوی سینٹوں اور فرنیچر پر فیومز کا ہجوم تھا۔ ٹائیوں کی کسی ہوئی گزریں ہارڈ کالروں میں پھنسی ہوئی گزریں، جبروں تک آئی ہوئی بالوں کی قلمیں، انگلش پونڈز کے دھتے ہوئے کف لکس اور بال میں رچی ہوئی فریش ایئر کی رومانٹک جہک — دبی دبی سرگوشیاں۔ پروٹوکول کے تفکعات، دی آئی بیز کے ٹھنڈے بے جس چہرے اور پی آئی اے کے نم دار ٹھنڈے کانڈول سے پیشانیاں پونچھتی بیگمات اور ان کی حارزہ لیتی بے باک نگاہیں — اب گیسٹ آف آنر تشریف لارہے تھے۔

میں جس کرسی پر بیٹھا تھا وہ میرے قریب سے گزرے — ان کے امریکی ٹیڑھوں کے سوٹ سے یوڈی کون کی خوشبو آرہی تھی۔ وہ کرسی صدارت پر تشریف فرما ہوئے۔ تالیاں سیکرٹری صاحب نے تقریب کی مختصر عرض و غایت بتائی۔ چودہ اگست کو دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ ایک بیل باٹم نے بالوں کو جھٹک کر سات سو روپے کی ساڑھی سے پوچھا، "مئی، چودہ اگست کو یہاں تھی؟"

ساڑھی نے لگے کانیکس درست کرتے ہوئے کہا: "بے بی اتم تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں؟"

بیل باٹم نے جیونگ گم دوسرے جہڑے میں گھا کر پوچھا: "مئی، تم کہاں تھیں؟"

ساڑھی نے ہونٹوں کے ریڈائڈین کمر پر آیا ہوا پسینہ ٹھنڈے نشوونیر سے پونچھتے ہوئے کہا: "ویل بے بی آئی تھینک، مئی ان دنوں یو کے میں تھی۔"

خواتین و حضرات! آج چودہ اگست ہے۔ اس روز ہم نے ہندو سامراج کو شکست دیکر اپنے قائد اعظم کی قیادت میں پاکستان حاصل کیا تھا آج کا دن ہماری بہتری کا بڑا اہم دن ہے۔ خواتین و حضرات! مقرر تے ٹھنڈے پانی کے دو گھونٹ پیے۔ ماتھے پر آیا ہوا پسینہ خوشنور سفید رومال سے پونچھا۔ سیاہ چشمہ درست کیا اور ذرا کھٹکار کر دوبارہ تقریر شروع کر دی — ایک سیولیس لڑکی نے اپنا گلوگو چشمہ اتارتے ہوئے دوسری لڑکی سے پوچھا۔

دوسری لڑکی نے کمر کے گرد کسی ہوئی سنہری زنجیر کو اور کستے ہوئے پوچھا۔

(تمہارا مطلب کیا ہے؟)

پہلی لڑکی نے ہونٹ بھینچے۔ ہنسنے اور اٹھائیں اور گردن کو جھٹک کر کہا۔

(میرا مطلب ہے، موسیقی اور قص)

خواتین و حضرات! چودہ اگست ہمیں ہمیشہ یاد دلانا رہے گا کہ ہم نے پاکستان لاکھوں مسلمان بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا۔ ہم آگ اور خون کا دریا عبور کر کے یہاں آئے تھے۔

مقرر نے جھک کر سیکرٹری کے کان میں کچھ کہا۔ سیکرٹری صاحب نے دوسرے کے کان میں کھڑپٹری کی۔ دوسرے کے ہونٹ تیسرے کے کان کے پاس گئے اور اسی نے فوراً جیب سے ڈائری نکال کر مقرر کی تقریر کے اقتباس لینے شروع کر دیے۔ اب صاحب صدر کی بائیں تھی۔ سیکرٹری صاحب دس منٹ تک صاحب صدر کی سوشل حیثیت، ان کی علمی قابلیت، ان کے تمغائے امتیاز، ان کے ورلڈ ٹور اور ان کی خوش خلقی کے بارے میں رطب اللسان رہے۔ صاحب صدر تالیوں کی گونج میں اٹھے۔ ٹائی کر گرہ ٹھیک کی۔ مائیک کا متہ اپنی طرف کیا۔ ذرا کھٹکارے۔ ذرا مسکرائے اور پھر سنجیدہ ہو کر فرمایا: "خواتین و حضرات! اسی کے ساتھ ہی پریس فوٹو گزرتی"

کے فلیش چمک اُٹھے۔ ٹیلی ویژن کی تیز روشنیاں اور ٹی وی اور انفارمیشن کے کیمرے اُن ہو گئے۔ بیل بائٹوں نے سانس روک کر پوز بنالیا۔ ساڑھیوں نے منہ مٹی ہوئی بھوس ترچھی کر لیں۔ فوٹو گرافر گھوم گھوم کر صاحب صدر اور خواتین و حضرات کی مختلف تصویریں لینے لگے اور ریڈیو کا نمائندہ ریکارڈر کی ٹیپ اُن کر کے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

اور پھر میں نے چودہ اگست کے یوم کو دیکھا۔ اس کے بالوں میں خاک پڑی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنسی تھیں، زخمی پیر سو جے ہوئے تھے، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کٹ چکی تھیں اور نصف کٹی گردن سے خون کے خوارے اُبل رہے تھے۔ اس نے شیخ پر کھڑے ہو کر خواتین و حضرات کو دہشت زدہ، پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا اور پھر شیخ سے نیچے گر کر شہید ہو گیا۔ اس کی ویران آنکھوں میں پاکستان سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا اور اس کی بچی اس کی لاش پر بیٹھی اپنے ابو کو رو کر آوازیں دے رہی تھی اور پھر ایک سکھ کی تلوار نے اس بچی کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور پھر گہرا سناٹا چھا گیا۔ موت اور دہشت کا سناٹا۔ فلش بلب جلتے رہے۔ ٹی وی کی روشنیاں چمکتی رہیں صاحب صدر ٹائی کی ناٹ بار بار درست کر کے تقریر کرتے رہے۔ پریس والے نوٹس لیتے رہے۔ خواتین و حضرات ایر کنڈیشنڈ ہال کی خوشبودار فضا میں بیٹھے دیواروں پر بنی ہوئی ریپٹر ایکٹ تصویروں کو دیکھ دیکھ کر بدھتے رہے۔ کسی نے چودہ اگست کی خون آلود لاش کو شیخ سے گر کر شہید ہوتے نہ دیکھا۔ کسی نے اس کی معصوم بچی کے پھول جیسے جسم کو سکھ کی تلوار سے دو ٹکڑے ہوتے نہ دیکھا۔ کسی نے اس کی پُر اذیت آخری چیخ نہ سنی۔ کسی نے اس کی چیخ کے بعد کا سناٹا محسوس نہ کیا۔

”خواتین و حضرات! خواتین و حضرات!“

میں نے چودہ اگست کو آج بائیس سال کے بعد بھی دیکھا ہے اور کل بائیس برس پہلے بھی دیکھا تھا۔ گل ہم نے اسے بے کسی کے عالم میں بے کفن، لحد میں اتارا تھا اور آج ہم نے اس کی قبر پر دس دس منزلہ عشرت گاہیں تعمیر کی ہیں جن کی نیم تاریک رقص گاہوں میں یورپی موسیقی کی دھن پر عریاں بدن تھرکتے ہیں اور ایر کنڈیشنڈ باروں میں بادۂ تاب کے جام چھلکتے ہیں۔ چودہ اگست شہید ہو گیا۔ پاکستان کے نام پر، اسلام کے نام پر شہید ہو گیا اور ہم نے اس شہید کی مقدس قبر کو فروخت کر دیا۔ اپنی رقص گاہوں اور عشرت کدوں کے عوامن فروخت کر دیا۔ ہم نے اس کی یاد

میں قطب مینار سے بھی اونچے یادگار مینار بنائے اور خود اس کی سرٹھیوں میں انیم کی پینک میں گر کر دم توڑ دیا۔ ہم نے چودہ اگست کی بڈیوں کو اٹھا کر ایر کنڈیشنڈ ثقافتی اداروں کے سپرد کر دیا۔ جہاں انہیں ڈیکوریشن بیس بنا کر دیواروں پر سجا دیا گیا۔۔۔۔۔

چودہ اگست نے کفر کی اندھیری رات میں برہمنی سمندر کے خونیں طوفان سے نکال کر برصغیر کے مسلمانوں کو ساحلِ پاکستان تک پہنچایا، لیکن ہم نے ساحلِ مراد پر پہنچنے کے بعد اس لاسٹ ہاؤس کی روشنیاں گل کر دیں۔ ہم نے اپنے جہازوں میں آگ تو لگا دی، لیکن ہسپانیہ فتح نہ کر سکے۔ ہم چودہ اگست کی لاش سے گور کر آ رہے ہیں اور اس کی بے گور و کفن لاش کے پاس اس کی بچی کی لاش کے ٹکڑے بھی بکھرے پڑے ہیں اور آسمان پر ابھی تک گدھیں منڈلا رہی ہیں۔۔۔۔۔

چودہ اگست کے مقدس شہید کے گل رنگ خون کی لکیر میرے قریب سے ہو کر گزرنے لگی ہے اور میں اس ثقافتی ادارے کے مال میں بیٹھا اس خون کی لکیر کے ساتھ ساتھ ماضی کے دھندلے جنگوں میں نکل آیا ہوں۔ اس جنگ میں کوئی درخت نہیں، درختوں پر کوئی شاخ نہیں، شاخوں پر کوئی پھول نہیں۔۔۔۔۔ یہ کیسا جنگل ہے! خواتین و حضرات! یہ کیسا جنگل ہے۔۔۔۔۔

اس جنگ میں ایک دریا بہتا تھا۔ اس دریا کے کنارے اگست کی بارشوں میں مسلمان مہاجرین کا ایک قافلہ آکر رکتا ہے۔ یہ لوگ دیارِ ظلم سے دیارِ امن کی جانب ہجرت کر رہے ہیں۔ تنگے مارے بے کس و بے بس، دہشت زدہ، حیرت زدہ، پاکستان چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ چالیس میل چالیس ہزار میل ہو گئے ہیں۔ دریا کا نام بیاس ہے۔ برسات میں دریا میں سیلاب آیا ہوا ہے۔ مشرقی پنجاب کے حسین شہروں، قصبوں، دیہاتوں، شہروں کے گلی کوچوں، گلیوں کے پرانے مکانوں کی پر اسرار نیم روشنی ڈیوڑھیوں اور ڈیوڑھیوں کی صدیوں پرانی دھیزوں سے نکالے ہوئے مسلمان بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں کا ایک ہجوم ہے۔

اچانک ایک طرف سے حملہ ہوتا ہے۔ گولیاں، برچھے، گریبانیں، اسکیم، دیہاتی ریکہ اکی لکھ ہندو، مسلمانوں کے ازل دشمن ہندو۔ ہر طرف شور غل، چیخ پکار ہے۔ جہا جہا شہید ہو رہے ہیں، قتل ہو رہے ہیں، زخمی ہو کر تڑپ رہے ہیں، جو مقابلہ کرتا ہے وہ بھی شہید ہو جاتا ہے جو مقابلہ نہیں کرتا وہ بھی شہید ہو جاتا ہے۔ بچہ ماں کو پکار رہا ہے۔ ماں بیٹی کو آوازیں دے رہی ہے

قانون بیوی کو بچاتے ہوئے قتل ہو رہا ہے۔ بیوی غاوند کی اکبر پر قربان ہو رہی ہے۔ ایک عورت اپنے بچے کو لے کر کھیتوں کی طرف بھاگتی ہے۔ دو سکھ تواریں لہراتے اس کے پیچھے لپکتے ہیں۔ بچہ ماں کی گود سے چھین کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے۔ ماں بے ہوش ہو جاتی ہے اور سکھ بے ہوش ماں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ اب وہ مر جائے گی۔ رضیہ، ثریا اور تاج بی بی کی حیثیت سے مر جائے گی۔ اب وہ کسی معراج دین، کرم داد اور جمال خان کو جیم نہیں دے گی۔ اب اس کا نام ہر گوبند کور ہوگا اور اس کے بچوں کا نام درشن سنگھ اور پریتم کور۔۔۔۔۔

”خواتین و حضرات۔۔۔ میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ قوم کی خدمت کو میں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا ہے اور میں اپنے فرائض کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔ مثلاً میں آج رات کوٹلی ویرن پر اپنی آج کی صدارتی تقریب کا پروگرام بڑے شوق سے دیکھوں گا اور۔۔۔ اور رات کو ریڈیو نیوز ریل پر اپنی آواز بھی سنوں گا اور صبح اخباروں میں اپنی تصویریں بھی ضرور دیکھوں گا۔“

خواتین و حضرات! چودہ اگست کا دن ہمیں یہی سبق سکھاتا ہے کہ۔۔۔۔۔

صاحب مدرجنگ کر سیکرٹری کے کان میں کچھ کہتا ہے سیکرٹری دوسرے آدمی کے کان میں کچھ کہتا ہے اور وہ فوراً ٹھنڈے پانی کا نیا بلوری جگ لاکر میز پر رکھ دیتا ہے۔ چمکیلے جگ میں ریفریجریٹر کی بوتلوں سے نکال ہوا اشفاق پانی چمک رہا ہے۔ اور گلدان کے زرد کارٹیشن پھولوں پر اُس کا عکس بھر بھر رہا ہے اور میں دریائے بیاس کے گدے، مٹیالے خونیں، سیلابی ہٹائیں مارتے پانیوں کی طرف ایک کنواری مسلمان مہاجر لڑکی گونگے سر، تنگے پاؤں بھاگتے دیکھ رہا ہوں ایک ہندو تلوار لیے اس کے پیچھے دوڑتا چلا آ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون ہے۔ زندگی سے۔۔۔ بربریت ہے۔۔۔ مسلمان لڑکی کے کپڑے تار تار ہیں۔ وہ اپنی عزت بچانے کے لیے دریا کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔ پاکستان کی طرف بھاگی جا رہی ہے اور دیکھتے دیکھتے وہ دریا میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔ ایک بھنورا بھرتا ہے اور پھر دریا کی کف اڑاتی لہریں اس پاکباز مسلمان لڑکی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی گرائیوں میں گم کر لیتی ہیں۔ پہنچ گئی اپنے پاکستان۔۔۔ ہندو نفرت سے قہقہہ لگا کر چیختا ہے۔۔۔۔۔

دریا کی لحد نے سید بن کر مسلمان مہاجر لڑکی کے ناموس کا موتی کو اپنے سینے میں چھپالیا ہے۔ ۱۳۔ اگست، ۱۹۴۷ کو میں پنجاب میل میں سوار دلی سے امرتسر آ رہا ہوں، شہروں، قصبوں اور دیہاتوں پر وحشت و دیرانی کی مہریں لگی ہیں۔ گاڑی چھوٹے چھوٹے شہروں کے ریلوے پلوں اور پھاٹکوں سے گزرتی ہے تو ٹیڑھی میڑھی سرٹکیں سنان نظر آتی ہیں۔ مکانوں کی منڈیروں پر گدھیں بیٹھی ہیں۔ گاڑی پنجاب میں داخل ہوتی ہے تو اس دیرانی اور وحشت زدگی کی فضا میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ کسی کھیت میں بل نہیں چل رہا۔ کچے مکانوں پر موت کے بھیانک سائے منڈلا رہے ہیں۔ لدھیانہ، اچھواڑہ اور جالندھر کے پلیٹ فارموں پر سفید برقع پوش مسلمان عورتوں اور بچوں اور پریشان حال مردوں کے ہجوم سہمے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ہندو اور سکھ تنگی تواریں لیے دندنا تے پھر رہے ہیں۔۔۔۔۔

گاڑی امرتسر شہر کے مضافات میں داخل ہو رہی ہے مانا نوالہ سٹیشن گزر گیا ہے۔ اب دائیں جانب چالیس کھوکھور رہے ہیں۔ بڑی نہر نیم سرخ برساتی پانی سے لبالب بھری ہے، مگر وہاں مسلمان امرتسر کی نوجوان قورن کے دیگے چڑھاٹے، اُموں کے ٹوکے نہر میں لٹکائے، نہر میں چھلانگیں لگا کہیں نظر نہیں آ رہے۔ اب بٹالہ اور پٹھانکوٹ کو جاتی ریلوے لائن میں لائن سے اکن ملی ہے۔ شریف پورے کے امرودوں، ناشپاتیوں، لوکاٹوں اور انچوں کے باغ اُڑے ہوئے ہیں۔ شریف پورے کے مکانوں کی چھتوں پر کھڑے مسلمان ”پاکستان زندہ باد“ کے فلک شکاف نعرے لگا رہے ہیں۔ مسلم مائی سکول اور بھائیوں والے باغ کاریلوے پھاٹک بھی دیران ہے۔ دور بھائیوں والی نہر کی سرخ اینٹوں والی پیا ایک پل کے لیے دکھائی دے کر پیچھے گزر جاتی ہے۔ گرمیوں کی مدھپروں میں ہم سکول سے بھاگ کر اس نہر پر نہانے آیا کرتے تھے۔ ساری دوپہر پلایا پر سے مٹھیاں چم چم کر نہر میں چھلانگیں لگاتے گزر جاتی۔ پھر ہم امرودوں کے باغوں میں گھس جاتے اور کچے کچے امرود توڑ توڑ کر کھاتے۔۔۔۔۔

نہر گزر گئی۔ یہ اس نہر کی آخری جھلک تھی۔ اس کے بعد پھر اس نہر میں نہانا نصیب نہ ہوا کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ کسی تیز دھوپ والی دوپہر کو، بغل میں کتابوں کا چھوٹا سا بسکٹ لٹکا کر لاہور سے نکلوں اور سیدھا اس نہر کی پلایا پر جا کر مٹھیاں چم کر چھلانگ لگا دوں اور پھر کبھی سر باہر نہ نکالوں۔۔۔ مگر یہ جیت پسند خیال ہے۔ شکست خوردگی کے احساس کا پر تو ہے۔ یہیں نوزندگی کی دوڑ میں آگے ہی آگے

بڑھنا ہے۔ پرانی نہر ہم سے چھٹ گئی ہے تو نئی نہر یہی پہاڑوں سے کاٹ کر لانی ہیں۔ خسرو پرویز کے لیے نہیں، اپنی شیریں کے لیے مستقبل کی درختانی کے لیے۔۔۔۔۔

پنجاب میل کمپنی باغ والے پھانک سے گزرتی ہے! اُنیں جانب عید گاہ کا تالاب نظر آتا ہے۔ جامن کے درخت کالی کالی موٹی جامنوں سے لدے ہوئے ہیں، لیکن لڑکوں کی ٹولیاں غائب ہیں۔ پنجاب میل امرتسر کے شیش میں داخل ہوتی ہے۔ تینویلیٹ فارمیں پر مسلمان عورتوں اور بچوں کے ہجوم ہیں۔ یہ لوگ دائم گچ اور تکی گھر کی مسلمان آبادی ہے، جو کسی طرح یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ اچانک سیتلا مندر کی جانب سے ان مسلمانوں پر فائرنگ شروع ہو جاتی ہے۔ ایک عورت کی پیچ بند ہوتی ہے۔ عورتوں کی آہ دہکا اور بچوں کی چیخ پکار سے وہاں کھرام مچ جاتا ہے۔ امرتسر شہر میں کرفیو لگنے میں صرف بیس منٹ باقی ہیں۔ شیش پر مجھے میرا ایک دوست مل جاتا ہے۔ ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ ساری رات پلیٹ فارم پر گزارنے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے اپنے محلوں میں جانے کا خطرہ مول لے لیں۔ ہم شیش سے باہر نکلتے ہیں۔ جاٹ اور گورکھا سپاہی وہاں سڑک پر گھوم رہے ہیں۔ ہم سیرھیوں والے پل سے اترتے ہیں تو ایک مکان کی کھڑکی کھلتی ہے اور ایک گردن نمودار ہو کر کہتی ہے: "اوٹے منڈیو! جیتی کرو اوٹے۔ کرفیو لگن والا ہے۔۔۔۔۔"

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے، گول باغ کے پہلو سے ہو کر ایم اے او کالج کے عقب میں آتے ہیں تو کرفیو کا ہڑمڑ چینے لگتا ہے۔ میرے دوست کا مکان اسی محلے میں تھا۔ میں بھاگ کر اپنے دوست کے مکان میں گھس جاتا ہوں۔ امرتسر میں ہر طرف آگ لگی ہے۔ ہندو سکھوں کے محلوں سے مسلم محلوں پر مسلسل فائرنگ کی جا رہی ہے۔ امرتسر کے مسلمان سپاہیوں سے اہلخانہ لے لیا گیا ہے۔ شہر میں بہت مٹھوڑی گورافوج ہے باقی ساری فوج ہندو ڈوگرہ اور گورکھا سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ صرف ریلوے شیش اور شریف پور سے میں بلوچ رجمنٹ کے جوان امرتسر کے نہتے اور دشمنوں میں گھرے ہوئے مسلمانوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔۔۔۔۔

میرے دوست کے مکان کے آگے ہندوؤں کی آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ ادھر سے مسلسل فائرنگ ہو رہی ہے، ہم چل رہے ہیں۔ اس کشمکش میں محلے کی ساری عورتیں اور بچے جمع ہیں۔ عورتوں کے رنگ زرد ہیں اور بچے دہشت سے کھلا گئے ہیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں

کہ اگلے لمحے کیا ہوگا۔ ایک نوجوان لڑکی کی ٹانگ میں گولی لگی ہے۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں چارپائی پر پڑی کراہ رہی ہے۔ ساتھ والی گلی میں گوجر کے مکان میں ایک بوڑھے مسلمان کی لاش پڑی ہے مگر وہاں کون جائے!

زندوں کا سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے مردوں کو کون سنبھالے!

رات کے نو بجے اچانک بجلی فیل ہو جاتی ہے۔ ہر طرف گھٹپ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ گلیوں اور محلوں کے دھماکے بڑھ جاتے ہیں۔ مکان میں عورتیں اور بچے اونچی آواز میں انہیں ڈانٹتے ہیں۔ "چپ رہو۔ جب تک ہم زندہ ہیں۔ تمہاری ہوا بھی کوئی کافر نہیں دیکھ سکتا۔۔۔"

اگلے روز صبح نو بجے کرفیو کھلتا ہے۔ میں اپنے محلے کی طرف بھاگتا ہوں۔ امرتسر کی فضا یکسر بدل گئی ہے۔ مسلم آبادی اپنے اپنے گلی کوچوں میں قید ہو کر رہ گئی ہے اور شہر پر ہندو سکھ فوج نے قبضہ کر لیا ہے۔ ہال بازار ویران ہے مسلمانوں کی دکانیں ٹوٹی پڑی ہیں۔ میں گلیوں گلیوں ہوتا بجلی والے چوک میں جا نکلتا ہوں۔ دُور سے ایک گورکھا فوجی مجھے دیکھ کر آگے بڑھتا ہے۔ میں لپک کر دوسری گلی میں گھس جاتا ہوں۔ اگرچہ کرفیو کھلا ہے لیکن جو بھی مسلمان اپنے محلے سے باہر نکلتا ہے۔ اسے گولی مار دی جاتی ہے۔ میں چھپتا چھپاتا اپنی گلی میں جا نکلتا ہوں۔ پکائی گلی، گلی، گلی، گلی اور گلی غزنی کے سارے مسلمان اٹھ کر ہماری گلی میں آگئے ہیں۔ گلی رنگریزوں کی مسجد میں مسلمان عورتوں کو بے دریغ شہید کر دیا گیا اور بچوں کو چھتوں پر سے بجلی کے تاروں پر اٹھال دیا گیا۔ یہ لوگ بڑی مشکل سے جانیں بچا کر پہنچے ہیں۔

"بازار بکرواناں میں مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا اور سکھیوں نے ہندو فوجیوں کی زیر نگرانی ایک ایک کر کے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ جو لڑکا سب سے اخیر میں کھڑا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو گردنیں کٹتے دیکھیں تو چپکے سے کھسک کر جناب ماسٹر اٹھ بخش مرحوم کے مکان والے کنوئیں میں کسی نہ کسی طرح لٹکا رہا۔ اگلے روز بلوچ رجمنٹ کا ایک ٹرک مسلمانوں کو وہاں سے نکالنے آیا تو اس نے کنوئیں میں چلنا شروع کر دیا۔ اس لیے نیم جاں حالت میں ٹرک میں ڈال کر شریف پورہ کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔"

گھر والے میری زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ مجھے دیکھا تو جان میں جان آئی، لیکن سوال

یہ تھا کہ گلی میں سے نکل کر شریف پورہ کیمپ کیسے پہنچا جائے؟ چودہ اگست کی رات آگئی۔ اس رات امرتسر میں جتنی گولی چلی، کہتے ہیں سارے فسادات میں اتنی گولی نہیں چلی تھی۔ ایک ایک سیکنڈ کے وقفے کے بعد تھری ناٹ تھری کا فائر ہو رہا تھا۔ دستی بموں کے دھماکوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ مسلمانوں کی لاشیں ہندو سکھوں کے گلی کوچوں میں بے گور و کفن بکھری پڑی تھیں۔ فضا میں بارود، جلی ہوئی لاشوں مٹی اور تارپین کے تیل کی تیز بو جچی ہوئی تھی۔ بوڑھے رمزی سار کا جوان بیٹا سکھوں نے شہید کر دیا تھا۔ وہ چوک پر اگلاس کی مسجد میں جمعے کی نماز پڑھنے گیا اور وہیں مسجد کے صحن میں شہید ہو گیا۔ بڈھا باپ اپنے بیٹے کی لاش بھی نہ دیکھ سکا۔ وہ گلی والے نلکے کے پاس چارپائی پر بیٹھا اپنے جوان بیٹے کے غم کو سینے سے لگاٹے روتا رہا۔ چودہ اگست کی رات کو گولیوں، بموں اور عورتوں بچوں کی چیخ پکار میں وہ بار بار روتے ہوئے یہی کہتا: جو مر گئے وہ اچھے رہے میرے مولا!

رات کے تین بجے فائرنگ کی آوازیں تیز ہو گئیں اور ہندو سکھوں کے نعرے زیادہ قریب سنائی دینے لگے۔ پو پھٹے گولیاں ہمارے مکانوں کی چھتوں اور مٹیوں سے ٹکرانے لگیں۔ لوگ پریشان ہو گئے۔ دن چڑھتے ہی گورکھا اور سکھ فوجیوں نے ہماری گلی کے آہنی دروازے پر بم مارا۔ ایک زور دار دھماکا ہوا اور دروازہ ایک طرف کو پھٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی گلی میں بھگدڑ مچ گئی۔ عورتیں ہودے بچے اور بوڑھے سبھی گلی کے دوسرے تنگ دروازے میں سے نکل کر شریف پورے کی طرف بھاگنے لگے۔ اب گلی کے سرے پر مکانوں آگ لگا دی گئی اور سکھوں کے نعرے بلند ہوئے۔ سکھ اور ہندو غنڈے فوج کی مدد سے گلی میں داخل ہو گئے تھے اور انہوں نے قتل عام اور لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ میں نے گلی میں بھاگتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ دو سکھ تعاروں سے بوڑھے رمزی پر وار کر رہے تھے اور وہ دونوں کمزور ہاتھ اٹھا اٹھا کر ان کے واروں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھ سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ میری والدہ، بہنیں، بھائی، سب کی والدائیں، بہنیں اور بھائی بے بسی کے عالم میں شریف پورے کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ راستے میں جی ٹی روڈ پر ٹپتی تھی۔ یہاں سے ان مسلمانوں پر ایک سکھ فوجی ٹرک سے فائرنگ ہوئی۔ موسیٰ، شال مرچٹ اپنے بچے کو گود میں اٹھائے بھاگا جا رہا تھا کہ گولیوں کی بوچھاڑ اس پر پڑی۔ وہ اپنے معصوم بچے سمیت شہید ہو کر سڑک پر گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔

شریف پورے کی جانب سے بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے جوابی فائرنگ شروع کر دی اگر بلوچ جوان سکھ فوجیوں کے ٹرک پر فائرنگ نہ کھولتے تو شاید ہی ہماری گلی کا کوئی مسلمان زندہ بچتا شریف پورے نے کیمپ کی شکل اختیار کر لی۔ چونکہ یہ مسلم آبادی تھی۔ اس لیے اسے کیمپ میں تبدیل کر دیا گیا اور باہر جی ٹی روڈ کی طرف بلوچ رجمنٹ نے پوزیشن سنبھال لی۔ اس رجمنٹ کے جوانوں کو اب امرتسر شہر میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ شہر پر ہندو سکھوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ امرتسر شہر کے گلی کوچوں، حویلیوں اور مکانوں میں سوائے مسلمانوں کی لاشوں اور بکھرے ہوئے سامان کے اور کچھ نہ تھا۔ مسلمانوں کے مکان جل رہے تھے۔ امرتسر کے بہادر جیالوں کی لاشوں کو خاک خون میں تڑپانے کے بعد یہ شہر آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔۔۔۔

مسلمان امرتسر جل رہا تھا۔۔۔۔

مسجدوں، مکانوں کے دیوان خانوں، چھتوں، مٹیوں، سیرٹھیوں اور آنگنوں میں مسلمان عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کی خاک و خون میں اٹی ہوئی لاشوں کے ساتھ جل رہا تھا۔ ان میں حامد بٹ بھی تھا۔ اونچا لمبا، گورا چٹا کشمیری نوجوان اور باکی کا بہترین کھلاڑی۔ اپنے جانثار چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کا لاڈلا بھائی اور میرا دوست۔ بہترین دوست۔ ان میں مولوی طاہر شاہ بھی تھا۔ پابند صوم و صلوة، نیکدل، اسلام کے نام پر ہی شہید ہو گیا۔ ان میں اس ایف اے پاس لڑکی کی لاش بھی تھی، جس کو سکھ اور ہندو غنڈے اٹھا کر رام تلانی کے مندر میں لے گئے تھے اور جہاں اس نے مندر کی سب سے اونچی چھت پر سے چھلانگ لگا کر اپنی جان اور ابرو پاکستان کی عزت و آبرو پر قربان کر دی تھی۔۔۔۔

ان میں کئی حامد بٹ، کئی طاہر شاہ، کئی بوڑھے رمزی اور کئی عفت ماب بہنیں، بیٹیاں اور مائیں تھیں، ان کی خون آلود نعشیں تھیں۔ ان کے معصوم بچوں، بھائیوں، بہنوں اور بیٹوں کی نعشیں تھیں۔ اپنے دامن میں ہمارے یہ گوبر بائے گراں مایہ لیے امرتسر جل رہا تھا۔ مسلمان امرتسر مسلمان جالندھر اور مسلمان لدھیانہ، فیروز پور، ہوشیار پور اور روہتک و حصار، جوں و کشمیر جل رہا تھا اور ہجرت کرتے والے بے یار و مددگار مہاجروں کے قافلے لٹتے، کھٹتے ہگاڑیوں میں، ٹرکوں میں ٹرینوں میں، پاپیادہ پاکستان کی طرف، دیارِ اسلام کی طرف، دیارِ امن و انصاف کی طرف بڑھتے

چلے آ رہے تھے۔۔۔

شریف پور سے ریفیو جی ٹرینیں پاکستان کی طرف چلنے لگیں۔ چھتوں تک بھری ہوئی ٹرینیں،
لٹے پٹے زخمی، غم زدہ، پریشان حال، خستہ جاں مسلمان مہاجرین سے لدی ہوئی ٹرینیں جنہوں نے اپنی مائیں
بہنیں، بچے، بیٹے، باپ جان اور مال۔ سبھی کچھ پاکستان کے نام پر، اسلام کے نام پر قربان کر
دیا تھا۔ جن کے گریبان تار تار تھے۔ مگر خون خون تھے، مگر دل پاکستان کی محبت سے بھر پور تھے۔
چھ ہرٹھ سٹیشن پر سکھ ڈرامیور نے گاڑی آہستہ کر دی۔ گردوارے کی طرف سے اکالی سکھوں نے
گاڑی پر حملہ کر دیا۔ بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے مشین گنوں کا فائر کھول دیا۔ طاہر ہے حملہ آور سکھوں
کو بھاگنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ گاڑی ایک بار پھر پاکستان کی طرف رینگنے لگی۔ خاصہ سٹیشن گزر گیا
تو یہی نے کھڑکی کا ذرا سا پٹ اوپر اٹھا کر باہر دیکھا۔ جھاڑیوں میں ادھر ادھر جا بجا ان مسلمان بچھانوں
کی لاشیں بکھری پڑی تھیں جو ایک روز پہلے شریف پور سے اپنے گدھے لے کر پیدل ہی چل پڑے
تھے اور لوگوں کے منہ کرنے کے باوجود نہیں رُکے تھے۔ ان بہادر اور غیور بچھانوں نے پاکستان
سے بیس میل دور شہادت پائی۔۔۔۔۔

والگہ سٹیشن پر دور رہی سے پاکستان کا سبز ہلالی پرچم دھوپ میں لہراتا نظر آیا تو ٹرین میں زندگیا لہر
دوڑ گئی۔ فضا غرہ تکبر اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔۔۔۔۔
”ہمارے ڈبے میں ایک زخمی بوڑھے کسان نے منہ اٹھا کر پوچھا کیا پاکستان آگیا؟ کسی نے کہا۔
ہاں بابا جی پاکستان آگیا۔ وہ دیکھو پاکستان کا جھنڈا۔“

”بوڑھے کسان نے گردن ذرا سی اٹھا کر کھڑکی میں سے باہر سبز ہلالی پرچم دیکھا۔ اس کے خستہ حال
نیم مرزہ چہرے پر ایک چمک سی آئی، اس نے کلہا پیٹہ پرٹھا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ شہید ہو گیا۔ پاکستان زندہ باد
بوڑھا کسان۔ زندہ باد، حامد بیٹ زندہ باد، بوڑھا مری زندہ باد، طاہر شاہ زندہ باد مسلمانوں کا امرتسر زندہ باد چوک
فرید زندہ باد، چوک پر اگداس کی مسجد زندہ باد دیانے بیاس کی لہروں میں سوئی ہوئی بہن زندہ باد رام تللی کے
مندر سے پھلانگ لگا کر شہید ہونے والی بیٹی زندہ باد! چودہ اگست زندہ باد!

خواتین و حضرات! خواتین و حضرات!۔۔۔۔۔

امرتسر کا جلیا نوالہ باغ

سماوار میں سبز چائے جوش کھانے لگی۔

کشمیری چائے کی لطیف بھاپ نے کارنس پر رکھے گلاب کے پھولوں کی خوشبو
سے مل کر کمرے کو مہکا دیا۔ ریکمانہ ٹیلی پتی دار جا پانی پیالیوں میں چائے ڈالنے لگی اور میں
نے پائپ سلگالیا۔ اب کمرے کی فضا میں ایک تیسری خوشبو نے جنم لیا۔ کشمیری چائے، گلاب
کے پھول اور ایرن مور تمباکو کے فلیور کا ملاپ۔ یہ تھی تیسری خوشبو۔ امرتسر کی خوشبو۔ کہنی باغ
کے بارش میں بھگتے اور گرم دوپروں میں بڑی نہر کے کنارے اُگے ہوئے مرطوب گھاس
اور رات کے پچھلے پیر امرتسر کی کسی لگی سے ڈولی میں سوار ہو کر رخصت ہوتی دلہن کی خوشبو
امرتسر اس وقت میری سبز چائے کی پیالی میں تھا۔ گلاب کی پنکھڑیوں میں تھا اور میرے
پائپ کے فلیور میں تھا اور میرے سامنے بیٹھے ہوئے والد صاحب کی سمٹی ہوئی آنکھوں
میں تھا۔

ابا جی چپ چاپ چائے پیتے رہے۔ آج میں اُن سے امرتسر کے جلیا نوالہ باغ
کے بارے میں کچھ باتیں کرنے والا تھا۔ جب کبھی وہ مجھے میز پر بیٹھے کچھ نہ کچھ لکھتا دیکھتے
تو کہا کرتے۔ ”حمید یار کبھی ہماری ڈائری بھی نوٹ کر لو۔ عمر کا کیا بھروسہ!“

ڈائری سے اُن کی مراد جلیا نوالہ باغ کے واقعات تھے۔ جس وقت جلیا نوالہ باغ میں
جنرل ڈائرنے گولی چلانے کا آرڈر دیا، ابا جی دوسرے لوگوں کے ساتھ جلسہ گاہ میں موجود
تھے۔ میں ہنس کر ٹال جاتا۔ لیکن اُس روز میں نے والد صاحب کی جوانی کی یادوں کے سمندر
میں غوطہ رگنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ بحر بند کا تاریک سمندر تھا۔ ہیبت ناک کاسے پانی کا سمندر

تھا جس کی مہیب شوریدہ سرموہوں کو چیرتے کبھی امرتسری محب وطن قیدیوں سے بھرے ہوئے جہاز گزرے تھے۔ ان جلاوطن عمر قیدیوں میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ اس لئے کہ امرتسر کا مسلمان سیاسی اعتبار سے زیادہ بیدار تھا اور اس میں ہندو اور سکھوں کے مقابلے میں آزادی کی زیادہ تڑپ اور زیادہ ولولہ تھا۔ بقول اباجی، جلیانوالہ باغ کی تاریخ امرتسری مسلمانوں کے خون سے لالہ زار ہے۔

جلیانوالہ باغ پر خونیں حادثے کو گزرے سترہ اٹھارہ برس گزر چکے تھے میں امرتسر کے گورنمنٹ ہائی سکول میں نویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ اور جلیانوالہ باغ میں دوستوں کے ساتھ دن میں ایک آدھ بار گلی ڈنڈا کھینچنے ضرور جایا کرتا۔ یہ باغ ہمارے محلے کے پاس ہی تھا۔ کہنے کو تو یہ باغ تھا لیکن اس میں باغ کہیں نہیں تھا۔ بس ایک گول میدان سا تھا جس کے چاروں طرف اونچے اونچے مکانوں کے پچھوڑے لگتے تھے۔ میدان میں ایک پرانی سجادہ تھی۔ ایک چھتری نما زنگ خوردہ چھت والا اندھا کنواں تھا۔ (جب گولی پٹی تو یہ کنواں لاشوں سے بھر گیا تھا) باقی میدان میں ادھر ادھر کچھ درخت تھے۔ کہیں کہیں گھاس اگی تھی ایک جانب ڈھکی ہوئی ہنسلی تھی جس میں دو موٹھی نہر کا پانی بہہ کر دربار صاحب کے تالاب کو جاتا تھا۔ ایک بار ہماری گلی باغ کے اندھے کنوئیں میں گر گئی۔ ہم اسے نکالنے کے جتن کر رہے تھے کہ ایک فقیر نے ہماری طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”بچو! اس کنوئیں میں سینکڑوں ماؤں کے لال دفن ہو گئے۔ تم کیا ڈھونڈ رہے ہو؟“

ہمارا گھر کوتوالی کے عقب میں تھا۔ کوتوالی سے ہو کر جب آپ کیسری باغ کے سامنے ملکہ کے بت والے چوک سے گوریں تو سامنے دتے پٹھان کی بیٹھک کے پہلو والے بازار میں اونچے چوڑے مکانوں میں بھنپا ہوا جلیانوالہ باغ کا آہنی سلاخ دار دروازہ آجائے گا۔ یہ دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا۔ آگے ایک چارنٹ چوڑی کچی راہداری ہے جو بتدریج فرامند ہو ہو کر دھلان کی شکل میں باغ میں اتر گئی ہے اسی اونچان پر ۱۹۱۹ء میں جنرل ڈائمر کے گورکھا سپاہیوں نے مورچے سنبھالے تھے۔ چاروں طرف مکانوں کے پچھوڑے ہیں جن کی کھڑکیاں میں اکثر کھلی دیکھتا۔ ہندو سکھ اپنے مکانوں پر مسلمانوں کی طرح چستیں

نہیں ڈالا کرتے۔ ان کھلی بے پردہ کھڑکیوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ اُن آنکھوں کا خیال آتا جن کی پلکیں غائب ہوں۔ کہیں کہیں مکانوں کی دیواروں پر لکڑی کے جالی دار چوگھٹے لگے ہیں جن کے نیچے لکھا ہے ”گولی کا نشان“۔ جالیوں کے پیچھے ابھی تک اینٹوں میں سوراخ دیے ہی تھے۔ یہ اُن بے رحم گولیوں کے نشان تھے جو انگریز بریگیڈ جنرل آر۔ اکر۔ ایچ ڈائمر کے حکم سے اس تاریخی باغ میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کی ایک سہ پہر کو نہتے امرتسریوں پر برساتی گئیں۔ میرے والد صاحب کی عمر اس وقت ۳۰ برس کے قریب تھی اور وہ اس جلسہ گاہ میں موجود تھے۔

سبز چائے کی دوسری پیالی اباجی کے ہاتھ میں تھی اور اس کی خوشبودار بھاپ اُن کے بوڑھے چہرے کی جھریوں کو دھندلاتی ہوئی اوپر اٹھ رہی تھی۔ وہ آنکھیں نیم وا کئے گہری سوچ میں تھے اور انچاس سال پہلے کی یادوں کے گہرے سمندروں میں غوطہ زن تھے۔ اس سے پہلے کہ میں ان تاریخی یادوں کی غواچی کروں اور کچھ انمول اور گمنام موتی چن کر لاؤں میں جلیانوالہ باغ کے پس منظر پر مقوڑی سی روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلی جنگ عظیم میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور انگریزی حکومت نے ہندوستانی لیڈروں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کو ہوم رول دے دیں گے۔ لیکن فتح کے بعد نہ صرف یہ کہ انگریز اپنے وعدے سے پھر گئے بلکہ رولٹ ایکٹ کے ذریعے ہندوستان کو مزید غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ انگریز ہندوستان پر ۱۹۱۹ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سے راج کرتے چلے آئے تھے۔ وہ اس سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ہندوستانی بانی کورٹ کے جج سر سرنی رولٹ کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بیٹھی جس نے رولٹ ایکٹ کے نفاذ کے ذریعے ہندوستانیوں کی رہی سہی آزادی بھی چھین لی۔ اس ایکٹ کی رو سے حکومت کو اندھا دھند گرفتاریوں کا اختیار مل گیا اور مقدمہ چلانے بغیر سزاؤں کے خلاف اپیل کا بھی عوام کو حق نہ تھا۔ ہند کے مسلمان پہلے ہی انگریزوں سے بدظن تھے۔ ۱۸۵۷ء میں سب سے زیادہ زور مسلمانوں پر ہی پڑی تھی۔ لیکن مسلمانوں کو ابھی اپنی منزل کا تعین کرنا تھا۔ فی الحال وہ اپنے مشترکہ دشمن

کو کچلنے کے لئے کانگریس کے ساتھ تھے۔ یہ ہندو مسلمان اتحاد نہیں تھا۔ بلکہ انگریزوں کے خلاف ایک جنگ تھی، آزادی کی لگن اور ولولہ تھا۔ جس نے ان دو مختلف تہذیبوں کو ایک پل کے لئے ایک ہی پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا تھا۔

کالے قانون نے جلتی پرتیل کا کام کیا۔ گاندھی نے سیتہ گره کی تحریک شروع کر دی۔ یکم مارچ ۱۹۱۹ کو بمبئی میں سول نافرمانی کی قرارداد منظور ہوئی۔ مارچ کو دلی کے ایک جلسے میں کالے قانون کی پرزور مذمت کی گئی، ۶ اپریل کو کانگریسی اور مسلمان لیڈروں کے ایما پر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں کامیاب ہڑتال کی گئی۔ دلی ریوے سٹیشن پر جب ہڑتالیوں نے ایک ریڑی والے کو سو ڈالیمین بیچنے سے منع کیا تو ہنگامہ ہو گیا۔ پولیس نے گولی چلا دی۔ دو ہڑتالی مارے گئے۔ لاہور، امرتسر، بمبئی اور دلی میں احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ لوگوں نے اکا دکا انگریز شہریوں کو زور و کوب کرنا شروع کر دیا۔ لاہور میں ہڑتالیوں نے کالی جھنڈیوں کا جلوس نکالا۔ سات، آٹھ اور نو اپریل کے دن امن کے گزر گئے۔

پہلا دھماکہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۹ کو ہوا۔

پنجاب کے اُس وقت کے گورنر سر مائیکل اوڈنر کے حکم سے گاندھی کو بمبئی سے امرتسر آتے ہوئے پہلو ال سٹیشن پر روک کر واپس روانہ کر دیا گیا۔ اس خبر کے پھیلنے ہی سارے ہندوستان میں بلوے شروع ہو گئے۔ اس اثنا میں جلیا نوالہ باغ کا بدنام قاتل جنرل ڈائر دلی سے جالندھر اپنے ہیڈ کوارٹر جا چکا تھا۔ گورنر پنجاب کے حکم پر اُس نے امرتسر ریوے سٹیشن کی حفاظت کے لئے فوج کا ایک دستہ روانہ کر دیا۔ دس اپریل کی دوپہر کو وائس ریس کے ذریعے جنرل ڈائر کو ایک خفیہ پیغام ملا جس میں کہا گیا کہ جتنی جلدی ہو سکے مزید فوج، ہلکی توپیں اور ایک ہوائی جہاز امرتسر بھیجا جائے۔

امرتسر میں ۱۸۵۷ کے بعد آزادی کا دوسرا حوالہ لکھی پھٹ پڑا تھا۔ ہڑتالیں، زوروں پر تھیں۔ امرتسر کے لگی کوچوں اور بال دروازے کی دیواروں پر جا بجا پوسٹر لگے تھے جن پر لکھا تھا۔

”امرتسر کے شہریو! مارو یا مر جاؤ“

رام نوئی کے تہوار پر شہر میں ایک زبردست جلوس نکلا جس میں ”انگریزی راج مردہ باد“ کے نعروں لگائے گئے۔ امرتسر میں آزادی کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ امرتسر کے پٹوں ریوے سٹیشن اور سول لائنز کی انگریز آبادی کی حفاظت کے لیے کمپنی باغ میں سومرسٹ لائیٹ انفنٹری نمبر ۱۲ ایمونیشن کالم اور رائل آرٹیلری کے فوجی تعینات تھے۔

۱۱۔ اپریل ۱۹۱۹ کو صبح آٹھ بجے دوسرے گاندھی لیڈروں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر سیتہ پال کو امرتسر کے ڈپٹی کمشنر مسٹر مائیکلزارونگ کی طرف سے پیغام ملا میرے بنگلے پر دس بجے تشریف لائیں۔ شہر کے حالات کے بارے میں آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے اُس وقت پولیس سے بھر ہوئی دو لاریاں اور ایک موٹر کار بنگلے کے عقبی حصے میں تیار کھڑی تھیں۔ جب یہ دونوں لیڈر ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر پہنچے تو انہیں اُسی وقت گرفتار کر لیا گیا اور کار میں بٹھا کر دھرم سالہ روانہ کر دیا۔

کچلو اور سیتہ پال کی گرفتاری نے شہر میں آگ لگادی۔ لوگوں نے دھڑا دھڑ دکانیں بند کرنی شروع کر دیں۔ اور ہجوم در ہجوم ہال بازار میں سے گزر کر ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ گورا فوج نے سٹی جنٹریٹ مسٹر آر۔ بی۔ بیکٹ کی معیت میں فوراً انجن پارک والے ریوے پل کی دوسری طرف پوزیشن سنبھال لیں۔ آزادی کے متوالے امرتسری عوام کا یہ بھڑا ہوا ہجوم جب نعرے لگتا پل پر پہنچا تو گورا فوج نے رائفیں تان لیں جلوس ایک پل کے لئے ٹک گیا۔ تیس ہزار کا ہجوم ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ بیکٹ گھوڑے پر سوار این۔ سی۔ او کو حکم دے رہا تھا کہ جلوس کسی حالت میں بھی پل عبور نہ کرنے پائے اور جلوس نے آگے بڑھ کر گورا فوج کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ ایک آدمی نے مسٹر بیکٹ کے گھوڑے کے منہ پر سونٹی ماری۔ وہ الف ہو گیا۔ مشتعل ہجوم نے پتھر اڑا شروع کر دیا۔ اُس وقت ایک گھڑ سوار فوجی نے پستول سے دو فائر کر دیئے جس سے دو آدمی زخمی ہو کر گرے۔ اُن کے گرتے ہی ہجوم ذرا پیچھے ہٹا۔ اُن زخمیوں کو اٹھا کر چوک فرید میں ڈاکٹر بشیر کی ڈسپنسری پہنچا دیا گیا۔ اب ہجوم بے قابو ہو گیا۔ امرتسر کے ڈی۔ ایس۔ پی مسٹر پلومرنے وہاں آتے ہی فائرنگ کا حکم دے دیا۔ گورا فوج نے

فوراً گولی چلا دی۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔
”پھر کیا ہوا؟“

میں نے والد صاحب سے پوچھا۔ انہوں نے سگریٹ جلایا اور آنکھیں ذرا سی میچ کر
بولے۔

”بس پھر کیا تھا۔ پل سے لوگ زخمی ہو کر اور لاشیں اٹھا کر شہر میں آئے تو ایک طوفان
اُگیا۔ امرتسر کے گلی کوچے انتقام کے نعروں سے گونج اٹھے۔ میں ان دنوں پورا جوان تھا اور
پہلوانی کیا کرتا تھا۔ تکیہ شیخ چلی میں غلام رسول حلوانی کے ساتھ زور کیا کرتا۔ بدن میں شباب
کا خون گردش کر رہا تھا۔ میں بھی جلوس کے ساتھ وہاں سے لوٹ کر اپنے محلے میں آگیا۔ جس
وقت میں مال بازار میں سکندر خاں والی اونچی مسجد کے پاس پہنچا تو میرے دیکھتے دیکھتے سامنے
والے نیشنل بینک کو آگ لگا کر لوٹ لیا گیا۔ اس بینک کا ایک انگریز مینجر سوارٹ صاحب
تھا اُس کو قتل کر کے آگ میں پھینک دیا گیا۔ بجلی والے چوک میں بینک کی کوئی بڑی
بڑی پٹیاں، پاپٹوں اور سریوں سے توڑی گئیں اور ان میں سے جو ریشمی سوتی کپڑا اور
سلمان نکلا اُسے کچھ لوگ اٹھا کر لے گئے اور باقی وہیں چوک میں تندر آتش کر دیا گیا۔ اسی
طرح ہمارے اپنے بازار میں محمد جان کی مسجد کے سامنے والے الائنس بینک اور پہلو
والے چارٹرڈ بینک کو بھی ٹوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ بینک کے ہندو خزانچی نے انگریز مینجر
کو بچانے کی کوشش کی مگر جیسے دھوبی نے انگریز کو بازوؤں پر اٹھا کر یا علی کا نعرہ لگایا اور آگ
میں پھینک دیا۔ اس وقت امرتسر کے اُن گھروں میں عورتیں بین کر رہی تھیں جہاں گورا فوج
کی گولیوں سے چھلنی بھائیوں اور بیٹوں کی لاشیں پڑی تھیں۔“

والد صاحب نے سگریٹ کا کش لگایا اور ٹانگ سیدھی کر کے اُسے دبائے لگے۔
مجھے محمد جان کی مسجد اور یہ سارے بینک یاد آ گئے۔ یہ بعد میں پھر سے تعمیر ہو گئے تھے
اور میں اپنے دوستوں کے ساتھ اُن کے برآمدوں میں کھیل کرتا تھا۔ پھر یہ بینک ہندو
سابھوکاروں نے خرید لئے اور امرتسر کے مسلمانوں کا خون چوس چوس کر اک منزلہ سے دو منزلہ
اور سہ منزلہ ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ان بنکوں کو خود ہم نے آگ لگا۔ مجھے اُس ہندو

بنک کی سہ منزلہ عمارت سے اٹھتے ہوئے شعلے آج بھی یاد ہیں جس کی چھت پر ایک آدمی
شعلوں میں گھرا ہوا اس چوبے کی طرح ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ یہ وہ چوبے تھے جنہوں نے
اور جن کے آباؤ اجداد نے امرتسر کے مسلمانوں کی سماجی اور معاشی عمارت کو اندر ہی اندر سے
کھوکھلا کر دیا تھا۔ اب میری امرتسر کی یادوں کا در کھل رہا تھا۔ میں نے پائپ سلگا کر آنکھیں
بند کر لیں۔ یادوں کے در بند کر دیئے۔ اور سماوار میں سے گرم گرم چائے پیالی میں ڈالتے
ہوئے پوچھا۔

”ابا جی! کوڑیاں والے کھوہ کا واقعہ کیا تھا؟“

والد صاحب نے اپنے خشکی سر کو کھجایا اور اپنی پیالی پر جمی ہوئی بالائی کو پھونک
مار کر بولے۔

”ایک انگریز لیڈی (مس فارسلا شیر وڈ) جو کہ امرتسر کے مشن سکولوں کی بڑی استانی
تھی سائیکل پر سوار گھر کو جا رہی تھی کہ راستے میں بدوائیوں نے اُس پر حملہ کر دیا۔ وہ بھاگ
اٹھی۔ لیکن کوڑیاں والے کھوہ والی گلی میں پہنچ کر سائیکل سے گر پڑی۔ لوگوں نے اُسے
وہیں ختم کر دیا۔ بعد میں جب مارشل لا لگا تو جنرل ڈائر خود وہاں پہنچا اُس نے گلی کوڑیاں
والی کھوئی کے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ گھر سے نکلیں تو گلی کے فرش پر گھٹنے ٹیک کر بازار میں
آئیں اور ویسے ہی گھروں کو واپس جائیں۔ مگر اُس وقت ابھی مارشل لا نہیں
لگا تھا۔ اُس وقت امرتسر میں کارج تھا۔ اور یہ امرتسری تھانوسے فی صد مسلمان تھے۔
یہاں تک کہ جلیا نوالہ باغ بھی مسلمانوں کے محلے میں تھا۔ ہندو سکھ محلوں میں کسی جگہ بھی
بنکوں کو آگ نہیں لگی تھی۔ کانگریسی لیڈر محسن نعرے لگاتے۔ کانگریسی ہندو اُن نعروں کا جواب
دیتے اور بس۔ دشمن سے لڑنا اور مقابلہ کرنا، یہ کام امرتسر کے مسلمانوں کا تھا۔
اور ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی اس بات کی گواہ ہے۔ میں نے ماچس جلا کر والد صاحب
کا سگریٹ سلگایا۔

”لیکن ابا جی! آپ تو کہا کرتے ہیں کہ ٹوٹ کا مال ہمارے محلے میں بھی آیا تھا۔“
”ضرور آیا تھا۔ ہر جگہ ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ گاما رنوگر جو ملل کا تھان لایا وہ

اسی گز کا تھا۔ اُس نے فوراً اُسے انگو اکڑتے سلوائے۔ احمد دین پٹولے کا بھائی اسی ملل کارنگ دار کرتے ہیں کر جلیانوالے باغ جلسہ سننے گیا تھا کہ گولی کھا کر مر گیا۔ ایسے بھی لوگ تھے جنہوں نے کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کو تو الی میں ٹاؤن ہال کے کونے میں پہلے ایک ڈاکخانہ ہوا کرتا تھا۔ مسجد عیدالون گلی ڈبگراں کے مولوی صاحب کا جوان بیٹا غلام حسن میرا یار تھا۔ بڑا شینہ جوان تھا۔ ہم دونوں جمعے کے جمعے سنی سرور والے اکھاڑے میں زور کیا کرتے تھے۔ وہ ڈاکخانے کا دروازہ توڑ کر اندر چلا گیا۔ بس جوانی کے زور میں ایسا کر گیا۔ بیٹے میں آزادی کی آگ جو لگی تھی۔ اندر جا کر اُس نے روپے اور ٹکٹ نکالے اور انہیں باہر سڑک پر لا پھینکا۔ اور نعرہ مار کر بولا۔

”یہ کافر کا مال ہے۔ اسے آگ لگا دو۔ یہ مسلمان پر حرام ہے۔“

حمید میاں۔ جب مارشل لا لگا تو ایک ہندو اشٹام فروش نے اُس کی فحری کر دی۔ غلام حسین گرفتار ہو گیا۔ انگریز نے اُسے پھانسی کی سزا دی اور اسے میانوالی جیل میں پھانسی چڑھا دیا گیا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا دل اُسی دلولہ خیز شہید کی یاد میں سو گوار ہو گیا جو برصغیر میں آزادی کے اولین بیج بونے والوں میں سے تھا۔ میں نے پیالی میں سے سبز چائے کا تلخ گھونٹ پی کر کہا۔

”سری قصائی کون تھا؟“

”سری؟ سری قصائی تھا۔ بڑا دلیر جوان تھا۔ چھوٹا تھا۔ ہر جلسے، ہر جلوس میں جھنڈا اٹھا کر چلتا تھا۔ عید میلاد کے جلوس میں حلیم کی دیگ کا ریڑھ لے کر سکتی باغ جایا کرتا تھا۔ سری اُس کا نام اس لئے پڑ گیا تھا کہ وہ دوپہر کو گلی گلی پھر کر سری پائے بیٹا تھا اور ”سری! سری!“ آواز لگایا کرتا تھا۔ سب سے پہلا جلوس جس پر انجمن پارک والے ریلوے پل پر گولی چلی اُس میں سری نے لال رنگ کا ترک کی حکومت کا جھنڈا اٹھا رکھا تھا۔ اور رومی ٹوپی پر اتارک کی تصویر پن کے ساتھ لگی تھی۔ اُس کے نعروں نے جلوس میں آگ لگا دی تھی۔ وہ چار روپے میں آگ لگانے والوں کے آگے آگے تھا۔

وہ بنک کے چوترے پر کھڑا تھا اور بنک کے نوٹوں کی گدیاں آگ میں پھینک پھینک کر کہہ رہا تھا۔

”کافر کا مال بھی کافر کے ساتھ جہنم میں جائے گا۔“

مارشل لا میں سری کی بھی فحری ہوئی۔ پکڑا گیا۔ پھینچا کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پھانسی کے بعد جب اُس کی بھی لاش لگی میں آئی تو ایک کھرم مچ گیا۔

والد صاحب خاموش ہو گئے۔ وہ اُن پرانے ہم جولیوں کی سو گوار یادوں میں کھو گئے تھے۔ جنہوں نے جوانی میں ہی اُن کا ساتھ چھوڑ دیا اور آزادی کے پرچم تلے اپنی جان قربان کر دیں۔ میں نے پوچھا۔

”لیکن ابا جی! حاکموں کو ان لوگوں کے بارے میں پوری معلومات کس نے دیں؟“

”یہ خبریاں سی آئی ڈی کے ملازموں۔ دولت کے بچاری اور حاکموں کے مطیع ہندو ساہوکاروں اور اُن پہاڑیے ہندو نوکروں نے کیں جو سول لائنز میں انگریزوں کی کوٹھیوں میں کام کرتے تھے۔ وہ سووا سی آئی ڈی میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھیں۔ لالہ گیان چند ہی نے تو ڈی سی کو ہمارے محلے کے مسلمانوں کے نام دیئے تھے۔“

”لیکن یہ بتائیے کہ پھر اُس دور میں ہندو مسلم اتحاد کیسا تھا؟“

”اصل میں ہم تو پڑھے لکھے لوگ نہیں ہیں۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا امرتسر میں کبھی بھی ہندو مسلمانوں کو ایک ساتھ مل کر بیٹھے نہیں دیکھا۔ اُن کا رہن سہن ہی ہم سے الگ تھا۔ برتن بھانڈے الگ تھے، برتنوں کے نام ایک دوسرے سے نہیں ملتے تھے۔ چنانچہ ہر محرم کو فساد ہو جاتا۔ اُس وقت اصل میں انگریز ساخا دشمن تھا۔ تو مسلمان جا پانیوں کو بھی ساتھ بلا لیتے۔ رام نومی پر ہندوؤں کا مسلمانوں سے کس قدر اتحاد تھا۔ مجھے یاد ہے میں چکن کا کرتہ پہنے، صوبونیاں والے بازار گیا تو ہندو لالوں نے تھالی میں مہری اور لاجپ پٹیش کی۔ میرے کرتے پر صندل میں بھگو کر ٹھپہ لگایا۔ مگر اس کے ایک ہی سال بعد ہندوؤں کے انہیں محلوں میں مسلمانوں کے خلاف جلسے ہوئے اور انہیں قتل کرنے کی سکیمیں بنائی

گئیں۔ جس روز گول باغ میں جلسہ ہوا تو قومرو نے (قمر دین آف بنو اوس انارکلی) مجھے آکر کہہ دیا تھا۔

خلیفہ اب یہاں سے پوریا بستر گول سمجھو۔ ہندو لیڈروں نے کہہ دیا ہے، مسلمانوں! تم عرب سے آئے ہو عرب چلے جاؤ۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ ہندو مسلمان ہندوستان میں ایک ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے تھے۔ رام نومی والا اتحاد اصل میں انگریزوں کے خلاف تھا۔ مسلمان ہندوستان میں شروع ہی سے نجات حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کی ڈیڑھ سو برس کی غلامی میں انہوں نے کئی بار علم آزادی بلند کیا اور قربانیاں دیں۔ ۱۸۵۷ء میں سب سے زیادہ خون مسلمانوں کا بہا۔ ہندوؤں نے اس وقت بھی مخبریاں کیں۔ اور اپنے سرکاری عہدے پائے۔ اسی طرح جلیانوالہ باغ میں بھی مسلمان ہی زیادہ تر شہید ہوئے۔ ہندوؤں نے مخبری کر کے چُن چُن کر جوان مسلمان شہریوں کو پھانسی پر لٹکایا یا کالے پانی بھجوا دیا۔ اب بھی دیکھ لو کبھی تم نے یہ بھی سنا ہے کہ فلاں ہندو لالہ کالے پانی سے رہا ہو کر آیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ تم نے چچا محمدی اور فیروز کے نام ہی سنے ہوں گے۔ حمید میاں ہم نے ہندو سکھوں میں عمریں گزاری ہیں۔ یہ کبھی مسلمان کے دوست نہیں ہو سکتے۔

والد صاحب نے نفی میں گردن کو ہلایا اور ریحانہ کو آواز دی۔

”ریحانہ بیٹا! سداور ٹھنڈا ہو گیا ہے۔“

”آئی ابا جی!“

اتنے میں ریحانہ مسکراتے ہوئے اندر آئی اور سداور اٹھا کر لے گئی۔ اس وقت مجھے اپنی والدہ مرحومہ آپو جی بہت یاد آئیں۔ کشمیری چائے بنانے کا جو سلیقہ اُن میں تھا وہ امرتسر کی بزرگ کشمیری خواتین کا ہی حصہ ہے۔ وہ بڑے اہتمام سے منہ اندھیرے اٹھ کر آگ جلاتیں۔ پتیلی پہچھ اور پیالے گرم پانی سے پاک کرتیں تازہ پانی میں چائے کی پتی ڈالتیں جب خوب جوش آجاتا تو ٹھنڈے پانی کا چھینٹا دیتیں۔ دودھ الگ گرم کرتیں اور پھر اس میں چائے کا رس انڈیلتیں۔ ٹھیک جس وقت چائے کا رنگ سچے گلاب ایسا

ہو جاتا تو ہاتھ روک لیتیں۔ میں اُن کے پاس بیٹھ جاتا۔ بڑی محبت سے میری پیالی میں چائے ڈالتیں۔ چائے میں سے کبھی گلاب کی خوشبو آتی اور کبھی نجھے یوں لگتا جیسے کسی گرم دوپہر کو چنبیلی سے لدے ہوئے جھگل میں سے گزر رہا ہوں۔ میں اپنی گرم خوشبو دوا جھگل میں سے ہوتا ہوا امرتسر کی نہروں اور پھولوں بھرے باغوں میں نکل گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امرتسر کی رگوں میں کشمیری مسلمانوں کے کلچر اور ثقافت کا خون دوڑ رہا تھا۔ امرتسر میں مسلمانوں میں زبردست سیاسی شعور اور ادبی ذوق تھا۔ اس شہر بے مثال میں جتنی ادبی اور سیاسی تحریکوں نے جنم لیا وہ مسلمانوں ہی کی مرہونِ منت تھیں۔

اس شہر نے بلند مرتبت مسلمان خطیب، لیڈر، شاعر، ادیب، پہلوان اور ہنرمند پیدا کئے۔ ہندو گول مارکیٹ، چھتی ڈیڑھی بازار مالی سیواں اور گورو بازار کی تنگ تاریک دکانوں پر تو نند زکائے دن بھر پیسے پیٹ کھاتے رہتے جبکہ امرتسر میں مسلمان کاریگروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے قالین، جامع واریں اور لٹھینے کی چادریں سمرقند و بخارا کی منڈیوں میں داد و تحسین وصول کرتیں۔ اُن کے اللہ اکبر کے جوشیلے نعرے آج بھی انجمن پارک، گول باغ اور سکتری باغ کی فضاؤں میں گونج رہے ہیں۔ بہت بعد میں متعجب ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کے مقابلے کے لئے سنگٹھن کی تحریک شروع کی اور ہندوؤں میں ہندو نوجوان درزش کرتے دکھائی دینے لگے۔ ورنہ اس سے پہلے امرتسر کے اکھاڑے مسلمانوں ہی کے دم کے قائم تھے لیکن پچاس ڈنٹر پینے کے بعد بمشکل تین پاؤ درودھ پینے والا پپلا زور ہندو بھلا ایک ہزار ڈنٹر لگا کر سالم بکرے کی بخنی چڑھا جانے والے امرتسر میں مسلمان کا مقابلہ کہاں کر سکتا تھا! چنانچہ ۱۹۴۷ء کے نساہات میں ہندو کسی بھی جگہ کھل کر مسلمان کے مقابلے میں نہیں آیا۔ وہ اپنی اکثریت کے محلوں میں چھپ کر بیٹھ رہے تھے۔ ادھر کوئی اکا دکا دلیر مسلمان جا نہ نکلتا تو اسے آ لیتے ہاں سکھوں نے ضرور مقابلہ کیا۔ مگر وہ بھی اللہ اکبر کے نعروں کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ سب سے پہلا حملہ ہمارے محلے کٹڑہ مہان سنگھ پر برج پھولا سنگھ کے نہنگ سکھوں نے کیا۔ میں خود مقابلہ کرتے والوں میں موجود تھا۔ نہنگ اپنے ایک ساتھی

کی کٹی ہوئی موٹی پنڈلی چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اس مقابلے میں قادر شوز کمپنی انارکلی کے قادیان
شہید و خدی ہوئے تھے۔ اگر امرتسر میں باقاعدہ فوج برپا نہ کی جاتی تو یہی اور بکتر
بند گاڑیاں لے کر نہ آتی تو یقین کیجئے امرتسر کو امرتسر مسلمانوں سے خالی کر دانا ناممکن بات تھی۔
بہر حال اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہ کر سکے گا کہ ہریانہ اور جالندھر کی طرح امرتسر
بھی اسلام کے کچھ اور دینی آزادی کا زبردست مرکز تھا۔ اور ہر سیاسی تحریک کے پیچھے
مسلمانوں ہی کا ہاتھ رہا ہے۔ کون امرتسر ہے جو چوہدری فضل حق، شیخ حسام الدین، سید
عطا اللہ شاہ بخاری سیف الدین کچلو، غازی عبدالرحمان اور مولوی غلام محمد ترنم کی شعلہ فشاں
تقریروں کو بھلا سکے گا؟ قاصداں والی مسجد کے گنبد و مینار آج بھی مولوی ترنم کی پرجوش خطابت
کے آئین ہیں۔ مسجد خیر الدین کے در و دیوار آج بھی سید عطا اللہ شاہ بخاری کی آتش نوازیوں
پر ہمہ تن گوش ہیں۔ یہ وہ اسلام کے جیالے سپوت ہیں جنہوں نے اپنے خون سے
دین محمدی کے چین کی آبیاری کی اور مسلمانوں کو وہ سیاسی اور دینی استحکام بخشا جس نے
۵۵ کی جنگ میں کہیں میجر عزیز بھٹی، کہیں جنرل سرفراز خاں، کہیں کپٹن میجر عبدالجلیل
کہیں حوالدار شیر دل، کہیں راجہ مسعود اختر کیانی اور کہیں میجر عباسی بن کر ہندو حملہ آور
دشمن کو آگ اور خون کے جہنم میں نیست و نابود کر دیا۔

امرتسر کا ہندو بنیا پانی پانی و مڑی و مڑی کے حساب کے کپڑا بیچتا تھا اور یہی کھاتوں
کا زور و کیرا تھا۔ سکھ کنگ منڈی اور پاپڑ منڈی میں یا پاپڑ وڑیاں بناتا تھا اور یا پور
میں آری تیشہ ڈالے گلی گلی منہ پیڑھی ٹھکانوں کی آوازیں لگاتا تھا۔ لیکن امرتسر کا مسلمان مجلس
امرار اور نیلی پوشوں کے جلوس میں ستارہ و ہلال کا پرچم اٹھا کر سینہ تانے چلتا تھا۔ انقلاب
زندہ باد۔ اسلام زندہ باد اور پھر پاکستان زندہ باد کے فلک شکست نعرے لگاتا تھا۔ امرتسر
اتنی پرجوش، پرجوش، زندہ دل، شیر دل اور بیدار معر مسلمان نوجوانوں کی جدوجہد کا دوسرا
نام تھا۔ امرتسر کی ساری رونقیں سیاسی ہنگامے، شعر و ادب کی بزم آریاں، صبح سری
پائے کے ناشتے، نہر کی آم پارٹیاں اور ہنگامہ خیز جلوس امرتسر مسلمانوں ہی کے
دم قدم کی برکت سے قائم تھے۔ امرتسر مسلمان ہمیشہ ہندو کے حق لاغر میں اپنی سیاسی

بصیرت، ملی سلطوت بے مثال ذہانت اور جذبہ عمل کا خون دیتے رہے۔ امرتسر کے تاج محل
کی عمارت مسلمانوں ہی کی بنیادوں پر کھڑی تھی۔ مسلمانوں نے امرتسر چھوڑ دیا۔ تاج محل
گر پڑا۔ ہندوؤں کی سپلائی لائن ٹوٹ گئی۔ اب امرتسر کی مثال اُس ہندو عورت کی سی
ہے جیسے اُس کے شوہر نے طلاق دے دی ہو۔ اُس مرہٹوں کی سی ہے جو قلت خون کے
باعث مر گیا ہو اور جس کی لاش سڑ پھر پڑا ل کر مردہ خانے لے جاتی جا رہی ہو۔

”بھائی جان چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے“

چھوٹی بھابی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں امرتسر کی ٹمٹان بھومی سے واپس لاہور کی
انارکلی میں آگیا۔ ریحانہ چائے پیالیوں میں انڈلی بھی چکی تھی اور والد صاحب بڑے سکون سے
پی رہے تھے۔ وہ ۱۹۱۹ کے جلیانوالہ باغ کی یادوں میں گم تھے اور میں، ۱۹۴۷ کی یادوں میں
کھو گیا تھا۔ دراصل ۱۹۴۷ء، ۱۹۱۹ء اور ۱۹۴۷ء۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی جدوجہد
آزادی کے درخشاں مینار ہیں جن کی روشنی میں ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے دینی
ورثے اور اسلامی عظمت کے اجا اور بقا کی منزل پائی۔

ابا جی نے اب پیالی میں ٹکیں قلیچہ ڈبلیا تھا اور اُسے چمچ سے بڑے مزے سے
کھا رہے تھے۔ میں نے پائپ میں نیا تمباکو بھرا اور کارنس پر رکھے گلاب کے پھولوں کو
دیکھ کر اُسے سلگاتے ہوئے پوچھا۔

”اس کے بعد کیا ہوا ابا جی؟“

”بس پھر جو ہوتا تھا ہو کے رہا۔ جنرل ڈائر گورکھا فوج لے کر امرتسر میں آن داخل ہوا۔
دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی۔ جلے جلوسوں پر پابندی لگ گئی۔ بیساکھی کے دن تھے۔ رام تلانی
کے سامنے ولے میدان میں میلہ لگا تھا۔ اگلے روز ۱۳ اپریل کا دن تھا۔ اس روز امرتسر
کے آسمان پر ہلکا گرد و غبار سا پھیلا ہوا تھا۔ میں سخی سرور کے اکھاڑے میں زور کر کے
گھر آیا۔ نہادھو کر دوپہر کا کڑھا ہوا دودھ پیا۔ مونچھوں پر بالائی کی مالش کی۔ سلک
کا کرتا اور پیپ شو پہنا۔ ماسٹر الہ بخش (والد محترم جناب ظہور الحسن ڈار) اور چھوٹے شاہ
کو ساتھ لیا اور ہم تینوں جلیانوالہ باغ کی طرف روانہ ہو پڑے۔ ہم تینوں جوان تھے

اور بدن میں جوانی کا خون گردش کر رہا تھا۔ بازار بکرواناں سے نکل کر کیسری باغ سے ہوتے ہوئے ہم جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔

میں نے پوچھا۔

”آپ نے فضا میں کوئی خاص بات محسوس نہیں کی؟“

”کوئی خاص بات نہیں تھی۔ امرتسر میں دفعہ ہم اہل گاہی کرتی تھی اور جلسے ہوا ہی کرتے تھے۔ جلیا نوالہ باغ میں لوگوں کے ٹھٹھہ کے ٹھٹھہ لگے تھے۔ حمید خدا جھوٹ نہ بوائے کوئی پچاس ہزار کا ہجوم تھا۔ ارد گرد مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں بھی لوگوں کے سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ جلسہ گاہ کے بیچ میں تخت پوش پر ایک کرسی رکھی تھی جس پر ڈاکٹر کچو اور سیتہ پال کی تصویریں رکھی تھیں۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے اُس وقت کانگریس کا ہنسراج تقریر کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک ہوائی جہاز نے جلسہ گاہ کا ایک چکر لگایا اور قلعے کی پریٹ کی طرف چلا گیا۔ اب ایک شاعر اٹھا اور اُس نے اردو میں لکھی ہوئی انقلابی نظم پڑھنی شروع کر دی۔ ہم چونکہ دیر سے آئے تھے اس لئے لوگوں کے پیچھے ہی تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ گورکھا فوج نے باغ کے دروازے والے ٹیلے پر اگر ایک دم مورچہ سنبھال لیا اور جنرل ڈائر سفید گھوڑے پر ذرا اوپر اٹھ کر دوربین سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

چھوٹے شاہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

خلیفہ ایسا لگتا ہے آج گولی چلے گی،

میں نے کہا۔

”شاہ جی فکر نہ کرو۔ یہ محض ڈرانے کے لئے ہے۔“

ماسٹر اللہ بخش نے بھی کہا کہ خلیفہ آثار اچھے دکھائی نہیں دے رہے۔ میرا خیال

ہے یہاں سے نکل چلو۔ ماسٹر اللہ بخش ہم میں پڑھا لکھا تھا۔ اُس کی بات

میری سمجھ میں آگئی۔ ہم تینوں آہستہ سے اٹھے اور باغ کے گیٹ کی طرف بڑھے۔ ہمارے

سامنے دروازہ ہی وہی تھا۔ وہاں فوجی مشین گنیں تانے بیٹھے تھے۔ جنرل ڈائر نے ہمیں

اپنی طرف آتے دیکھا تو ہاتھ ہلا کر بولا۔

”گو اون۔ چانو۔ چانو۔ پیچھے۔“

ایک گورکھا رائفل لے کر ہماری طرف لپکا۔ ہم اٹھے پاؤں بھاگے۔ ابھی ہم نے چند قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ پیچھے سے تڑا تڑا تڑا مشین گن کے فائروں کی آواز آئی۔ جنرل ڈائر نے گولی چلانے کا آرڈر دے دیا تھا۔ مشین گن کی یہ پہلی باڑ لوگوں کے سروں کے اوپر سے ہو کر گزر گئی۔ اس باڑ کی ایک گولی گولائی گیٹ کے باہر اوپے تھپتی ایک گوجر عورت کو لگی اور وہ ہلاک ہو گئی۔ جلیا نوالہ باغ فائرنگ کی یہ پہلی مسلمان شہید عورت تھی۔ ہم تینوں ہجوم میں ایک دوسرے سے بکھر گئے۔ اُس وقت سیٹج پر لالہ ہنس راج نے چلا کر کہا۔

لوگو! بیٹھے رہو۔ یہ بھوکے فائر ہیں۔

مگر لوگ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دراصل زیادہ بھگدڑاں دیہاتیوں نے چائی جو بیساکھی کے میلے پر امرتسر آئے ہوئے تھے اور اس قسم کی سیاسی ہنگامہ خیزیوں سے بالکل ناواقف تھے۔ اب فوج نے دوسرا اونڈ چلایا جس کی باڑ جلسے میں موجود لوگوں پر ماری گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہاں چیخ و پکار اور کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ لوگ ایک دوسرے کو کچلتے ہوئے بھاگنے اور گولیاں کھا کھا کر گرنے لگے۔ گولیوں کا ٹھائیس ٹھائیس اور تڑتڑ کرتا مینہ برس رہا تھا۔ ہر طرف کھرام بپا تھا۔ لوگوں نے گھبرا کر کنوئیں میں چھپا لگیں لگا دیں اور ایک دوسرے کے اوپر گرتے چلے گئے اور دب کر ہلاک ہو گئے۔ بچے بھاگتے لوگوں کے پاؤں تلے کچلے گئے۔ میں ہجوم کے ریلے میں باغ کی مشرقی دیوار کی طرف بڑھا جا رہا تھا کہ ایک گولی سنناقی ہوئی میرے کان کے قریب سے گزری اور ایک سکھ کو سر میں لگی۔ وہ آہ کئے بغیر گرا اور اس کی لاش دیکھتے دیکھتے لوگوں کے پاؤں تلے کچلی گئی۔ میرا سسک کا کرتہ تار تار ہو چکا تھا۔ پمپ شو جانے کہاں رہ گئے تھے۔

میں نے دھوتی کا لنگوٹا کس لیا اور لوگوں کے اوپر سے ہوتا باغ کی دیوار کی طرف لپکا۔ یہ دیوار باغ کے گرد گرد چلی گئی تھی اور کوئی فٹ اونچی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ دیوار کو پھاندنے کی کوشش میں گولیاں کھا کھا کر گر رہے ہیں اور ہلاک ہو رہے ہیں۔ دیوار پر

خون کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ اب میرے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ دیوار بچاؤں۔ کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ زمین پر لیٹے ہوئے لوگوں کے سروں پر بھی گولیاں لگی تھیں۔ جنرل ڈائر کے فوجی، رائفلس نیچی کر کے بھی فائر کر رہے تھے۔ میں بڑا جوان اور طاقتور تھا۔ بدن کمایا ہوا تھا۔ جونہی میں دیوار کے پاس پہنچا میں خدا کا نام لے کر اچھلا اور دوسرے لمحے میں دیوار کی دوسری جانب ٹال کی لکڑیوں پر پڑا تھا۔ میں اُسی گرمی سردی میں اٹھا اور دیوار کی اوٹ میں چلتا وہاں آگیا جہاں دیوار ختم ہوتی تھی اور میں فوجیوں کو گولیاں چلاتے دیکھ سکتا تھا۔ فوجی اُس وقت تیسرا اونڈ چلا رہے تھے اور جلسہ گاہ میں بابا کارمچی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جنرل ڈائر اشارے کر کے فائرنگ کر رہا تھا۔ پھر اُس نے فائرنگ بند کرادی اور فوجیوں کو ساتھ لے گھوڑے پر سوار ہو کر ٹیلے سے نیچے اتر گیا۔ اب میں بھاگ کر جلسہ گاہ میں آگیا کیونکہ مجھے ہاسٹل الشد بخش اور چھوٹے شاہ کی تلاش تھی۔

حمید۔ تمہیں کیا بتاؤں کہ میدان میں کیا حشر مچا تھا۔ بس تم اُسے دیکھتے تو لکھتے میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ لاشوں کے انبار تھے اور خون کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ میں نے ایک آٹھ دس برس کے لڑکے کو دیکھا کہ لاشوں کے نیچے دبا اپنا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ میں نے لاشوں کو ہٹایا تو وہ نیم بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اُسے اٹھایا اور دربار صاحب والی ہنسلی کی حوضی میں سے پانی پلانا چاہا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حوضی کے پانی میں دس گیارہ لاشیں تیر رہی ہیں پانی اُن کے لہو سے سرخ ہے۔ ایک آدمی سہا ہوا پانی میں لٹکا ہے۔ چہرہ سفید ہے۔ ہاتھ نیلے ہیں۔ آنکھیں پھٹی پھٹی ہیں مجھے دیکھتے ہی یا گلوب کی طرح پکارا اٹھا۔

”کیا گولی چینی بند ہو گئی؟“

ہنسلی کی نہریں بھی ان گنت لاشیں تیر رہی تھیں۔ اُن میں سے میں نے نمک منڈی کے ایک مسلمان رفوگر بابا صمرو کی لاش پہچان لی۔ اُسے دو گولیاں لگی تھیں ایک سر کے بیچ میں اور ایک داہنے جبرٹے سے ذرا اوپر۔ میں نے لڑکے کو نہر کا خون ملا پانی پلایا۔ وہ بدحواس ہو کر ادھر ادھر ٹکٹے اور پھر چیخنے لگا۔

”بتائی! لالاجی! پتاجی!“

اور پھر زور زور سے رونے لگا۔ میں نے اُسے چپ کرایا اور سوچا کہ اسے سامنے والی گلی کے کسی گھر میں چھوڑ آؤں۔ میں جو اُسے لئے گلی میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ادھیڑ عمر کا ہندو لالہ صرت بنیان اور نیکر پہنے روتا ہوا ادھر ادھر وادیا کرتا۔ ”میرے بلرام پترنوں دیکھیا ہے!۔ میرے بلرام پترنوں دیکھیا ہے لوکو! ہائے میرا پترا۔۔۔“ وہ زار و قطار دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اب جو اُس نے اپنے بیٹے کو میرے ساتھ دیکھا تو باپ بیٹا پیچ مار کر لپٹ گئے۔ ہندو باپ نے بیٹے کو گندے پر لادا اور وہاں سے آندھی کی طرح بھاگ گیا۔

اب میں پھر اپنے دوستوں کی تلاش میں باغ میں آگیا۔ میں نے راستے میں دیکھا بازار بڑج میوہ سنگھ اور بازار جلیا نوالہ باغ میں بھی لوگوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو جلے میں گولی کھا کر گھروں کی طرف بھاگے اور بازار میں ہی گر کر دم توڑ گئے۔ میں نے ایک زخمی کو دیکھا کہ بالکل نیلا پڑ چکا تھا اور بازار کی نالی پر منہ رکھے پانی پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاں جلے کا تخت پوش بچھا تھا وہاں کم از کم تین سو کے قریب لاشیں پڑی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق سارے باغ میں اس وقت خدا جھوٹ نہ بلوائے تو تین چار ہزار کے قریب بچوں بوڑھوں اور جوانوں کی خون آلود لاشیں پڑی تھیں ان میں شدید زخمیوں کی بھاری تعداد بھی تھی۔ میرے ایک دوست سکندر علی جو ڈھاب کھٹیکاں میں رہتے تھے شام سات بجے اپنے چھوٹے بیٹے کی تلاش میں وہاں پہنچے۔ اُن کے لخت جگر کی لاش مردوں کے انبار تلے پڑی تھی۔ گولی اُس کے سر کو توڑ کر نکل گئی تھی۔ اُس کے پاس ہی اُس کے ماہوں اسماعیل کی لاش پڑی تھی جس کے ساتھ وہ جلسہ سننے آیا تھا۔ میں نے ایک بوڑھے سیکھ کو دیکھا کہ بچے کو سیلنے سے لگائے زمین پر پڑا ہے۔ مشین گن کی گولیوں نے دونوں کے جسموں کو ادھیڑ ڈال دیا ہے۔ ہنسلی دربار صاحب والی میں ہی میں نے ترنارن کے ایک چھڑا سی کو مرے پڑے دیکھا۔ وہ کبھی کبھی امرتسر میرے پاس آیا کرتا تھا۔ لاشوں کے ساتھ ساتھ میدان میں جوتوں کے انبار بھی لگے تھے۔ مجھے چھوٹے شاہ اور ماسٹر الشد بخش کہیں نظر نہ آئے۔ اب میں بھی لاشوں اور زخمیوں کے درمیان پھرتے دہشت زدہ ہو گیا

تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ لوگ لالٹینیں لئے اپنے اپنے لوگوں کی لاشیں ڈھونڈ رہے تھے
میں گھر کی طرف چل پڑا۔ بازار بند تھے اور ایک عجیب و بہشت ہر طرف طاری تھی۔ بازاروں
میں لوگ اپنے عزیزوں کی لاشیں چار پائیوں پر اٹھائے جلدی جلدی اپنے گھروں کو لئے
جا رہے تھے کیونکہ ۸ بجے کے بعد شہر میں کرفیو لگنے والا تھا۔ ملکہ کے بت کے پاس مجھے
والد صاحب ملے۔ وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں ماسٹر الہ بخش اور چھوٹے شاہ کے
ساتھ میری تلاش میں آرہے تھے۔ سوا سات بجے شام ہی شہر پر ہو کا عالم طاری ہو گیا
تھا۔ روڑاں والی مسجد کے پاس ہمیں ایک نیم عریاں پریشان حال سکھ بوڑھا ملا جو رو رو
کر ہر ایک سے پوچھتا تھا۔ تمیرے بیٹے کو کسی نے دیکھا ہے؟

اُسی روز مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور امرتسر میں وحشت و بربریت کے ایک عبرت ناک
باب کا آغاز ہوا۔ کوتوالی کے سامنے ٹلکیاں نصب کر دی گئیں۔ لوگوں پر بے رحمی سے کوڑے
برسائے جانے لگے۔ دھڑا دھڑا گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ وہیں عدالت لگتی اور سزا سنادی
جاتی۔ کسی کو چھانسی اور کسی کو عبور دریائے ستلج کتنے ہی آنا دی پسند جیائے مسلمان
جوانوں کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔ یا انہیں کانے پانی عمر قید کے لئے بھیج دیا گیا۔ کوڑیاں ڈالنے
کھوہ کے محلے میں انگریزوں نے لیڈی کے قتل کا پورا پورا بدلہ لیا۔ گلی والوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ
گھٹنوں کے بل چل کر گھروں سے باہر نکلیں اور واپس گھروں کو جائیں۔ ایک روز
ڈھنڈورا پھر گیا کہ آج جنرل ڈائر شہر کی گشت کریں گے۔ تمام لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ
جنرل صاحب کو اٹھ کر سلام کریں۔ جب ڈائر ہمارے محلے کٹرہ میاں سنگھ میں آیا تو صدیق
قصائی گوشت کاٹنے میں لگا تھا۔ اُس نے سلام نہ کیا۔ اچانک مالٹ کی آواز آئی۔
ایک سپاہی نے زور سے صدیق کو ہنڑ مارا۔ صدیق نے وہی ہنڑ کھینچ کر سپاہی کے
منہ پر دے مارا۔ پھر کیا تھا۔ فوراً اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ صدیق کو بھی
کانے پانی بھیج دیا گیا ہے۔ بڑے بڑے کڑیل جوان اور ماؤں کے سونے نعل چھانسی
چڑھا دیئے گئے۔ شفو کے ماتھے میں ابھی شادی کی مہندی بھی پھینکی نہ پڑی تھی کہ اُس
کی لاش گھر آگئی۔ اُس کا گھر گلی فراسیاں میں تھا۔ مائی بھری بیوہ کے رٹنے کو جلے ہیں

ہی گولی لگی تھی۔ بعد میں جب حکومت نے اُسے بھی کچھ روپے بطور معاوضہ دیئے تو
مائی نے اس رقم سے گھی منڈی والے قبرستان کے نالوں کی ٹپیاں کپی کر وادیں۔
والد صاحب چائے پیتے لگے اور مجھے گھی منڈی والا قبرستان یاد آ گیا جو امردوروں
کے باغوں میں گھرا ہوا تھا اور جس کے ارد گرد نہروں میں سے کاٹے ہوئے نالے بہتے
تھے۔ ان کی کپی پیوں پر بیٹھ کر ہم باغ میں سے توڑے ہوئے کچے کپے امرود کھایا کرتے
تھے۔ عید بقر عید کو منہ اندھیرے ہم یہاں اپنے آباد اجداد کی قبروں پر چاول اور گلاب
کے پھول نچھاور کرنے آتے۔ اگر بقیان سلگائی جاتیں۔ یہاں وہاں جلتی موم بتیوں کی روشنی
میں قرآن شریف پڑھنے کی آوازیں آیا کرتیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اب ان قبروں کو ڈھا کر ہندو
سکھوں نے وہاں مکان بنالینے ہیں۔ کیا ہم اپنے اجداد کی روجوں کو کفار کے بوجھ سے
آزاد نہ کرائیں گے؟ کیا مسجد قاصداں، مسجد خیر الدین اور مسجد جان محمد کے میناروں میں
کبھی اذان نہ گونجے گی؟ ہمیں خدا کے گھروں میں رکھے ہوئے بتوں کو پاشش
پاشش کرنا ہے۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

صنم کہہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

میری آنکھوں میں اقبال کی ایک تصویر آگئی کہ وہ مسجد قرطبہ کے گنبد سے
ستونوں کے درمیان نماز پڑھ رہا ہے اور میں امرتسر کی ویران مسجدوں سے نکل
کر غرناطہ و قرطبہ کے مسلمان بادشاہوں کے اجرے ہوئے محلات میں نکل گیا۔
اور اباجی کہہ رہے تھے۔

— اب کانگریس اور مسلم لیگ دو الگ جماعتیں بن چکی تھیں۔ مسلمانوں پر

ہندوؤں کی فریب کاری کھل گئی تھی۔ غالباً ۲۲-۱۹۲۱ء میں گول باغ میں لیگ کا جلسہ
ہوا۔ متنبو قناتیں تن گئیں۔ اسی میدان میں ساتھ ہی کانگریس کا سالانہ جلسہ بھی ہوا۔
نہرو، گاندھی، اور تلک آئے۔ ابوالکلام آزاد بھی ساتھ تھے۔ دوسری طرف محمد علی جناح
(قائد اعظم) بھی آئے۔ انہوں نے ترکی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ میں بھی لیگ کے جلسے میں

گیا۔ امرتسر میں لیگ کا بڑا زور تھا۔ قائد اعظم نے انگریزی میں تقریر کی۔ لیگ بابو نے میرا گزرتہ تہینہ دیکھ کر پوچھا۔

”تم کیا انگریزی سمجھ لیتے ہو جو یوں جم کر بیٹھے ہو؟“
میں نے کہا۔

”میں جناح صاحب (قائد اعظم) کی تقریر سننے آیا ہوں۔“
وہ بابو بڑا خوش ہوا اور مجھے قائد اعظم کی تقریر کا ایک ایک لفظ سمجھاتا رہا۔
میں نے پوچھا۔

”قائد اعظم نے کیا فرمایا تھا؟“
اب ٹھیک طرح یاد نہیں۔ ان کی تقریر کا مطلب یہی تھا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو انگریز کی غلامی سے نکال کر اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں جسے مسلمان کبھی گوارا نہیں کریں گے۔

”پھر کیا ہوا؟“
”پھر یہی ہوا کہ جیاناوالہ باغ میں مسلمان شہیدوں کا بہایا ہوا خون رنگ لایا۔ پاکستان بن گیا اور امرتسر میں جو کشت و خون کا بازار گرم ہوا اس سے تم سب نوجوانوں واقف ہی ہو۔ ہم نے بڑی قربانیاں دے کر پاکستان حاصل کیا ہے۔ اب اس ملک کو طاقت ور بنانا اور قائم و دائم رکھنا تم لوگوں کا کام ہے۔“
میں نے کہا۔

”ابا جی! پاکستان کی طاقت اور اس کے دوام کا ثبوت دشمنوں کو ۶ ستمبر ۶۵ کو مل چکا ہے۔ آپ فکر نہ کریں اور اگر کبھی پھر امتحان کا وقت آیا تو ہم اس سے کبھی بہتر ثبوت جہیا کریں گے۔“
”انشاء اللہ“

والد صاحب نے پیالی میز پر رکھ دی اور میری نظر کارنس پر رکھے گلاب کے پھولوں سے ہوتی کھلی کھڑکی میں سے باہر نکل گئی جہاں مغل پورہ، واگہ، اور امرتسر

جانے والی ریلوے لائن سورج کی سنہری دھوپ میں چمک رہی تھی۔ اب میرے کانوں میں امرتسر کی ویران مسجدوں کی فلک شکات اذانیں گونجنے لگیں اور انجن پارک میں گونجنے ہوئے ”پاکستان زندہ باد“ کے نعروں کی آوازیں سنائی دیں اور میں نے اقبال کو قرطبہ کے دریا وادابکیر کے کنارے گہری سوچ میں گم گھڑے دیکھا۔

اب روانہ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

گھنے جنگلوں کو جاتے پُرانے راستے ہیں۔ سیاروں کے افق سے طلوع ہوتے سیارے ہیں اور
سورجوں کے ساتھ ساتھ سیر کرتے سورج ہیں اور ان تحریروں میں نشانیاں ہیں۔ روشن اور تابناک
نشانیاں۔۔۔۔۔

کمرے کی فضا میں اعلیٰ انگلش تبا کو اور اعلیٰ چلنی چائے کی خوشبو نے مل کر ایک تیسری
خوشبو کو بیدار کر دیا ہے۔ یہ خوشبو ہے اعلیٰ خیالات، پُر حلال فکر اور پُر شکوہ تصورات کی۔ قرطبہ
کی ویران مسجدوں کو تکتی، بہرت زردہ اُندلسی شہزادوں کی آنکھیں اور ان مسجدوں کے بے اذان،
مناروں کے عقب سے طلوع ہوتا آتشیں، غضب ناک آفتاب۔ بے سجدہ خرابوں نیچے ٹھہرتے
سنگ مرمر میں سجدوں کے دہکتے نشان۔ مفتوح محلات کی شاہی خواب گاہوں میں شہنشاہوں کے
لاٹے، لعل و جواہر زمرہ و عقیق سے محروم نیچے ہوئے تاج، بے تاج اُموی حکمرانوں کی ڈوبتے کُوج
کو گھورتی آنکھیں اور ٹوٹی تلواریں کے قبضوں پر جسے ہوئے خون آلود پنچے۔ قرطبہ! ہم پھر آئیں گے۔
غرناطہ ہم پھر آئیں گے۔ ہم اپنی اذانوں کو تیرے مناروں میں اور اپنے سجدوں کو تیری خرابوں میں بطور
امانت چھوڑے جا رہے ہیں۔ ہم تجھ سے اپنی امانتیں واپس لینے ایک دن ضرور آئیں گے۔ ہم دیوار گریہ
کے ساتھ لگ کر نہیں روئیں گے۔ ہم اپنی خامیوں کے داغ بھرہ روم کے پانیوں میں دھوئیں گے۔ ہم
اور اپنی عظمتوں کے یا قوت ابھرتے سورج کی روشنیوں میں چمکائیں گے۔ ہم تیرے حجر کے باغات میں
کھلے ہوئے سیاہ گلابوں کو سینے سے لگا کر رکھیں گے اور تو ہماری بخشی ہوئی عظمتوں کو فراموش نہ کرنا۔
ہماری مسجد قرطبہ کے گنبد پر سورج کی کرنوں کو چمکاتے رہنا۔ ہمارے غرناطہ کی وادیوں میں سر و شاد
سے درختوں کی آبیاری کرتے رہنا اور ہمارے حجر کے باغوں میں سیاہ گلاب کے شگوفے کھلاتے
رہنا۔ ہم آج تجھے الوداع کہتے ہوئے تیری مسجدوں، تیرے باغوں، تیری وادیوں اور تیرے
دردیاؤں سے سو رہے ہیں اور کل تو ہم فاتحین کو خوش آمدید کہنے کے لیے فیصل شہر کے باہر اپنی
سرزمین کے بہترین تماثلے لیے کھڑا ہو گا۔ الوداع! الوداع! خوش آمدید! خوش آمدید!

ایک آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ ایک ماہتاب طلوع ہو رہا ہے۔ یہ ماہتاب اُمی
آفتاب کے نور سے منور ہے۔ ہمارے تخت و تاج سے لوٹا ہوا سونا ہمیں دور سے دکھایا ہے
اُداس اور غمگین چاند کی اُداس روشنی میں مجھے غرناطہ کے کھنڈر اور ان کھنڈروں کے اُڑے باغوں

امرتسر کا کمپنی باغ

میں نے ابھی ابھی وائٹ جیمن چائے کی ایک پیالی پی ہے اور امرتسر کے کمپنی باغ پر مضمون
لکھنے بیٹھا ہوں۔ اس چلنی چائے کی خوشبو میرے ہر سانس کے ساتھ کمرے میں پھیلنے لگی ہے۔ میرا
دل چبیلی کا سفید پھول بن کر میرے سینے میں دھڑک رہا ہے اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے گویا
میں قلم سے نہیں گلاب کی ٹہنی سے یہ مضمون لکھ رہا ہوں کاغذ کے تختے پر گلاب کی ٹہنی بہا کی ہول کے
ساتھ ساتھ چل رہی ہے اور سطروں کی شاخوں پر یادوں کے شگوفے بن کر کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ کمپنی
باغ پر کچھ لکھتے ہوئے وائٹ جیمن چائے کی ایک پیالی بڑی ضروری تھی۔ یہ کمپنی چائے میرا ایک
دوست چین سے لایا تھا۔ جب میں نے پہلی بار لیمن یلو کر کے اس گول ڈبے کو کھول کر سونگھا تو
میری آنکھیں اس کی خواب آلود خوشبو کے سحر سے خود بخود بند ہو گئیں اور مجھے یوں لگا جیسے میں صبح کی شبنمی
ہوا بن کر کمپنی باغ کے درختوں میں سے گزر رہا ہوں کمپنی باغ کے ہر درخت میں وائٹ جیمن چائے
کی مہک تھی اور اُس کی روشنیوں کی گھاس میں جھگی گلاب اور بنفشے کے پھول کھلا کرتے تھے میں نے
آنکھیں کھول کر ڈبے میں چلنی چائے سیاہی مائل سبز خشک پتیوں کو دیکھا تو مجھے وہ خشک پتے
یاد آ گئے جو شروع سردیوں کی ہلکی بارش میں کمپنی باغ کے درختوں پر سے گرا کرتے تھے۔

ڈن بل کی دھیمی انگلش مہک والا سگریٹ الیش ٹرے میں سگ رہا ہے۔ کھڑکی سے باہر
ڈوبتے سورج کی سرخ کرنیں سفیدے کی ٹہنیوں کو چوم کر پیچھے سمٹتی جا رہی ہیں۔ سبز پتوں کے بیج
میں نیلے آسمان پر شام کی سنہری انگلیاں رات کی تحریر لکھتی نظر آرہی ہیں۔ یہ تحریر پُر اسرار ہے،
سحر زدہ ہے۔ اس میں وقت کے اہراموں میں سوئی ہوئی شہزادیوں کی سرگوشیاں ہیں، غلاموں
کے بیکراں سناٹوں میں اپنی طروت بلانے والی آوازیں ہیں۔ سامنے آکر چھپ جانے والی شکلیں ہیں

میں کپنی باغ کے درخت سر جھکائے نظر آرہے ہیں۔

کپنی باغ — میرے غرناطہ کا الحما! جس کی روشنوں پر میرے قدموں کے نشان سو رہے ہیں۔ جس کے درختوں پر میری محبتوں کے نام لکھے ہیں۔ جس کی برساتوں میں کوئیں آج بھی میری یاد میں نوحہ کٹاں ہیں اور جس کی بہاروں میں آلوپے کے پھول شاخوں پر کھلے میری راہ دیکھتے ہیں اور شاداب نہروں کا پانی آج بھی میرا نام لے کر اپنے کناروں کو چوم کر گزرتا ہے۔ کپنی باغ کی مشک بار ہوائیں میرے سانس میں ہیں۔ اس کے پھولوں کی خوشبو میرے خون میں ہے۔ امرتسری جب میں نے آنکھ کھولی تو میرے اوپر کپنی باغ کے پرکھٹس کے درختوں کا سایہ تھا۔ جب میں نے چلنا سیکھا تو میرے پاؤں تلے کپنی باغ کی گھاس تھی اور جب میری پہلی محبت مجھے چھوڑ کر ڈول میں سوار ہو کر اپنے گھر چلی گئی تو اس باغ کے خشک پتے میرے آنسوؤں کے ساتھ زمیں پر گرتے تھے۔ اس کی سردیوں کی ستھری دھوپ، اس کی برساتوں میں گھنے درختوں سے ٹپ ٹپ گرتی جامیں اور اس کی تپتی دوپہروں میں باغوں سے آتی گلاب کی گرم خوشبو اور نہر کنارے اُگی ہوئی بھگ کی جھاڑیوں کی تیز مہک اور ٹھنڈی کھوئی کا رخ پانی اور اس میں پیسے ناشپاتی کے پھولوں سے ٹپکتی شبنم — کپنی باغ کو میں کس طرف سے لکھنا شروع کروں؟ اس کتاب کا کون سا صفحہ پہلے کھولوں؟ یادوں کے اس ویران شہر میں کس دروازے سے قدم رکھوں؟ کون سے درخت پر سب سے پہلے اپنی محبت کا نام پڑھوں؟ اس زندہ شوہر کی بیوہ کو کس نام سے پکاروں؟

اگر ہم ہال دروازے کی طرف سے کپنی باغ میں داخل ہوں تو ہمیں انجن پارک کے ساتھ ساتھ ریلوے پل کی چڑھائی چڑھنی ہوگی۔ انجن پارک جہاں میں نے سب سے پہلے مسلم لیگ کے جلسے میں راہب محمود آباد کی تقریر سنی اور پاکستان زندہ باد کے نعرے سنے۔ جہاں ہندو سبھا کالج اور ایم او کالج کے درمیان کرکٹ کے زبردست میچ ہوا کرتے اور مرقت حسین کی باؤلنگ پر ہمارے دینیات کے استاد ایشی پڑھ پڑھ کر چوہکیں مارا کرتے تھے۔ آج اس انجن پارک میں میوہ منڈی بن گئی ہے۔ چاروں طرف بوسیدہ کھوکھے ہی کھوکھے لگے ہیں اور گے سڑے پھولوں کا بیوہ پار ہوتا ہے اب نہ وہ انجن ہے اور نہ پارک — ریلوے پل کی اترنی اتریں تو ایک جانب کرشل ہوٹل اور دوسری جانب وکٹوریہ جوہلی ہسپتال کا دروازہ۔ یہی وہ کرشل ہوٹل ہے جہاں میں نے اردو کی

ڈکشنری بیچ کر اپنی محبوبہ کو اس کریم کھلائی تھی۔ اب سامنے کپنی باغ ہے۔ ایک چھوٹی سی سڑک ہسپتال کی دیوار کے ساتھ ساتھ شریف پورے کو نکل جاتی ہے۔ ایک سڑک ہسپتال کی دیوار کے ساتھ ساتھ شریف پورے کو نکل جاتی ہے۔ ایک سڑک دائیں ہاتھ پر الیگزینڈرا گراؤنڈ کو چھوڑ کر سیدھی مجھے روڈ کی طرف نکل جاتی ہے۔ ارد گرد پھولوں کے تختے ہیں جگہ جگہ امتاس کے درخت اپنے زرد پھولوں کے گچھے لٹکائے ہوا میں جھوم رہے ہیں۔ ذرا آگے جا کر پرانے وقتوں کی بنی ہوئی ایک بارہوی ہے جس کے بیچ میں سبز پانی کا حوض ہے یہاں سے گھنے درختوں میں گھرا ہوا کچا راستہ ٹھنڈی کھوئی کے سامنے والی گراؤنڈ کو نکل جاتا ہے۔ اس راستے میں تناور درختوں کے تنے کھود کر بیٹھنے کو گڑی نما جگہیں بنادی گئی ہیں۔ بائیں ہاتھ کو پختہ روشنوں کے بیچ میں فوارے لگے ہیں جو دور باغ کی مشرقی جانب کے تختوں کو چلے گئے ہیں۔

اگر ہم رام باغ دروازے کی جانب سے کپنی باغ کو چلیں تو ہمارے بائیں ہاتھ پہلے ہندو پان والوں کی دکانیں آتی ہیں جو پان میں ناریل کی گری، خشکاش، چینی اور خدا جلتے کیا کیا ملا کر کھلاتے ہیں۔ دکان میں گنیش اور کرشن کی تصویریں سجی ہیں جن کے سامنے ہر وقت لوبان سلگتا رہتا ہے۔ ایک طرف دھو تو والا گراموفون رکھا ہے، پاس ہی ریکارڈوں کا انبار لگا ہے۔ سونے کے دانت والا ایک لہلہا سا ہندو آدمی بڑے زور سے گراموفون کو چابی دیتا ہے۔ مٹین چلاتا ہے اور ساؤنڈ بکس کی سٹوئی گھومتے ریکارڈ پر رکھ دیتا ہے اور پھر دھو تو میں سے کسی عورت کی تیز اور تنگی آواز بلند ہوتی ہے۔

چرا کرے گیا قالم میری زنجیر سونے کی۔
کبھی اسے کاش لیلے کے گے کا بار ہو جاتا۔
ابر ہے، ساقی ہے، نے ہے، جام ہے۔
دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنائے۔

یاد دل سے باز آجایا دل نواز ہو جا۔
کبھی اختر بیانی فیض آبادی، کبھی کمال جھریا، کبھی اندو بالا، کبھی بھائی جھیل پٹیا لے والا اور کبھی کتن غاں کی آوازیں ہمارا دُور تک تعاقب کرتی ہیں اور ہم سیدھے ہاتھ پر عشق بیچاں کی بیل میں چھپنے ہوئے گر جا گھر کو پیچھے چھوڑتے جی ٹی روڈ کو عبور کرتے ہیں۔ اب ہمارے ایک طرف

ڈاکٹر سوہن سنگھ کا آنکھوں کا ہسپتال ہے اور دوسری طرف عید گاہ کی دیوار۔ ایک خرابی ڈیڑھ سی می سے دروازہ عید گاہ کو جاتا ہے۔ کائی لگے حوض کے سبز پانی میں گرے پڑے پتے اور سنہری مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ جامنوں کے گتے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ حوض کی پرانی روشوں پر کالی سیاہ موٹی موٹی جامیں گری پڑی ہیں۔ ہم برسات کے مینہ میں بیٹھتے۔ سونیاں شپشپاتے غالی ٹیکریں پہنے، دوڑیں لگاتے یہاں آتے۔ فوب جامیں کھاتے۔ نیکر کی جلیبی بھرتے اور شور مچاتے کپنی باغ کے کچے پکے امرودوں پر حملہ کرنے بھاگ جاتے۔ اب ریل کا پھاٹک عبور کرتے ہیں تو بائیں ماتھے پر اسی دکھنورہ جو بلی ہسپتال کا مشرقی دروازہ ہے اور سامنے کپنی باغ ہے۔ یہ کپنی باغ کا سب سے پرانا دروازہ ہے مغلیہ طرز کی ایک کشادہ ڈیڑھ سی می جس کے اوپر پڑانے اندھیرے کمروں میں کپنی باغ سے متعلق دفتر ہے عمارت کی پیشانی پر ایک بارہ دری ہے جس کا اٹھارہ پھول دار بیلوں نے چھپا رکھا ہے ڈیڑھ سی کی فصانیم روشن اور ٹھنڈی ہے سامنے کپنی باغ کے ہرے بھرے دھوپ میں چلتے ہواؤں میں جھومتے درخت نظر آ رہے ہیں۔ ڈارمی سے باہر نکلیں تو کونے میں ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی باٹل ہے جس پر بکافلی کا گھٹنا درخت سایہ کیے ہوئے ہے۔ باؤلی کاشفات پانی اچھل اچھل کر چھوٹے نالے میں بہتا باغ کی اُس جانب جا رہا ہے جدھر لوکاٹ کے درختوں کے جھنڈ کھڑے ہیں۔ اب ہم کپنی باغ کی بڑی اور سب سے پرانی سڑک پر جا رہے ہیں سیدھے ماتھے پر جامن کے پرانے درخت ہیں اور دوسری طرف آٹے کے درختوں کی قطار چلی گئی ہے۔ بیچ میں کہیں کہیں چوڑے پتوں والے بھیرے کے پیڑ بھی ہیں۔ سامنے پھر ایک پرانی مغلیہ طرز کی عمارت کھڑی ہے جس کے مشرقی اور مغربی پہلوؤں میں سنگ مرمر کے حوض ہیں اور ان میں سرخ مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ کہتے ہیں اس عمارت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اگر آرام کیا کرتا تھا۔ اب یہاں امرتسر میں نسل کپنی نے ایک لائبریری بنادی ہے۔ باغ کی سیر کرتے کہیں میں اندر چلا جاتا تو نحراب دار چھتوں والے ٹھنڈے ٹھنڈے کمرے میں ایک بڑی سی گول میز پر کچھ اخبار پڑے ہوتے اور کسی کونے میں کوئی بوڑھا لالہ یا ادھیڑ عمر کا مسلمان مطالعے میں غور ہوتا۔ دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں اس جگہ ایک لوکل ریڈیو سٹیشن بنادیا گیا تھا جو کپنی باغ میں جگہ جگہ لاؤڈ سپیکروں پر جرموں کے غلغلے تقریریں سنایا کرتا اور کہیں کوئی شوقیہ فن کار ایک آدھ گیت بھی گاتا۔ شام کو یہاں سے فلمی گانے

نشر ہوا کرتے۔ اُن دنوں امرتسر میں فلم انمول گھڑی بڑے زوروں پر چل رہی تھی، چنانچہ کپنی باغ کے لاؤڈ سپیکروں پر نور جہاں کے گانے نشر ہوا کرتے۔ ایک روز میں بھی یہاں سے سہگل کا ایک گیت گایا تھا۔ اُن گے دونوں طرف ہرے بھرے گھاس کے میدان ہیں جہاں جگہ جگہ پھولوں کے تھتے ہیں۔ سامنے ٹھنڈی کھوئی ہے جس کا پانی گرمیوں میں برف سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا تھا۔ کنوئیں کی ایک جانب ہندو پانی پلاتے والا بیٹھا اور دوسری جانب مسلمان — پانی دونوں جانب ایک ہی ہوتا تھا۔ اگر ہم مسلم مائی سکول یعنی شریف پورے والے پھاٹک سے کپنی باغ میں داخل ہوں تو سامنے بھائیوں والی نہر کا چھوٹا ٹپل اُٹتا ہے۔ اس ٹپل پر سے ہم نہر میں چھلانگیں لگایا کرتے تھے اس کے کنارے ٹپل کے پاس ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اور نہر کا پاٹ چوڑا ہو گیا تھا۔ یہاں پانی کی تہہ میں چھوٹے چھوٹے روڑے بہت ہوا کرتے تھے اور چھلانگیں لگاتے ہوئے اکثر ہمارے گھٹنے چھل جاتے۔ یہ نہر کپنی باغ کو جاتی ہے۔ اس کی ایک جانب امرودوں کے وسیع باغ ہیں اور دوسری جانب کنارے کے ساتھ ساتھ کھٹیوں کی قطار چلی گئی ہے۔ امرودوں کے باغ میں ہم ایم اے اور سکول سے بھاگ کر پناہ لیا کرتے تھے۔ ساری دوپہر ہم باغوں میں آوارہ گردی کرتے رہتے اور کچے امرود توڑ کر کھاتے۔ جب امرود پک جاتے تو باغ میں رکھوالوں کی ہو ہو کی آوازیں آنے لگتی۔ پھر ہم نہر کی پرلی جانب شہنشاہ ڈالیموں پر آویزوں کی طرح لٹک رہے ہوتے اور پھر کی گرم فصائی میں اُن کی میٹھی خوشبو چھی ہوتی تھی۔

یہاں ایک کوٹھی کے برآمدے میں ستون کے ساتھ عشق پیچاں کی بیل چڑھی تھی جس کے کانہ پھولوں کے سامنے میں ایک ہندو لڑکی کرسی پر بیٹھی کہیں کتاب پڑھا کرتی اور کہیں سوئیٹر بنا کرتی۔ میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھا۔ میں اس لڑکی سے عشق کرنے لگا بچپن اور بڑھاپے کا عشق بڑا ظالم ہوتا ہے۔ لڑکی دبلی تیلی اور بادامی رنگ کی تھی۔ ماتھے پر سرخ بندیا لگی ہوتی میں اسکول سے بھاگ بھاگ کر اُسے دیکھنے آتا۔ وہ مجھ سے بڑی تھی۔ ایک روز اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور میرے سر کے بالوں میں اپنی نازک انگلیاں پھرتے ہوئے پوچھا کہ میں نہر کنارے بیٹھا اُسے کیوں دیکھتا رہتا ہوں۔ میرے آنسو نکل آئے۔ وہ جلدی سے اندر گئی اور کانسی کی تھالی میں دو لڈوے آئی۔ اُس نے مجھے لڈو کھلائے اور میرا کان اُہستہ سے کھینچ کر کہا

”خبردار جو تم پھر اسکول سے بھاگے“

مگر میرے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ میں ہر روز وہاں جا کر اس لڑکی کے درشن ضرور کرتا۔ ایک روز میں درختوں سے پکے پکے امرود توڑ کر اس کے لیے لے گیا۔ اس نے امرود لے لیے اور ہنس کر بولی۔

تمہیں رکھوا لے نے نہیں پکڑا؟

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اُسے دیکھتا رہا۔ مجھے آج بھی اس کے ماتھے کی سُرخی بندیا اور سفید خوبصورت دانت یاد ہیں۔ اُس نے کاسنی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ ہنس کر کہنے لگی:

”ہم تو جا رہے ہیں۔۔۔۔۔“

اس اثنا میں اندر سے کسی مرد نے اُسے بلایا اور وہ ”اُئی بھاپا جی“ کہہ کر اندر چلی گئی۔ وہ دوبارہ باہر نہ آئی۔ میں اٹھ کر آنکھوں میں آنسو لیے کمپنی باغ کی طرف چل دیا۔ اگلے روز اس کوٹھی پر تالا پڑا تھا اور ہفتے بعد دوسرے لوگ وہاں آن بسے۔ اس کے بعد میں نے اُس ہندو لڑکی کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اب بھی جب کبھی میں سُرخی انگور یا قمری شہتوت دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے کانوں میں ٹپکتے آویزے یاد آجاتے ہیں۔ خدا جانے آج وہ لڑکی کہاں ہوگی، اگر وہ زندہ ہے تو اس کا بیاہ ہو چکا ہوگا۔ بچے ہوں گے، پتی ہوگا، اُسے یاد بھی نہیں رہا ہوگا کہ کبھی ایک لڑکا نہر کنارے شہتوت کے پیر تلے کھڑا اس کے برآمدے میں نکلنے کا انتظار کیا کرتا تھا۔ وقت نے اس کی نوعمری کی یادوں کو محو کر دیا ہوگا، لیکن میرے حافظے کی لوح پر یادوں کے نقوش وقت کے ساتھ ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس مٹی میں بوئے ہوئے بیج اب تناور گھنے درخت بن کر میری محبتوں کے پُرانے راستوں پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ ان درختوں کی چھاؤں میں کہیں موتیے کے جھاڑ ہیں اور کہیں جنگلی گلاب کھلے ہیں۔ زندگی کے ایسے پر جب آخری ایکٹ کا پردہ گرے گا تو میں واپس موتیے کی خوشبوؤں سے جھپکتے ہوئے اپنی محبتوں کے ان پُرانے راستوں میں نکل جاؤں گا، لیکن گم شدہ محبتوں کے خواب آلود جنگلوں میں نکلنے سے پہلے میں آپ کو کمپنی باغ کی سیر ضرور کرانا۔ آئیے اب تحصیل پورے کی طرف سے کمپنی باغ میں داخل ہوتے ہیں۔

دروازہ مہاں سنگھ سے نکل کر جی ٹی روڈ عبور کرتے ہیں تو ایک طرف تحصیل کا دفتر ہے

اور سامنے کونے والی گھنی بیر کی تلے مائی کا کچا مکان ہے۔ اس بیر کی میں بڑے میٹھے لال لال بیر لگتے تھے۔ ہم ڈھیلے مار کر بیر گراتے تو مائی لاٹھی لے کر گالیاں دیتی اندر سے باہر نکل آتی اور ہم مائی کا منہ چڑاتے ایک ٹانگ پر ناچتے، ہنستے شور مچاتے نہر کی جانب بھاگ جاتے۔ مائی کی بیر کی سے ذرا آگے ایک طرف ہندو سکھوں کے مکان اور دوسری جانب لوکاٹ کے باغ شروع ہو جاتے ہیں۔ ہندو سکھوں کے مکانوں کے درمیان ایک چھتر ہوا کنواں ہے۔ اب ایک کچی پگڈنڈی لوکاٹ کے باغوں کے بیچ میں سے ریوے لائن کو جاتی ہے۔ اس پگڈنڈی پر کھٹے اور لمبوں کی ٹہنیوں پر سفید پھول کھلتے ہیں تو سارا راستہ خوشبو سے نہک جاتا ہے۔ صبح صبح سیر کرتے ہوئے جب میں اس چھتی ہوئی کچی پگڈنڈی پر سے گزرتا تو خوشبوئیں مجھے چاروں طرف سے لپیٹ لیتی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں کسی پھول میں سے گزر رہا ہوں۔ لوکاٹ کے باغ میں رسیاں بٹنے والے اپنے نکلے رنگائے کام میں مصروف ہوتے۔ درختوں پر کیسری رنگ کی لوکاٹوں کے گچے ٹپکتے ہوئے۔ اب ریوے لائن سامنے ہے۔ لیون کی جھاڑیوں میں اس کی چمکتی ہوئی پٹری نظر آنے لگی ہے۔ ریوے لائن کے پار مقبول پورے کی مسجد کے سفید مینار صبح کی سنہری دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ سیر سے واپسی پر کبھی کبھی میں اپنے دوستوں کے ساتھ ورزش کرتے کے بعد اس چھوٹی سی مسجد کے سقاوے میں نہایا کرتا تھا۔ ہم نہر کی طرف سے پھلا ہی کی مسواکیں کرتے ہوئے یہاں آتے۔ دھوتیوں کے پتو دانتوں میں داب کر لگوٹ باندھ بدن پر تیل مٹتے۔ ناخ کی اوپر کوٹھی چھیری ٹہنیوں والے درختوں کے پاس ڈنٹر لگاتے۔ کنوئیں سے بو کے نکال نکال کر سقاوے میں پانی بھرتے اور سقاوے کے اندر ٹونٹی میں پھنسی ہوئی لکڑی یا مسواک نکال کر ٹھنڈے پانی کی موٹی دھار کے نیچے بیٹھ جاتے۔ مسجد کے باہر کیا یوں میں کیسری رنگ کے گیندے پھول کھلے ہوتے تھے۔ شریف پورے کے سامنے والی بیر آبادی خالص مسلمانوں کی آبادی تھی۔ ۱۱ اگست کے بعد یہ لوگ بھی شریف پورے میں آگئے تھے۔ یہاں آگے جا کر ایک نسبتاً کشادہ جگہ آبادی ہے۔ یہاں درختوں کے سائے اس قدر گھنے تھے کہ آسمان نظر نہیں آتا تھا۔ اس جگہ ایک دیران، کنواں بھی تھا جس میں ایک بار میری چپل گر گئی تھی۔

اب کمپنی باغ کو جاتی نہر کی طرف سے ٹھنڈی ہوائ آنے لگی ہے۔ اس ہوا میں مرطوب جھاڑیوں کی بو ہے۔ اس نہر پر آم کے درختوں کی بو ہے۔ اس نہر پر آم کے درختوں کی چھاؤں ہے۔ یہ چھوٹی نہر ہے۔ اس نہر پر آم کے درختوں

کی چھاؤں ہے۔ یہ چھوٹی نہر ہے یہاں سے مشرق کو ایک فرلانگ کے فاصلے پر دو موٹھی ٹھوکر ہے
یہاں ایک مندر ہے جس کے صحن میں ہندو فسادات کے دنوں سے کچھ پہلے دندیش کیا کرتے
تھے۔ نہر کے پار گاؤں کی آبادی ہے۔ یہ گاؤں مسلمانوں کا ہے کہیں کہیں نیم اور دھربیک
کے درختوں میں مسجدوں کے مینار نظر آ رہے ہیں۔ فسادات میں اس گاؤں کی اکثر آبادی شہید کر دی
گئی تھی۔ یہاں ایک باری صبح سیر کرتے گزرتا تو گاؤں میں شادی کی ڈھولک بج رہی تھی اور لڑکیاں
ڈھولک کی تال پر گار ہی تھیں۔

تینوں سفنا ہو جان گیاں
بابل دیاں گلیاں نی
تجھے اپنے بابل کی گلیاں
خواب ہو جائیں گی۔۔۔۔۔

میں لوکاٹ کے گھنے باغ کو جانے والی چھوٹی سی ندی کی پلٹا پر بیٹھ گیا اور دیہاتی لڑکیوں کا درد
بھرا الوداعی گیت سننے لگا۔ میرے قریب ہی زرد لوکاٹوں کا ایک گچھا اپنی ٹہنی کو جھکائے ندی کے پانی
کو چھونے کی کوشش کرتا رہا تھا اور ٹیالا پانی مٹھی مٹھی لہروں کی صورت میں گزرتا چلا جا رہا تھا۔
گیت کے بول صبح کی شبی ہو میں کبھی قریب آجاتے اور کبھی دور چلے جاتے خدا جانے ان لڑکیوں
میں سے کسی کو پاکستان کی سرحد تک پہنچنا نصیب ہوا ہو گا یا نہیں! انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ جو کچھ
گار ہی ہیں وہ ایک دن پچ ہو جائے گا اور انہیں بابل کی پیاری گلیاں بابل کا شفقت بھرا پیارا چہرہ
خواب ہو جائے گا۔ میں نے لاہور آکر سنا کہ اس گاؤں پر ہندوؤں اور سکھوں نے حملہ کر کے بے شمار
مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا مجھے وہ لڑکیاں یاد آ گئیں جو اپنی سہیلی کو دلہن بنا کر ڈھولک کی تھاپ پر
اپنی بھولی بھالی آواز میں گار ہی تھیں۔

تینوں سفنا ہو جان گیاں
بابل دیاں گلیاں نی

اب ہم نہر کے ساتھ ساتھ چلتے کہیں باغ میں آگئے ہیں۔ یہ نہر اب کہیں باغ کے بیچ
میں سے گزرتی ہے۔ یہاں ایک کنارے پر آم کے درخت جھکے ہوئے ہیں اور دوسرے کنارے

پر دور تک ناشپاتی کا باغ پھیلا ہوا ہے۔ ہم اکثر نہر پار کر کے اس باغ میں گھس جاتے۔ درختوں سے
بگو گھسے توڑ توڑ کر ٹیکر کی جیبوں میں بھرتے اور نہر میں کود کر ٹھنڈی کھوٹی کی طرف بھاگ جایا کرتے تھے
اسی نہر کے پاس لاہور کے گلستانِ فاطمہ کی طرز کا ایک بڑا ہی خوبصورت پلاٹ تھا۔ یہاں گلاب،
گیندا اور طرح طرح کے اعلیٰ قسم کے پھولوں کے تختے تھے۔ جگہ جگہ سنگ مرمر کے بنچے رکھے تھے جن
کے پاس مور پنکھ کے پودے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ پہلو میں ناشپاتی کا باغ تھا جس کے
درخت بہار کے موسم میں سفید اور گلابی پھولوں سے بھر جاتے۔ انہی پھولوں میں، میں اپنی پہلی
محبت سے آخری بار جدا ہوا تھا۔ وہ سواری برقعے کا نقاب لٹے گھاس پر نظریں جھکائے بیٹھی اور میں
سلی قمیض، کلکتے کی چارخانہ دھوٹی اور سلیر پہنے اس کے پاس بیٹھا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے اور
پاسنگ شو کا سگریٹ میری انگلیوں میں سٹک رہا تھا۔ ہوا کا جھونکا آتا تو کچھ سفید اور گلابی پھول ٹوٹ
کر ہم پر گر پڑتے۔ اس کی ناک میں سرخ رنگ دمک رہا تھا۔ سفید گالوں میں کشمیری سیب کی لالی
تھی۔ لپ بٹک سے بے نیاز گلابی ہونٹوں کے اوپر پسینے کے موتی جھللا رہے تھے اور اس
کے کپڑوں میں سے سرخ جٹا کی گرم، پڑا سرا، سحر خیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ طوطوں کا ایک جھنڈ شور
مچاتا ہوا ہمارے اوپر سے گزر گیا۔ میں نے راجہ کا ہاتھ آہستہ سے چھویا۔ جس طرح شام کی ہوا گیندے
کے پھول چوم کر گزر جاتی ہے۔ راجہ سمٹ سی گئی اور پھر جب اُس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا تو اس
کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خوشبو، گیندے کے پھول، ناشپاتی کے گلابی شگونے تھے۔ راجہ کی سیاہ
آنکھوں میں جھللاتے محبت کے ستارے تھے اور اڑتے پرندوں کے گیت تھے۔ ہم محبت میں جدا
ہو رہے تھے اور یوں لگتا تھا گویا یہ ہماری محبت کی ابتدا ہے۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی، لیکن
یوں مل رہے تھے گویا پہلی بار مل رہے ہوں اور کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ محبت کی کوئی ابتدا اور
انتہا نہیں ہوتی۔ یہ جس سمندر سے بادل بن کر اٹھتی ہے، قطرہ بن کر پھر اُسی میں جذب ہو جاتی ہے
شگونہ بن کر جس مٹی سے پھوٹتی ہے، بیج بن کر پھر اُسی خاک میں سما جاتی ہے۔ یہ اگر مغرب میں غروب
ہوتی ہے تو مشرق میں ایک بار پھر طلوع ہو جاتی ہے۔

امروہ کے باغوں میں طوطے شور مچانے لگے۔ ہم اٹھے اور گھر کی طرف چل دیے۔ پردہ باغ
کے پلاٹ میں لڑکیاں جھولے جھللا رہی تھیں اور ان کے قبچھوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ پاکستان

بن جانے کے بعد میں اس باغ میں آگیا تو نہ پردہ بھانہ جھوٹے اور نہ باپردہ مسلمان لڑکیوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ پلاٹ کا گھاس موکھ کر سیاہ ہو رہا تھا اور گارڈینیا کی پانچ فٹ اونچی باڑھ کو کاٹ کر زمین کے ساتھ ملا دیا گیا تھا۔ جہاں ناشپاتی کے میڑ ہوا کرتے تھے وہاں شرٹا رتھیوں نے کچے پکتے بدنام مکان بنا ڈالے تھے اور جس جگہ میں نے راجدہ کا ماتھ اپنی انگلیوں سے چھوا تھا اور ہم پر ناشپاتی کے گلابی شگوفے ٹہنیوں سے ٹوٹ کر گرے تھے، وہاں ایک موٹی پیللی تو نہ والا ہندو لالہ دھوئیں بھری دکان میں بیٹھا میلے میلے پکوڑے تل رہا تھا۔

اب میں اور راجدہ پوکھیس کے درختوں میں سے گزر رہے تھے۔ بائیں طرف کمپنی باغ کلب کی کائی زدہ دیوار پر ایک بادامی بنی بیٹھی تھی۔ اُس نے ہمیں گزرتے ہوئے ایک لمبے کے لیے دیکھا اور منہ کھول کر انگڑائی لی اور کلب کی دیوار پھلانگ گئی۔ کلب کے اندر سے دو ایک بار بلیر ڈکھلنے والی چھتری کی ٹپ کی آواز آئی اور ہم خاموشی سے اُس کے گزر گئے۔ ایک ہفتے بعد راجدہ کا بیاہ ہو گیا، وہ دلی چلی گئی ہیں کلکتے کی طرف نکل گیا۔ پاکستان بننے کے آٹھ برس بعد میں نے راجدہ کو میو ہسپتال میں دیکھا وہ اپنے ساتویں بیمار بچے کی دوا لینے ہسپتال آئی تھی اور میں راشن کارڈ بچوانے راشننگ آفس کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں نہ گرم فنا کی سحر انگیز خوشبو تھی اور نہ ناشپاتی کے گلابی شگوفے نہ میرے بدن پر سگی قمیض تھی اور نہ۔۔۔ راجدہ کی ناک میں عقیق دمک رہا تھا۔ نہ خوبصورت طوطے گیت گاتے امرود کے جھنڈوں کو جارہے تھے اور نہ ٹھنڈی نہری طرف سے پتے گلابوں کی خوشبو آرہی تھی۔ رکٹوں، بسوں ٹرکوں کا شور تھا۔ بیماروں کی چیخیں تھیں۔ زرد مر جھانے ہوئے چہرے تھے۔ چوٹی سے ایڑیوں تک ہیتا پسینہ تھا۔ گرمی میں جھلنے درختوں پر بیٹھے پیاسے کوڑوں کی کانٹیں کانٹیں تھیں اور بھاگتے، دوڑتے بگرتے پڑتے، گر کر اٹھتے، اٹھ اٹھ کر گرتے، مرتے ہوئے لوگوں کے ہجوم تھے۔ راجدہ کے ہاتھوں میں مہندی کی جگہ بیمار بچہ تھا اور میرے ہاتھ میں گلاب کے شگوفے کی جگہ راشن کارڈ تھا۔۔۔ نہ راجدہ نے مجھے پہچانا نہ میں نے راجدہ کو پہچانا۔ وہ بیمار بچے کو لیے اور میں راشن کارڈ کو لیے اُس کے گزر گیا، پھر جیسے یادوں کے جنگل میں کسی نے ہم دونوں کو آواز دی۔ ہم نے پلٹ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک پل کے لیے ہم ٹھٹکے، رُکے اور پھر چل دیے۔ اُسے اپنے بیمار بچے کے لیے دوا لانی تھی اور مجھے اپنی چھوٹی بہنوں کے لیے آٹا لانا تھا۔

اے میری محبت، میرے پھولوں، میری یادوں، میرے درختوں، میری نہروں، میرے شگوفوں کی انارکلی! تجھے کس نے پتھر کی دیوار میں زندہ چن دیا؟ اے میری محبت! اب کے بچھڑے کب ملیں گے؟

اے میری محبت! اے میری محبت!

راجدہ کا مکان گلی میں ہمارے مکان کے سامنے تھا پڑانے چھتے والا مکان۔ کھڑکی پر چتر پڑی رہتی۔ میں گلی میں سے گزرتا تو راجدہ چتر کی تیلیوں میں دو انگلیاں ڈال کر اُسے ذرا سا اپنی طرف کھینچتی اور مجھے گلی میں سے گزرتے دیکھتی۔ میں بالوں کو جھٹکنے کے بہانے اُسے دیکھتا۔ گلابی ناخنوں والی دو گوری انگلیاں اور سیاہ آنکھیں مجھے نظر آتیں اور میرا چہرہ خوشی سے کھل جاتا۔ میں گلی مڑتے ہوئے پلٹ کر اُسے نکلتا۔ وہ چلن کی اوٹ میں مجھے تک رہی ہوتی۔ دُور سے مجھے اُس کی چمکتی آنکھیں اور کان میں دمکتا ہوا آدیزہ دکھائی دیتا اور گلی والی مسجد کے گنبد پر سفید کبوتر چکر لگا رہے ہوتے۔ برسات کی جھریاں لگتی تو وہ اپنے مکان کی چھت پر سے میری طرف آم پھینکتی اور میں انہیں دبوچ لیتا۔ کسی وقت جب وہ آم چوس کر گٹھل میری طرف پھینکتی اور میں اُسے آم سمجھ کر شوق سے ہاتھوں میں دبوچ لیتا تو وہ ہنس ہنس کر دوہری ہو جاتی اور اسے بار بار اپنے بھیکے ہوئے لمبے بال اوپر جھٹکنے پڑتے۔ عید شبرات پر جب وہ کرن گوٹ لگے نئے نئے کپڑے پہن، عطر لگا کر میری بہنوں سے ملنے آتی تو ہم چھپ چھپ کر آنکھوں میں آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ اور ہمارے چہرے خوشی سے دمک اٹھتے۔ شادی بیاہ میں وہ ڈھولک پر گیت گاتی تو میں کسی نہ کسی بہانے کمرے میں جا کر اُسے گاتے ہوئے دیکھتا۔ اُس کے مہندی لگے گورے ہاتھ ڈھولک بجا رہے ہوتے خوبصورت سیاہ بالوں والا سر ایک طرف کو ذرا سا جھکا ہوتا۔

کبھی میں اس کے گھر جاتا تو وہ کیلے رنگ کی گرم کشمیری شال اوڑھے پنگ پر بیٹھی سوئیٹر بن رہی ہوتی اور یا نلکین سبز چائے پی رہی ہوتی۔ سبز پھولوں والی جا پانی پیالی اُس نے نازک گلابی انگلیوں میں مقام رکھی ہوتی۔ ہونٹوں کا پھول چائے کا گھونٹ لیتے وقت سمت کر شگوفہ بن جاتا۔ سبز خوشگوار چائے حلق سے اتارتے ہوئے وہ آنکھیں بند کر لیتی پھر بڑی بڑی ریشمی پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھتی اور ذرا سا مسکرا کر چائے پیتے لگتی اور کھڑکی سے باہر جنوری کی تیز بارش اور تیز ہو جاتی اور

سبز چائے کی مہک اپنے ساتھ اڑا کر ان پہاڑوں پر بے جاتی جہاں چنار کے درختوں پر سفید برف گر رہی ہوتی۔

گرمیوں کے موسم میں منہ اندھیرے راجدہ کے گھر کے نلکے میں پانی آتا تو اس کے نیچے رکھی ہوئی خالی بالٹی شور مچا دیتی۔ یہ صبح کے چار بجے کا الارم تھا۔ راجدہ کی ماں اور بہنیں فوراً اٹھتیں۔ محلے کی دوسری عورتوں کو گھروں میں جا کر جگا یا جاتا اور یہ ٹولی سیر کرنے کہنی باغ کی طرف چل پڑتی۔ راجدہ کا ادھیر عمر کلکتوی چچا اس ٹولی کی قیادت کرتا۔ وہ کلکتے میں بیس برس تک شالیں بیچتا اور جوا کھیلتا کرتا تھا۔ اور اب امرتسر میں رفوگری کرتا تھا۔ تانبے ایسی رنگت، گنجا سر، چہرے پر جھریاں، سخت مزاج، الکھڑ بات بات پر گالی، جسے کے جسے ڈاڑھی منڈواتا۔ فارسی کے ان گنت نصیحت آموز شعر اسے اکر برتے اور ہر شعر کو وہ شیخ سعدی کی طرف منسوب کر دیتا۔ تجھے اچھی طرح یاد ہے دعا کثر اردو اور پنجابی کے شعر بھی یہ کہہ کر سنایا کرتا تھا کہ یہ شیخ سعدی نے کہے ہیں۔ اس کا جادو وہ یہ دیا کرتا کہ شیخ سعدی سیلانی آدمی تھا۔ وہ پنجاب میں آیا تو اس نے پنجابی سیکھی اور پھر پنجابی میں شعر کہے۔

صبح کی مہکی مہکی روشنی پھیل رہی ہوتی کہ ہم کہنی باغ میں داخل ہوتے۔ نیلے آسمان پر مشرق کی طرف نورانی جھلکیوں میں ستارے موتیوں کی طرح چمک رہے ہوتے۔ باغ کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی تو چچا نہر کے کنارے بیٹھ کر اونچی آواز میں کلمہ شریف پڑھتے ہوئے زور زور سے کھانسی کھانسی کروڑھو کرتا اور سنگ مرمر کے پنج پر نماز پڑھنے لگتا۔ عورتیں اور بچے نہر میں چھلانگیں لگانی شروع کر دیتے۔ پو پھٹے کی نیم روشن نیم تاریک فضا میں نہر کا ریتلا ٹھنڈا پانی پر سکون خاموشی سی سرگوشیاں کرتا بہہ رہا ہوتا۔ ہوا میں شبنم کی ٹھنڈک اور کچے امرودوں کی خوشبو رچی ہوتی۔ آلوچے کے پیڑوں کی ٹہنیاں گھاس پر اوس ٹپکار رہی ہوتیں۔

عورتیں ناشپاتی کے پیڑوں کی اوٹ میں نہاتیں۔ مشرق میں صبح کا ستارہ نمودار ہوتا۔ آسمان پر نیلی روشنی کا غبار مشرق سے مغرب کی طرف پھیلتے لگتا۔ باغ میں یہاں وہاں سیر کرنے والوں کے ہیولے دکھائی دینے لگتے اور ہم لوگ واپس اپنی گلی میں آجاتے۔ ہم اپنے ساتھ بچوں کے گدے بنا کر لاتے۔ گلاب، چنبیلی، مولسری اور ناشپاتی کے گلابی پھولوں کے دستے۔ کسی رعز ہم آلوچے کی سفید پھولوں بھری ٹہنیاں ہی توڑ کرے آتے۔ ہم اونچے مکانوں میں گھری ہوئی اپنی گلی میں داخل ہوتے

تو ہمیں گلی اور گھٹن سی محسوس ہوتی۔ ہمارے کپڑوں میں شبنم کی ٹھنڈک ہوتی اور شگفتہ پھولوں اور تر و تازہ سبزے کی مہک اٹھ رہی ہوتی ایک دن راجدہ نہر میں سے نہا کر بال نچوڑتی ہوئی باہر نکلی تو ہم مولسری کے درخت تلے بھول چنے لگ گئے مولسری کے گول گول ننھی ننھی کرنوں والے پھول اندھیرے میں زمین پر تاروں کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ ہم نے بہت سے پھول اکٹھے کر لیے۔ میں نے اپنے پھول بھی راجدہ کے دوپٹے میں ڈال دیے۔ ان پھولوں میں سے بڑی گہری اور شیریں خوشبو آ رہی تھی۔ راجدہ مسکرائی۔ اس کے سفید دانت پچھلے پہر پڑتے کے اندھیرے میں ناریل کی دودھیا گری کی طرح نظر آتے اس نے گیلے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا تو میرے منہ پر نہر کے ٹھنڈے پانی کی پھوار پڑی۔ اب اس پھول میں جتنا کی خوشبو بھی تھی۔ ٹھنڈی کھوئی والی مسجد کی طرف سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔ چچا دھوکہ کھاتے تھے۔ ہم دیر تک پھول توڑ توڑ کر گدے سے ہناتے رہے اور جب ہم اپنی گلی کی طرف واپس جا رہے تھے تو کہنی باغ کی جادو بھری خوشبوئی ہمارے ساتھ ساتھ تھیں۔

کہنی باغ والی مسجد ٹھنڈی کھوئی کے پہلو میں تھی۔ یہ چھوٹی سی خوبصورت مسجد پختہ اور چمکے پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ شام کو مسلمان سیر کرنے آتے تو وہاں باجماعت نماز ادا کرتے۔ پاکستان بننے کے بعد جب میں امرتسر گیا تو یہ مسجد ویران ہو چکی تھی۔ لوگ اس کے پتھر اکھاڑ کر لے گئے تھے اور اس کے صحن میں لمبی لمبی جنگلی گھاس اگ آئی تھی۔ گرے ہوئے ستونوں کے اوپر گہریاں بھاگ دوڑ رہی تھیں۔ مزاروں کی پتھر لی جھاڑیاں توڑ پھوڑی گئی تھیں۔ یو کیٹس کے درخت اپنی سوگوار ٹہنیاں جھکائے مسجد کے کھنڈروں کو چشم حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

ہمسپانیہ تو خون مسلمان کا امیں ہے

مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

پوشیدہ تیری خاک میں مسجدوں کے نشانی

خاموش اذانیں ہیں تیری باور سحر میں

کہنی باغ کی مسجد کے کھنڈر قرطبہ کی مسجد کا ماتم کر رہے تھے۔ غزنائے کے بعد امرتسر کی جڑی ہوئی مسجدیں ایک بار پھر مسلمانوں کی درد انگیز ہجرت کا المیہ دہرا رہی تھیں۔ وہ اپنے پتھرے مزار و مزار کے سینے چاک کیے ہم سے پوچھ رہی تھیں کہ ہم انہیں کیوں چھوڑ گئے! لیکن کے

پاس چھوڑ گئے؟ کیا ہمارے ٹوٹے ہوئے میناروں سے اب کبھی اذان کی صداؤں بلند نہ ہوں گی؟ کیا ہمارے صحن میں اگر کوئی مسلمان خدا کے حضور میں سجدہ ریز نہ ہوگا؟ تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اذانوں کی دل نواز صداؤں اپنے ساتھ لے گئے اور بے آواز میناز میرے پاس چھوڑ گئے تسبیح کے سارے دانے اپنی جھولیوں میں ڈال کر لے گئے اور خالی رشتہ میرے ہاتھ میں چھوڑ گئے۔ تم مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے؟ کیا اب کبھی پلٹ کر نہ آؤ گے؟ مجھے بتاؤ میں اپنے سینے پر ٹوٹے ہوئے میناروں کا بوجھ رکھے کب تک تمہاری راہ دیکھتی رہوں گی؟ کیا میں اب کبھی تلاوت کی پُر شکوہ آواز نہ سن سکوں گی؟ اگر مجھے ایک روز نوبت پرستوں کے حوالے کرنا تھا تو پھر میری پیشانی پر کلمہ طیبہ لکھ کر خدا کی وحدانیت کا اعلان کیوں کیا تھا؟ میں کمپنی باغ کے اس دیران کو نے میں کھنڈ رہتی پڑی ہوں میری محرابوں کی سیلیں ہندوؤں کے غسل خانوں میں لگی ہیں۔ میری عبادت گاہ کے پتھر سکھوں کی ڈیوڑھیوں میں نصب ہیں۔ تم جہاں سجدہ کرتے تھے یہ لوگ وہاں پاؤں رکھ کر اپنے مکانوں میں داخل ہوتے ہیں تمہاری اذانیں ان کے ناقوس کے شور میں ڈوب گئی ہیں۔ اسے خدا! اسے خدا!

عجے کہاں روزِ مکافات اسے خدا! اسے خدا!

کمپنی باغ کے منتظم اعلیٰ چوہدری نور الہی تھے۔ ان کا مکان ہماری گلی میں ہی تھا۔ ڈبلے پتلے ادھیر عمر کے، نماز روزے کے پابند، بے حد بااخلاق، گلی میں سے گزر کر باغ کو جاتے تو ہر بڑے چھوٹے کو سلام علیکم کہنا کبھی نہ بولتے۔ رات گئے تک ان کے گھر سے قرآن شریف پڑھنے کی آواز آیا کرتی۔ سفید پگڑی، بوسکی کی قمیض، کالی کنی والی سفید دھوتی اور پمپ شو۔ میں نے ہمیشہ ان کو اسی لباس میں دیکھا۔ باغ کی فضاؤں میں رہ کر رنگ نکھر گیا تھا۔ چہرے پر ملائمت اور پاکیزگی کی چمک تھی۔ کمپنی باغ کے وسط میں ان کا دفتر تھا جہاں بہت بڑی زسری بھی تھی۔ چھڑ کاؤ کرنے والی کچھ شکستہ گاڑیاں وہاں پڑی رہتیں۔ چوہدری صاحب درختوں کی چھاؤں میں پھولوں سے لدے ہوئے گلوں کے پاس پڑی چارپائی پر بیٹھے مایلوں سے باتیں کیا کرتے۔ دور خشک پتوں کا ڈھیر سلاگ رہا ہوتا۔ آج بھی جب کبھی مجھے جلتے ہوئے سوکھے پتوں کی خوشبو کہیں سے آجاتی ہے تو مجھے کمپنی باغ یاد آ جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے ایک بار دوپہر کو میں کمپنی باغ سے اٹلاؤں کے زرد پھولوں کے چھ سات گچھے توڑ

کر بھاگا تو دو مایلوں نے مجھے پکڑ لیا۔ میں نے ان کی منت سماجت بھی کی اور یہ بھی کہا کہ ہمارے گھر میں ختم شریف ہو رہا ہے۔ اُس کے لیے پھول لیے جا رہا ہوں، لیکن وہ نہ مانے اور مجھے پکڑ کر چوہدری نور الہی کے پاس لے گئے چوہدری صاحب نے مجھے دیکھا تو بولے:

”اوئے ایہہ تے خلیفے دا پتر اسے“

پھر مجھے ڈانٹ کر کہا:

”نٹھ جا اوئے“

اور میں زرد پھولوں کے گچھے اٹھائے گھر کی طرف بھاگ گیا۔

رمضان المبارک کے دنوں میں ہم سحری کھا کر سیدھے کمپنی باغ میں آجاتے ہیں اور میرے محلے کے دوست لڑکے۔ اُن دنوں روزے بڑی سخت سردیوں میں آیا کرتے تھے۔ مگر ہمیں سردی نہیں لگتی تھی۔ روزہ کھولنے اور سحری ختم ہونے کی نوبت بجانے کا ہمیں بڑا شوق تھا اس شوق میں ہم مسجد میں سب سے پہلے پہنچ جاتے۔ سحری کی نوبت بجا کر ہم اذان کی آواز کے ساتھ ہی پچھلے پہر کے نیم روشن اندھیرے میں گلیوں کی کمپنی باغ کی طرف دوڑ لگا دیتے۔ راستے میں ہم بجلی کے کھمبوں پر چڑھ کر مکانوں کی دیواروں سے لگے فلمی پوسٹر بھی اکھاڑتے جاتے۔ تہہ در تہہ لگے ہو پوسٹر بڑی جلدی اتر جاتے، نسلی اشتہاروں کے نام یہ ہوتے تھے۔ لیلیٰ جنوں، زسری سانپ، جادوئی بنسری، ہند کیسری و سنت سینا شیل بال، بھولا شکار، خدا دوست، شاہی لکڑ مارا چنڈی داس، صبح کا ستارہ سینا۔ بھگت پر بلا ٹپل گرل، بیبی کی بی۔ دکن کوئیں وغیرہ۔

کمپنی باغ میں ٹھنڈی کھوئی کے سامنے والی گراؤنڈ میں ایک بڑا پرانا درخت تھا جس کی گھنی شاخیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ ہم ان اشتہاروں کو اس درخت کے نیچے لاکر ڈھیر کر دیتے اور انہیں آگ لگا کر ارد گرد بیٹھ کر آگ تپاتے۔ پھر ہم درخت پر چڑھ جاتے اور لیڈی بہادر اور باندن کا کیل کھیتے۔ ایک ٹہنی کو پکڑ کر بندر کی طرح اچھلتے اور جھولتے ہوئے دوسری ٹہنی کو تھام لیتے اور وہاں سے تیسری شاخ پر جا پہنچتے۔

برسات میں کمپنی باغ کے پلاٹ بارش کے پانی سے لبالب بھر جاتے تو ہم اُن میں پانی اچھالتے، لمبی لمبی دوڑیں لگاتے۔ ٹراتے مینڈکوں پر ڈھیلے برساتے۔ روشوں پر گری ہوئی

جامنیں اٹھا اٹھا کر کھاتے۔ نہر کی طرف نکل جاتے تو آم اور امرود کے درختوں پر ٹوٹ پڑتے۔
 رکھوالے چوکس ہو کر ہماری طرف پکٹتے تو ہم ہرنوں کی طرح چوڑیاں بھرتے نظروں سے اوجھل ہو
 جاتے۔ جو سڑک میڈیکل کالج کو جاتی تھی اس پر جامن کے پیروں نے چھت ڈال رکھی تھی۔ کالج
 کی گراؤنڈ بڑی سرسبز تھی۔ کنارے کنارے چاروں طرف آم کے گھنے درختوں کا سایہ تھا۔ سڑک
 کے پار رڑکیوں کا ہوسٹل تھا۔ یہاں ہندو سکیم رڑکیوں کے علاوہ بٹالہ، گورداسپور، پٹھانکوٹ اور ہوشیار
 پور سے تعلیم حاصل کرنے آئی ہوئی مسلمان لڑکیاں بھی رہتی تھیں۔ اس علاقے میں اکثریت سکھوں کے
 بنگلوں کی تھی؛ چنانچہ امرتسر میں جب منادات کا شعلہ بھڑکا تو اس ہوسٹل سے بہت کم مسلمان لڑکیاں
 نکل کر شریف پورہ کیمپ میں آسکی تھیں۔ وہ کہاں گئیں؟ وہ کہاں ہیں؟ اس کا جواب نہ میرے پاس
 ہے اور نہ ان لیڈروں کے پاس جو امرتسر کی انجمن پارک اور گول باغ میں دھواں دھار تقریریں
 کیا کرتے تھے اور جولاہور میں آج ایئر کنڈلیشنڈ ڈرائینگ روموں میں نیم دراز اپنے سیکرٹریوں
 کو تازہ بیان قلمبند کروا رہے ہیں۔

ایگزینڈرا گراؤنڈ اور مینگو پارک میں ڈی اے دی کالج، ہندو سمبھا کالج اور گرینڈ کلب
 اور ایم اے او کالج کے درمیان کرکٹ میچ ہوا کرتے تھے۔ ہم ایم اے او اسکول میں پڑھتے تھے
 چنانچہ میچ کے روز چھٹی ہوتی۔ ہم بستے گھروں میں پھینک پیچ دیکھنے کپنی باغ پہنچ جاتے۔ زندہ دلاں
 امرتسر، جوم درہجوم یہاں آئے ہوتے۔ قلعہ چھوٹے، قیمے کے پکڑے اور نان ہر لیسہ عام بک رہا ہوتا۔
 سردیوں کی خوشبودار چکیلی دھوپ میں لوگ منڈلیاں بنائے، دریاں اور قالین بچھائے بیٹھے
 میچ دیکھ رہے ہوتے۔ سبز سبز میٹھی مولیاں نیچنے والے گراؤنڈ کے چکر لگا رہے ہوتے۔ پینچ کا وقت
 ہوتا تو ایک کس کر باندھی ہوئی پگڑی والا سکھ ہاتھ سے گھنٹی بجاتا ساری گراؤنڈ کا چکر لگاتا۔ لوگ
 ہنستے، مذاق کرتے کھیل پر تہرہ کرتے اور پھر کھانے پینے میں مشغول ہو جاتے۔ ہم گراؤنڈ میں دوڑیں
 لگانی شروع کر دیتے، درختوں سے پتے توڑ توڑ کر ان کے تاج بناتے۔ اسی بھاگ دوڑ میں امپیریل
 ہوٹل کی طرف نکل جاتے جس کے صحن میں بوڑھے انگریز آرام کر سکیں پر نیم دراز اخبار پڑھ رہے
 ہوتے۔ وہ ہمارے شور غل سے تنگ اگر وردی پوشی بیروں کو ہماری مرمت کو بھیجتے۔ مگر ہم چاق
 چوبند امرتسر کی کشمیری رڑکے بھلا ان کے ہاتھ کب آنے والے تھے۔

شام کو کرٹل ہوٹل کے گیٹوں کی روشنی باہر نالے کے پانی میں جھللا یا کرتی۔ ہم نالے کی چھوٹی سی
 پٹیا پر بیٹھے لوگوں کو شیشوں کے پیچھے آئیں کریم کھاتے اور چائے پیتے دیکھا کرتے۔ ایک بار ہم سب
 رڑکوں نے آپس میں چندہ کر کے واں جا کر آئیں کریم کھائی اور ان کے دو گلاس توڑ کر بھاگ آئے۔
 باغ کی لائبریری والی گراؤنڈ میں سردیوں میں پھولوں کی نمائش لگا کرتی۔ مختلف رنگوں کے
 گل داؤدی کے سینکڑوں گلے بڑے قرینے سے سجادیئے جاتے۔ سخت کالروں میں بھنسی ہوئی تھی
 گردنوں والے افسر ہیڈ مایوں کے ساتھ گھوم پھر کر پھولوں کا معائنہ کرتے اور نوٹ بک میں کچھ لکھتے جاتے
 — پچھلے پیر اذان سے پہلے میں سیر کرتا اس گراؤنڈ میں پہنچنا تو گل داؤدی کے پھول ٹھنڈی ریخ شبنم
 سے تر تر ہوتے۔ تاروں کی ہلکی ہلکی نورانی روشنی میں یوں لگتا جیسے بے شمار دلائی گڑیاں اپنے رنگ بزرگ
 ریشمی بال لٹکائے گلوں میں کھڑی ہیں۔ میں دونوں ہاتھوں میں گل داؤدی مقام کراپنی آنکھیں گرم ہو جاتیں
 اور نیم گرم سونچی خوشبو میرے رگ و پے میں سرایت کر جاتی۔ پھر ٹھنڈی کھوٹی کی جانب آم کے جھنڈوں
 کے پیچھے سورج طلوع ہو جاتا اور زرد، سفید، پمک، قرمزی اور گلابی گل داؤدی کے پھولوں پر شبنم کے قطرے
 زرد و جاہر بن کر دمک اٹھتے۔ ایک ایک شبنم کے موتی میں سینکڑوں سورج طلوع ہوتے دکھائی دیتے
 میری آنکھوں کی شبنم سے سورج کی سنہری کرنیں ٹکرا کر پھولوں کی شبنم پر منعکس ہوتیں اور وہاں سے پھر میری
 آنکھوں میں آکر چمکنے لگتی۔ گویا میں ہزاروں سورجوں کے بیچ میں سورج بن کر پھولوں، شبنم کے موتیوں
 موتیوں کے سورجوں اور کپنی باغ کے درختوں، شاخوں، شگوفوں کے خور کے گرد گردش کر رہا ہوں۔ میں
 طلوع ہوتے آفتاب کی طلائی کرن بن کر صبح کی خوشبودار فضاؤں میں تحلیل ہو جاتا۔

کپنی باغ میں سورج آج بھی طلوع ہو گا، لیکن صبح کبھی نہیں ہوتی ہوگی۔ منہ اندھیرے شبنم
 پھولوں پر گرتی ہوگی مگر ان کا منہ نہیں چومتی ہوگی۔ باد سحر آہیں بھرتی ہیں یا د کرتی درختوں پر ہماری ہمتوں
 کے نشانوں کو بوسہ دیتی چپ چاپ گزر جاتی ہوگی۔ سادوں کی گھٹائیں باغ کے آسمان پر ہمیں آویزیں
 دے دے کر گر جاتی ہوں گی۔ بارشیں اجڑی ہوئی مسجدوں کے شکاف زدہ گنبدوں اور خزاں نصیب بیروں
 پر روتے ہوئے برسی ہوں گی۔ ٹھنڈا زرد چاند آم کے درختوں پر ٹھوڑی رکھ کر ویران باغ میں ہمیں تلاش
 کرتا ہوگا اور نہر کا پانی پچھلی شب کی نورانی روشنی میں کناروں کی گھاس پر بے ہنگام اپنی آبی آنکھوں سے
 بھی دیکھنے کی بے سود کوشش کرتا ہوگا۔

آخروہ خوبصورت، خوش پوش لوگ کہاں چلے گئے؟ کپنی بارغ ضرور سوچتا ہوگا۔ اسے کیا معلوم کہ پت
جھڑ میں سوکھے پتے جس ٹہنی سے ٹوٹتے ہیں اس کے نیچے کبھی نہیں گرتے۔ ہوا میں پلکے کھاتے، جھاٹی
کے بے آواز نوحے پڑھتے، وہ ایک سسکی کے ساتھ زمین پر آکر بچھ جاتے ہیں اور پھر ہوا انہیں جدھر
کو چاہے اٹھا کر لے جاتی ہے۔

میں کپنی بارغ کے درختوں کے پتوں کے ساتھ کئی بار ٹوٹ کر گر اہوں اور ہوا میں مجھے اڑائے لئے
پھرتی رہی ہیں۔ میں بھی تو ایک ہوں۔ جانے کس شاخ سے ٹوٹا کس سرزمین کی خاک پر آکر بچھ گیا اور
اب ہوا میں کس دیس کو اڑائے لیے پھر رہی ہیں! کیا اب کبھی اپنی شاخ سے لگ کر پھول کھلتے دیکھنے
نصیب نہ ہوں گے؟

کپنی بارغ! میں تجھے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اُن پرندوں کو یاد رکھوں گا جو صبح دم تیرے درختوں
کے جھنڈوں میں چھپایا کرتے تھے اور اُن کوئوں کو جو ساؤن کی سیاہ کالی بھگیاتی راتوں میں اُم کے پیروں
میں بولا کرتی تھیں اور لوکاٹ کے اُن نند گچھوں کو جو تیری نہر کے شفاف پانیوں میں جھک کر اپنا عکس
دیکھا کرتے تھے اور اُن گلابی شگوفوں کو یاد رکھوں گا جو بہار میں تیری ناشپاتی کی ٹہنیوں پر کھلا کرتے
تھے اور اُس اذان کو یاد رکھوں گا جو تیری مسجد کے گنبد سے بلند ہوا کرتی تھی اور اُن نورانی چہروں کو جو
تیرے صحنوں میں نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ میں اس لیے یاد رکھوں گا کہ مجھے یہ سب کچھ تجھ سے
واپس لینا ہے اور تو اُس لیے یاد رکھنا کہ ایک دن تجھے یہ ساری باتیں بھی واپس کرنی ہوں گی۔

میرے غرناطہ! میرے اُنڈس! میرے قرطبہ! ہم تیرے دریاؤں میں ڈوبے ہوئے اپنے موتیوں
کی غواصی کرنے ایک دن مزدرائیں گے۔ ہم اپنے تاج، اپنے زہرہ بکتر اور اپنی تواریں اُنے والی نسلوں
کو دلانے کے لیے عجائب گھروں میں نہیں رکھیں گے۔ ہم اللہ کے نام پر اپنی تلواروں کو بے نیام کریں گے
اور اللہ کے لیے تجھے ایک بار پھر حاصل کریں گے۔ ہماری مسجدوں کے میناروں، ہمارے عظیم کتب
خانوں کے گنبدوں اور ہمارے الحرام کے باغات کے پھولوں بھرے تختوں پر سورج کو طلوع ہوتے
دیکھ۔ اپنی سبز پوش وادیوں کی فضاؤں میں ہمارے رجزیہ اشعار کی آگے بڑھتی ہوئی آواز سن! اور
اپنے قلعوں کی رنگ خورہ فصیلوں پر کھڑے ہو کر دور گرد و غبار میں ہمارے شہسواروں کی چمکتی ہوئی
تلواریں دیکھ اور اپنی خندقوں پر پُل گرا دے اور شاہی قلعوں کے دروازے کھول دے۔

میری کھراکی سے باہر سفیدے کے درختوں میں سُرخ زہرہ سیارہ انگارے کی مانند دہکنے لگا ہے
اس سیارے نے میرے چہرے کو سُرخ کر دیا ہے اور یہ سُرخ ہی ہے عظمت، غیرت اور شکوہ کی
دودھیا گنبدوں کو چمکاتے سورج طلوع ہو رہے ہیں۔ پنچے ٹوٹی ہوئی تواروں کے قبضوں پر جمے
ہیں۔ گرد آلود پاؤں رکابوں میں پیوست ہیں اور جھاگ اڑاتے، مہنہاتے گھوڑوں کی گردنیں تنی ہیں
ڈوبا ہوا سورج روشنی کے تحت پر بیٹھا ایک بار پھر مشرق سے ابھر رہا ہے۔

طلوع ہو! طلوع ہو! میرے اللہ کی عظیم نشانی! میں اندھیروں میں کھڑا ہوں اور
تیرے طلوع ہونے کا وقت اُن پہنچا ہے۔

کون سی منزل میں ہے کون سی وادی میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلہ سخت جاں

امر تسر کی ایک گلی

پاکستان بن جانے کے سات آٹھ برس بعد جب میں پہلی بار امر تسر گیا، تو ہال بازار والے سندھ شکار پور ہوٹل میں ٹھہرا۔ کل امر تسر میرا گھر تھا، لیکن آج وہ مجھے اجنبیوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ میں بھی وہاں اجنبی تھا۔ سیکھ اور بہندو دوستوں کے گھر ٹھہرنا مجھے پسند نہ تھا۔ اس لیے کہ ان کے گھروں سے ہمیشہ ایک خاص قسم کی بو آتی، جو مجھے ناگوار تھی۔ میں پوچھے ہوٹل سے نکلا اور کمپنی باغ کی سیر کرتا ہوا اپنے محلے کی جانب آگیا۔ اپنی گلی میں داخل ہوا، تو امر تسر کی صبح کا اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ سب سے پہلا فرق جو میں نے گلی میں داخل ہوتے ہی محسوس کیا وہ یہ تھا کہ کسی بھی مکان کی کھڑکی یا دروازے پر جتنی نہیں تھی۔ پردہ داری اور حیا داری مسلمانوں کے ساتھ ہی پاکستان چلی گئی تھی۔ چتوں کے بغیر کھڑکیوں پر مجھے ان حیا باخستہ آنکھوں کا گمان ہوا جن کی پلکیں غائب ہو چکی ہوں۔ اکثر مکانوں کے پٹ کھلے تھے اور ڈیوڑھیوں سے دالانوں تک نظر جاتی تھی۔ آٹھ برس پہلے یہ گلی ایک برقعہ پوش خاتون تھی اور آج کسی طوائف کی طرح کھڑکی میں بیٹھی راہ چلتوں کو اشارے کر رہی تھی۔

مکانوں کی حالت خستہ ہو رہی تھی۔ دوسری منزلوں کے چھبے مزید جھک گئے تھے۔ میٹروں منڈیریں ڈھے چکی تھیں۔ رہنیت کے مکان کا دروازہ کھلا تھا اور جس دیوان خانے میں وہ شہزادیوں جیسے وقار کے ساتھ قالین پر بیٹھ کر سلاخی مشین پر اپنی ویٹ کی قمیض سیبا کرتی تھی وہاں اب ایک لگائے بندھی تھی۔ میں نے مکان کے آگے سے گزرتے ہوئے رہنیت کو یاد کیا، تو گائے نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں نے گائے سے پوچھا: "ان گھروں میں سرگوشیوں میں باتیں کرنے والی اور بے داغ میز پوشوں پر نیلے خوبصورت پھول کاڑھنے والی شریف زادیاں کہاں چلی گئیں؟ گائے

نے کوئی جواب نہ دیا اور میں حاجی قمر دین شال مرچنٹ کے مکان کو نکلنے لگا۔ جس کی تیسری منزل کے چھتے پر اخروٹ کی لکڑی کا کام کیا گیا تھا۔ وہاں اب سوائے طے کے ڈھیر کے اور کچھ نہ تھا۔ مسجد عبدالوہاب کے صحن کو توڑ کر وہاں پیل کا درخت اگادیا گیا تھا۔ محرابوں پر "اوم" لکھا تھا اور منبر پر کرشن کی مورتی رکھی تھی۔ اس مسجد کے سامنے ہمارا مکان تھا۔ ہمارا پیدا مکان۔ جس کے دیوان خانے میں بیٹھ کر میں خلیل جبران کے ترجمے پڑھا کرتا تھا اور جس کے آگے تخت پر سماور گرم کیے میرے دادا جان اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے کشمیری چائے پیا کرتے اور پہلوانوں، دنگلوں اور مشہور کشتیوں کی باتیں کیا کرتے۔ جس کے دالان میں موسیٰ، رتن جو اور عیش بیچاں کے گلے رکھے ہوئے تھے اور گرمیوں کی راتوں میں موسیٰ کی میٹھی خوشبو سے سارا گھر ملک جاتا۔ اس مکان کو میں پہچانہ سکا۔ اس کا دروازہ اکھڑ چکا تھا۔ دوسری منزل غائب تھی۔ جس دیوان خانے میں بیٹھ کر میں خلیل جبران کی کتابیں پڑھا کرتا تھا اس کا ادھاپٹ کھلا تھا اور اندر ایک بوڑھی ہندو عورت فرش پر گائے کے گوبر کا لیپ کر رہی تھی۔ جہاں میرے دادا جان تخت پوش پر سماور گرم کیے کشمیری چائے پیا کرتے تھے وہاں ایک بودی والا بہندو لالہ باسی پکڑوں کی چھابڑی سکے سینا رام سینا رام کا جاپ کر رہا تھا۔

ماسٹر رفیق ستار کی دکان میں ایک موٹی توند والا سکھ حلوائی بیٹھا اپنے گندے گندے ہاتھوں سے لسی بنا رہا تھا۔ ماسٹر رفیق بڑا صاف ستھرا نوجوان تھا۔ وہ دکان کو شیشے کی طرح جمکائے رکھا۔ دیوار الٹی پالتی مارے بیٹھا لاکھ میں جڑی سونے کی انگوٹھی میں نیگے جڑ رہا ہوتا۔ اس کے بال نسواری تھے، آنکھیں شفاف اور بے داغ تھیں۔ دانت صحت مند مونگ پھلی کے نزدیکی مائل سفید دانوں کی طرح ہموار اور مہو ترے تھے۔ وہ کام کرتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ یہ نعت بھی پڑھتا جاتا تھا۔

نبی جی کرو شاد و کھیا ریاں نوں

محببت زدہ غم دیاں ماریاں نوں

اسے ہم ماسٹر سہگل بھی کہا کرتے تھے۔ وہ محلے کی نعتیہ پارٹی کا صدر بھی تھا۔ ان دنوں میں بھی میلاد کی محفلوں میں نعتیں پڑھا کرتا؛ چنانچہ ماسٹر رفیق مجھے ہر محفل میلاد میں اپنے ساتھ لے کر جاتا۔ قمری پھول دار و مال میرے گے میں ہوتا جسے میں نعت پڑھتے ہوئے سر پر کر لیتا۔ جازم پر پشتوں میں پھل مسٹھائیاں، چھو بارے، مخانے سجے ہوتے۔ اٹما بھرے پیالوں میں لگی ہوئی اگر جیاں اپنا خوشبودار

دھواں پھیلا رہی ہوتی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی اہل محل گلاب دانی لیے اٹھتا اور ہم پر گلاب کا عرق چھڑک دیتا۔ نعت پڑھتے ہوئے میری آنکھیں بند ہوتی۔ جب گلاب کے عرق کا ٹھنڈا اور خوشبو دار قطرہ میری بند پلکوں، ہونٹوں اور گالوں پر پڑتا تو مجھے روحانی سرور ملتا۔ محفل میلاد سے واپسی پر ہمیں الگ الگ تبرک ملتا ہے ہم اپنے اپنے رومالوں میں باندھ لیتے۔

ماسٹر رفیق کی دکان پر اس کے دوست بیٹھے اکثر سہل کانن بالا، ماسٹر نشار اور اس دور کے مشہور فلم ایکٹروں کی باتیں کیا کرتے۔ دراصل ماسٹر رفیق کو فلم میں کام کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ خوش شکل تھا۔ آواز سُرلی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر نئی تھیٹر فلم کمپنی والے اسے بلا لیں، تو وہ سہل سے کم ثابت نہیں ہوگا۔ مئی ہر روز صبح سات بجے والی مسجد کے سقاوے میں نہایا کرتا۔ ماسٹر رفیق بھی روزانہ اسی مسجد میں آکر نہایا کرتا۔ وضو کرنے والی ٹوٹیوں کے سامنے بیٹھا وہ کتنی ہی دیر سوچا کرتا۔ پھر کالی نوں ٹوٹھ پیٹ سے رگڑ رگڑ کر دانتوں کو صاف کرتا۔ اس کے بعد سقاوے میں لکس اور پام آئیو صابن سے خوب ٹل ٹل کر نہاتا۔ مصیبت یہ تھی کہ اس کا رنگ گہرا سا لال تھا اور اس کی بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ گورا ہو جائے۔

سنو کھ سُر والی گراؤنڈ میں ایک تھیٹر ریکل کمپنی نے آکر مقبول گائے، تو خدا جانے کس کی سفارش سے ماسٹر رفیق کو ایک روز وہاں کی کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ رات کے بارہ بجے تھیٹر سے گھر واپس آیا تو نہ پر لگی سُرخی پاؤڈر سمیت ہی سو گیا۔ صبح مسجد میں آیا، تو لوگوں نے پوچھا۔

”ماسٹر! یہ مٹہ پر گیا لگا ہے؟“

”میک آپ ہے اور کیا ہے؟“

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماسٹر رفیق اپنے اور اپنی دکان کے میک آپ کا ہر لحظہ خیال رکھتا تھا مگر آج اس کی دکان کا میک آپ اُجڑ چکا تھا۔ جس جگہ وہ قالین کا ٹکڑا بچھا کر اسے ہر روز بُرش سے صاف کیا کرتا تھا وہاں آج چوکی پر میل سے بھرا ہوا بوریا بچھا تھا جس پر میل کچلا تو ندیل سکھ بیٹھا، لسی بنا رہا تھا۔ میں آگے نکل گیا۔ گئے جولاہے کے مکان کی ڈیوڑھی ڈھے گئی تھی۔ پچھلے دروازے پر سوراخ دار بوریا پڑا تھا جس کے آگے جھنگا سی چارپائی پر ایک بیمار بوڑھا بندہ لیٹا کھانسی رہا تھا۔ مگر اب وہ شالوں کی رفوگری کا کام کرتا تھا۔

گل خان بڑے بڑے گل چھوں والا ادھیر عمر آدمی تھا۔ جس کا لگی کے پچھلے کونے میں چائے خانہ تھا۔ چائے خانہ دراصل برائے نام ہی تھا۔ وہ اپنے چوبارے پر جوا کر داتا تھا۔ ہر جمعے کی جمعے فتم شریف بھی کرواتا اور روکر گڑ گڑا کر خدا سے اپنے پچھلے ہفتے کے گناہوں کی معافی مانگتا۔

مسجد خیر الدین کے جگہ لگتے صحن میں ہم مولانا غلام محمد ترنم اور مولانا عطار اللہ شاہ بخاری کی پُر جوش اور ایمان افزہ تقریریں سنا کرتے تھے۔ آج اس کی خرابوں میں دراڑیں پڑی تھیں۔ صحن والا حوض خشک ہو چکا تھا جس میں جال لگا کر دو سکھ لڑکے چڑی چھینکا کھیل رہے تھے۔ وضو کرنے والے بڑے نلکے کے ساتھ ایک گائے بندھی تھی۔

مسجد جان محمد میں لائل پور کے سکھوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ خطیب مسجد مولوی سلام بابا مرحوم و مغفور کے جُڑے میں ایک سکھ صرف کچھا پہنے چارپائی پر بیٹھا اپنے گندے بالوں میں کنگھا کر رہا تھا۔ میری آنکھوں میں مولوی سلام بابا کا بھرا بھرا شیر ایسا گول پُر نور کشمیری چہرہ گھوم گیا۔ ان کی بارعب کڑک دار آواز مسجد میں گونجا کرتی تھی۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک کہیں انہوں نے زبان سے پورا ادا نہ کیا تھا۔ حضور کا اسم مبارک زبان پر آتے ہی مولوی صاحب کی ہچکی بندھ جاتی۔ میں نے کئی بار اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مولوی صاحب جمعے کا خطبہ دے رہے ہیں۔ حضور کا نام زبان پر آیا اور زار و قطار رونے لگے۔ آنکھوں سے دیکھا۔ مولوی صاحب جمعے کا خطبہ دے رہے ہیں۔ حضور کا نام زبان پر آیا آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگ گئی، ہچکی بندھ گئی۔ اے! کیسے کیسے مردان پاک طینت و مردان حق آگاہ تھے کہ جن کے سوز و گداز سے زمین کا دامن خالی ہو گیا۔

مسجد قاصدال کے دونوں میناروں پر اکال سکھوں نے اپنے زرد جھنڈے گاڑ رکھے تھے اور اس کی خرابوں پر سکھ عورتیں اوپے تھاپ رہی تھیں۔ یہ وہی مسجد تھی جس کے در و دیوار جمعے کے روز مولانا غلام محمد ترنم کی ولولہ انگیز تقریروں سے گونجا کرتے تھے شہر کے دھندلے دروازوں سے مسلمان مسجد قاصدال میں مولوی ترنم کی تقریر سننے آیا کرتے۔ سیاہ کالی گھنی ڈاڑھی، گٹھا ہوا مضبوط بدن چوڑا چپکلا ہر وقت مسکاتا ہوا نورانی چہرہ۔ مولوی ترنم گیندے اور سرخ گلاب کے اردوں سے لہے پھندے جب منبر پر چڑھتے، تو نمازیوں میں عقیدت اور جوش ایمان کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ مسجد کا صحن، بال کمرہ، چشتیں اور گلی نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوتی۔ مسجد کا صحن،

بال کمرہ، چیتیں اور لگی نمازیوں سے کچا کچھ بھری ہوتی۔ چیت پر تمبو، قناتیں لگی ہوتیں جہاں پردہ دار بیبیاں سہمہ تن گوش ہوتیں۔ مولوی ترم عشق رسالت مآب میں سرشار آنکھوں سے مجمع پر نگاہ ڈالتے۔ والہانہ انداز میں گردن کو دائیں بائیں گھماتے اور پھر جیسے خدا کے حضور میں مودت ہو کر آنکھیں بند کر لیتے اور لب معجز گفتار سے یہ الفاظ نکلتے:

نحمدہ و نصلی.....

اس کے بعد خطابت و بلاغت کا ایک دریا بہہ نکلتا جو پریچ وادیوں کے ٹیلوں سے ٹکراتا تھا۔ کوڑ کرتا، سنگلاخ چٹانوں کو پیچھے چھوڑتا بالآخر ایک بحر زخار میں جا ملتا۔ مجھے یاد ہے ایک بار خرم کے دنوں میں مولانا ترم شہداء کربلا کا ذکر کر رہے تھے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہو۔ چیت پر عورتیں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔

مولانا ترم تبلیغ دین کے لیے لگی مٹے مٹے جاکر جلسے کیا کرتے۔ ان کی طبیعت میں ظرافت بھی بہت تھی۔ تقریر کرتے ہوئے ایک ادب جملہ سامعین پر کچھ اس طرح چست کر جاتے کہ محفل زعفران زار بن جاتی۔ ان دنوں امرتسر کے سینا گھروں میں بدھ دار سیشل زناہ شونیا نیا شروع ہوا تھا۔ ترم صاحب ہمارے محلے میں بعد از نماز عشاء تقریر کر رہے تھے۔ لگی میں کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مکانوں کی چیتیں اوڑ اور کھڑکیاں عورتوں سے بھری ہوئی تھیں۔ تقریر کرتے کرتے مولانا نے زمانہ فلمی شو کی بات شروع کر دی۔

”اٹوٹ اٹ نہ سٹ دینا“

پھر انہوں نے نقشہ بیان کرنا شروع کر دیا کہ بدھ وار کو ٹینی شو پر جانے کے لیے کس طرح ایک دوسری کو اکٹھی کرتی ہیں۔

”نی سکینہ! آج منڈوے چلنا ایس۔ روٹی جلدی پکا لئیں“

”نی دالال! جلدی جلدی کپڑے دھو۔ آج بدھ وارے۔ لوگ ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتے پھر فوٹا ہی مولانا ترم کا لہجہ پڑ عتاب ہو جاتا اور کہتے۔

”سنو! ہماری بیٹیوں اور بہنوں کو تو خدا کے حضور میں جانے کی تیاریاں کرنی چاہیے تھیں۔

یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

ایک جلسے میں کشمیری گھرانوں کی شاہ خرچیوں اور خاص طور پر بیاہ شادیوں کے موقع پر ان کی خوش خور کی اور بے جا اسراف پر تقریر کر رہے تھے کہ شادی کی دعوت کا نقشہ کھینچنا شروع کر دیا۔

”دیگیں کھل گئی ہیں۔ دسترخوان لگ گئے ہیں۔ پلاؤ کی مہک اڑنے لگی ہے۔ زردہ، برابانی متجن سے بھرے ہوئے قاب جا رہے ہیں۔ اوئے چھیدرے قورمہ ہو روے جا۔ کاکاجی! پیٹھ کی بوٹی بھیج دیا ہے نی صغرا! متجن داک کاب دے جا۔“

لوگ بے اختیار ہمو کر ہنسنے لگے۔ اچانک مولانا ترم کا لہجہ بدل گیا۔ بجلی کی طرح کڑک کر کہا۔

”شرم کرو بہتے ہو! کیا تمہیں یاد نہیں ہمارے نبی اکرمؐ نے پیٹ پر پتھر باندھے تھے۔ ان کے گھر میں فاقہ آجاتا تھا۔ مسلمانو! تم کہاں سے چلے تھے اور کہاں آگئے ہو؟۔۔۔۔۔“

اس کے بعد اسلامی تاریخ کے اوراق کچھ ایسے دلگداز انداز میں النما شروع کرتے کہ وہی مجمع جو ایک منٹ پہلے ہنس رہا ہوتا سسکیاں بھرنے لگتا۔

اب میں اپنی لگی کی لال حویلی کے سامنے سے گزر رہا ہوں۔ اس حویلی سے خرم کے سوگوار دنوں میں جھولا نکلا کرتا تھا۔ ہم اپنے بانڈ میں کھڑے جھوٹے کابے تابی سے انتظار کیا کرتے۔ جب لکڑی کے چوک میں سیاہ علم نظر آتا، تو ہم بھاگ کر جھوٹے میں شامل ہو جاتے۔ سوز خوانوں کی آواز میں آواز ملاتے۔ ماتم والوں کے پیچھے پیچھے چلتے جاتے۔ مکانوں کی چیتوں سے عورتیں جھوٹے پریشاں اور گیند گوب کے پھول پنچا در کرتیں۔ جو پھول جھوٹے سے نیچے سرک پر گر پڑتے ہم انہیں فوراً اٹھا کر چومتے آنکھوں سے لگاتے اور جیب میں رکھ لیتے۔ ہماری والدہ فرمایا کرتی تھیں کہ جھوٹے سے سڑک پر گر پڑتے ہم انہیں فوراً اٹھا کر چومتے، آنکھوں سے لگاتے اور جیب میں رکھ لیتے۔ ہماری والدہ فرمایا کرتی تھیں کہ جھوٹے سے گرا ہوا پھول چوم کر گھر لے آنا۔ وہ ان پھولوں کو چینی کے مرتبانوں میں سنبھال کر رکھا کرتی تھیں۔ بہندی کے دن محلے کے ہر گھر سے ریشمی سرخ دوپٹے لے کر ہم ان کے علم بنا کر تانگوں میں بیٹھ جاتے اور سوز خوانوں کی معیت میں آدھے شہر کا چکر لگاتے۔ ہماری لگی سے کئی تعزیرے نکلتے۔ رام باغ والا تعزیرہ اپنے لکڑی کے بے مثال کام اور آٹھ منزلہ ہونے کی وجہ سے سارے محلے میں اول تھا۔ نویں خرم کو شبیبہ ذوالجناح ہمارے محلے سے گزرتی تو گتے بازوں کی ٹولیاں آگے آگے ہوتیں۔ شبیبہ سنی کا وہاں کوئی سوال نہ تھا۔ سب اسلام

کے رشتے میں بندھے ہوئے تھے۔ اسرت سرین محرم کے دنوں میں ہندو مسلم فساد ضرور ہو جاتا جس میں مسلمانوں کا پتہ ہمیشہ بھاری رہتا۔ پٹ رنگوں کا تعزیر گورو بازار یعنی ہندوؤں کے گڑھ سے ہو کر گزرتا تھا۔ ہندو ضرور شرارت کرتے۔ مسلمان بھی ہر قسم کے چیلنج کو قبول کرنے کا عزم لے کر نکلتے تھے۔ ایک دفعہ یہ تعزیر کرموں ڈیورس کے بازار میں سے گزر رہا تھا کہ ایک ہندو عورت نے جو پڑیاں تل رہا تھا چپلن سے گرم گرم کھولتا ہوا کھی مسلمانوں کی طرف اچھال دیا۔ مسلمان "نعرۂ تکبیر" اور یا علی کے فلک شکاف نعروں کے ساتھ دکان پر ٹوٹ پڑے۔ دوسرے لمحے دکان سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

لال حویلی میرزا بیضا خان مروی ایرانی کے آباؤ اجداد نے بنائی تھی۔ میرزا صاحب بڑے کم گو حلیم الطبع، خوش اخلاق، خوش وضع اور خوش فکر شاعر تھے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے ہم آٹھویں نویں میں پڑھا کرتے تھے، ان کی علمیت کا اندازہ نہ لگا سکتے تھے، لیکن میرزا صاحب اپنے دیوان خانے میں کبھی کبھی شعر و سخن کی محفل گرم کرتے، تو میں مزور گھس گھسا کر کہیں نہ کہیں بیٹھ جاتا۔ اہل محفل میرزا صاحب کے شعروں پر خوب داد دیتے۔ آج میرزا بیضا خاں مروی ایرانی کی شمع محفل سیاہ پوش رہی تھی۔ لال حویلی کی منڈیروں پر سوکھی گھاس آگ رہی تھی۔ ڈیورس میں ایک گائے کھڑی کونے میں پڑا نمک کا ڈلا چاٹ رہی تھی۔ میرزا صاحب کے دیوان خانے میں ایک موٹی لالائن چرخہ کات رہی تھی اور اس کی زرد روکتی پاس ہی بیٹھی رو رہی تھی۔ بہار کا کارواں گزر گیا اور اپنے پیچھے ایک ایسی خزاں چھوڑ گیا جس کی بہار کبھی نہیں آئے گی۔ راستے خون اور مٹی میں چھپ گئے۔ گرے ہوئے پتوں کو ظلم کی ہوا اڑا کر لے گئی۔ پھر کسی دور کسی رات اور کسی گلشن میں نہ ملنے کے لیے اڑا کر لے گئی۔ سورج غروب ہوا۔ اندھیری رات چھا گئی اور پھر اس رات کی کوئی صبح نہ ہوئی، کوئی سورج نہ نکلا۔ کسی مشرقی افق کی گود سے سنہرے کرنوں نے طلوع ہو کر فاک لبر مر جھائے ہوئے پھولوں کا منہ نہ چوما۔

بچپن میں میں نے ایک پنجابی شعر سنا تھا۔ سردیوں کی ششدرتی صبحوں کو ایک پو پھٹے گلی میں سے گاتا گزر جاتا ہے

تینوں سفا ہو جان گیاں

بابل ویاں گلیاں نی

د بے بابل کی گلیاں ایک دن خواب ہو جائیں گی

میں اپنے لحاف میں دبکا اس فقیر کی درد بھری آواز سنتا اور پھر سو جاتا۔ مجھے کیا معلوم تھا سچ مح ایک روز بابل کی گلیاں خواب و خیال بن کر رہ جائیں گی۔ کوئی بھی نہیں پہچانے گا۔ مسجدیں اُڑ جائیں گی۔ ان کے میناروں کے سنہری کلس مندروں کی بُرجیوں پر لگا دیئے جائیں گے۔ مکانوں کے چھتے جھک جائیں گے اور چھتوں پر پڑی چلمیں جل کر راکھ ہو جائیں گی۔ چھتوں کی منڈیروں پر سوکھی گھاس آگ آئے گی۔ کھڑکیاں تنگی اور بے حیا ہو جائیں گی اور سرگھر دبیز سے لے کر عقی کرے تک عریاں دکھائی دے گا۔ اس گلی کے سر پر سے چادر کس نے کھینچ لی تھی؟ اس کا سہاگ کون ٹوٹ کر لے گیا تھا؟ کل تک یہ گلی میرے محلے کی مانگ تھی اور اس مانگ میں سہاگ کا زعفران مہک رہا تھا اور جوڑے میں سوتیلے کے سفید پھول مگرا تھے، لیکن آج اس پر گندی خشک خالی کا گمان ہو رہا تھا۔ کل اس گلی میں سے سفید نسواری، سیاہ بُرقعوں میں لپٹی، شرمیلی، حیا دار، سسٹی سمٹائی ٹرکیاں گزرا کرتی تھیں اور آج یہ تنگے سر، برہنہ پاؤں بیچ بازار میں کھڑی تھی۔ کل یہ بھی دور دور سے اپنے پاس بلا یا کرتی تھی اور آج یہ اتنے قریب سے بھی نہیں پہچان رہی تھی۔

یہ اندھی، سنگدل، ویران گلی!

اس گلی نے ہمارا دودھ پیا ہے۔ ہمارا خون پیا ہے۔ اس نے وفا کا ہل ہم سے لیا اور پیمانہ وفا غیروں سے باندھ لیا، لیکن۔۔۔ لیکن یہ گلی تو مر چکی ہے اور میں اس کی لاش پر کھڑا آنسو بہا رہا ہوں۔ مجھے لاش پر آنسو نہیں بہاتے۔ میں آنسو بہانے والی اُمت میں سے نہیں ہوں۔ مجھے اس لاش پر پاؤں رکھ کر آگے گزرنے کی ضرورت ہے۔ زمین میں دھنستے ہوئے اس ٹھنڈے بے جان پتھر کو پیچھے چھوڑ کر ابھرتے ہوئے روشن چاند کی طرف جاتا ہے۔ اس کی آواز پر کانوں پر ہاتھ رکھنے ہیں۔ اس کے کھنڈر پر ایک نیا، درخشاں اور تابناک تاج عمل تعمیر کرنا ہے۔ الوداع! میری تاریک گلی کے روشن چہرہ! میں ایک نئی گلی کے آفتق پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کی کرنیں میری آنکھوں میں بہیں اور اس کی روشنی میرے راستوں پر ہے۔

امرتسر کی مسجدیں

امرتسر میں مسجدیں بہت تھیں۔ پر شکوہ پربلال، کشادہ، رب عظیم کی حمد و ثناء سے گو نجاتی ہوئیں اور توحید کی فضا نے سردی میں سرشار ٹھنڈی نیم روشن ڈیوڑھیوں اور پھول دار بیلوں میں چھپی ہوئی محرابوں اور پُرسکون، برآمدوں والی مسجدیں۔ جن کے دودھیا گنبد اور سنہری کلس دھوپ میں چمکا کرتے تھے۔ ان میں ایسی مسجدیں بھی تھیں جنہیں محلے کے مکانات نے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ کچھ مسجدوں کے کشادہ صحنوں میں لبالب بھرے ہوئے تالاب بھی تھے جہاں بیٹھ کر نمازی وضو کیا کرتے ان تالابوں میں سرخ مچھلیاں تیرا کرتی تھیں۔ جمعہ کے روز یہاں شامیائے تان دیئے جاتے اور مسجدوں کی چھتیاں اور صحن ابلے ابلے پاکیزہ کپڑوں والے نمازیوں سے بھر جاتے۔ فضا میں عطر گلاب اور عطر حنا کی خوشبوئیں بس جاتیں خاص خاص موقعوں پر ان مسجدوں کو جھاڑ فانوس کیلے کے پتوں اور رنگ برنگی جھنڈیوں سے خوب سجایا جاتا رات کو چراغاں ہوتا اور اگر قبیلوں کی خوشبو سارے محلے کو مہکا دیتی۔

لیکن یہاں میں صرف ان مسجدوں کا ذکر کروں گا جن سے میرے بچپن اور جوانی کی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔ یہ وہ مسجدیں ہیں۔ جو آج بھی میرے خوابوں میں آتی ہیں اور جن کی پھولوں میں چھپی ہوئی محرابوں سے لگ کر میں بند آنکھوں سے آنسو بہاتا ہوں ان میں سے کوئی بھی مسجد میرے لئے مسجد قرطبہ سے کم نہیں۔ امرتسر میرا ہسپانیہ تھا۔ میرا اندلس تھا اور کہنی باغ میں اندلس کا الحما تھا۔ جہاں میں سات سو سال تک رہا اور پھر مجھے میری مسجد قرطبہ اور میرے الحما کی روشنیوں پر شہید کر دیا گیا۔ گلاب کے وہ سرخ پھولوں جو ان باغوں اور مسجدوں کے صحن میں کھلا کرتے تھے آج بھی میری یادوں کی سجدہ گاہوں میں شگفتہ و تروتازہ ہیں اور میں اپنی بند آنکھوں میں ان پھولوں کی شبیہ ٹھنڈک اور نفسی گرم میں ان کی آسمانی خوشبو محسوس کرتا ہوں۔

آیتے میں سب سے پہلے آپ کو اپنے محلے کی، اپنی گلی کی مسجد میں لئے چلتا ہوں۔ میں نے تو اس مسجد میں داخل ہونے سے پہلے اپنے آنسوؤں سے وضو کر لیا ہے۔ آپ بھی وضو کر لیں۔ یہ مسجد ہمارے گھر کے عین سامنے تھی اور مسجد عیدالون کہلاتی تھی۔ وہ دیکھتے پیر جی صفت بیٹھے محراب کی دیوار سے ٹیک لگائے کتابت کر رہے ہیں۔ لکڑی کا لمبوتراروغنی قلعان قریب بڑا ہے یہ ہماری مسجد کے امام ہیں نام ان کا بھول گیا ہوں۔ سب انہیں پیر جی کہتے تھے اونچے لمبے دھیرا بدن، بھری بھری ڈاڑھی، جس میں سفید بال بھی تھے۔ خالص کشمیری تھے۔ محلے کے باتوں اور میری نانی سے کشمیری زبان میں گفتگو کرتے تھے سر پر کلاہ پہنتے۔ جمعہ کی نماز سے پہلے خطبہ دیتے تو نسواری رنگ کا ایک جیتہ زیب تن ہوتا۔ فرصت کے وقت محلے کے بچوں کو دینیات پڑھاتے اور حدیث و فقہ کے مسودات کی کتابت کرتے۔ کسی وقت مسجد کی رونٹ پر بیٹھے گلی میں آنے جانے والوں کو غور سے دیکھا کرتے۔ ہماری شرارتوں پر بڑی سختی سے ہمارے کانوں میں ناخن چبھو کر بڑی نرم آواز میں سرزنش کرتے تھے۔ کشمیری لہجے میں پنجابی بولتے تھے۔ ہم وضو کرنے والے حوض کی ٹونٹیاں کھلی چھڑ کر بھاگتے تو ہمیں لپک کر پکڑ لیتے۔ کان کی ٹوئیں انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے ناخن چبھو کر بڑی شفقت سے کہتے۔

”ٹوٹی کھلی نہیں چھوڑ دی“

مسجد کے پیچھے ان کا گھر جس کا ایک راستہ حجرے میں سے بھی جاتا تھا۔ پیر جی کا لڑکا امین میرا بھولی تھا۔ غضب کا شرارتی تھا۔ کبھی آرام سے نہیں بیٹھتا تھا اور کچھ نہیں تو مسجد کی چھت پر چڑھ کر گلی میں سے گزرتے لوگوں کو روٹے مارنے شروع کر دیتا۔ امرتسر میں ایک سرکس آیا۔ جس میں ایک کتا بندی سے آگ میں چھلانگ لگاتا تھا۔ ہم دونوں نے مسجد کے کچھوڑے ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں بالٹی سے پانی بھرا۔ کتے کو لے کر امین چھت پر چڑھ گیا۔ میں نے پانی میں مٹی کے تیل سے بھری ہوئی بوری کو آگ لگا کر ڈال دیا۔ امین نے اوپر سے کتے کو پھینک دیا۔ کتے کی قسمت اچھی تھی کہ باہر گرا اور بچ گیا۔ پیر جی کے حجرے میں ایک نوبت پڑی تھی۔ رمضان المبارک میں سحری اور افطار کے وقت یہی نوبت بکائی جاتی۔ یہ نوبت کبھی میں بجاتا اور کبھی امین بجاتا تھا۔ زیادہ تر یہ فرض مسجد کا موفن ہی سرانجام دیتا تھا۔ لیکن ہمیں نوبت بجانے کا بڑا شوق

تھا۔ ایک روز افطار کے وقت سے پانچ چھ منٹ پہلے ہی نوبت بجا دی۔ پیر جی ڈنڈا لے کر ہمارے پیچھے بھاگے۔ رات کو مجھے بھی گھر سے مار پڑی اور امین کی بھی خوب خبر لی گئی۔

ایک روز میں اور امین ساتھ ساتھ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ پہلے سجدے کے بعد سر اٹھایا تو میری جیب سے ایک دوٹی نکل کر صف پر گر پڑی۔ دل میں سوچا کہ سلام پھیرنے کے بعد اٹھائوں گا۔ لیکن دوسرا سجدہ کرنے کے بعد جو دیکھا تو دوٹی غائب تھی۔ معلوم ہوا کہ امین نے سجدے کے دوران کمال چاکل دستی سے اٹھالی تھی۔ ایک روز امین نے مجھے کہا:۔

”میں ہوا میں اڑ سکتا ہوں۔“

”نکو اس کرتے ہو۔“

”میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اڑ کر دکھاتا ہوں۔“

وہ مجھے ساتھ لے کر قبرستان گھی منڈی والی سڑک پر گیا۔

”یہاں کھڑے ہو کر دیکھتے رہنا۔ وہ جو ٹاہلی ہے نا۔ بس اس کے پاس جا کر میں ہوا میں اڑھاؤں گا۔ یہ کہہ کر امین نے شلوار کے پائینے اوپر کئے اور ماتوں کی بند مٹھیوں کو چوم کر اندھا دھند بھاگ اٹھا۔ میری نظر اس ٹاہلی پر تھی۔ جہاں سے امین نے ٹیک اوت کرنا تھا۔ آپ یقین کریں کہ وہ اس ٹاہلی کے پاس پہنچ کر غائب ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور اڑ گیا ہو گا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ سڑک پر دکھائی دیا۔ دونوں بازوؤں کو ناپٹنے والیوں کی طرح لہراتا میری طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اس کا سانس بھولا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

”تم نے مجھے اڑتے ہوئے دیکھا تھا نا؟ پورے قبرستان کا پھر لگا کر آیا ہوں۔ جی ٹی روڈ والے بجلی کے کھمبے سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔“

آج بھی جب وہ منظر یاد آتا ہے کہ امین کس طرح رقص کرتا میری طرف بھاگا چلا آ رہا تھا تو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔

گرمیوں میں مسجد کے کنوئیں پر نہانے والوں کا جھوم رہتا۔ دو سقاوے تھے۔ جن کی ٹوٹیوں میں مسواکیں ٹھنی ہوئیں تھیں۔ فرش پر پھیلی تھی اور دیواروں پر سبز کاٹی جی تھی۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ منہ سر صابن کی جھاگ میں چھپا ہے اور سقاوے کی مسواک نکل کر فرش پر گر پڑی ہے اب ایک ساتھ سقاوے کے سوراخ پر ہے کہ پانی نہ نکلے اور دوسرے ہاتھ سے فرش پر سے مسواک تلاش کی جا رہی ہے نہ مسواک مٹی اور

نہ پانی کی دھار رکتی۔ باہر سے حیرانگاہی سقاوے میں بوکا ڈال کر آواز لگاتا ہے۔

چلو بھئی چھوٹے خلیفہ! اندر اتنی دیر کیوں لگا دی۔ گارڈ محمد حسین بٹ اپنے دانتوں پر کالی نوس ٹوٹھ پیسٹ کرتے ہوئے کہتا۔

”یہ لڑکا اگر شعلے میں ہو تو اس پر واٹر ٹینکس لگ جائے۔“

مسجد کے چوترے پر مٹی کا ایک بڑا پیالہ رکھا ہوتا جس میں محلے کے بچے اور عورتیں آکر کڑوا تیل ڈال جاتی تھیں۔ یہ تیل مسجد کے لئے ہوتا۔ چوٹی پہلوان سقاوے کے باہر بیٹھ کر اسی تیل سے اپنی مالش کیا کرتا۔ ایک بار پیر جی نے اسے کہا۔

”چوٹی! کبھی نماز بھی پڑھ لیندی۔“

چوٹی پہلوان کو بڑی شرم آئی۔ اسی روز نماز کے وقت وضو کر کے جماعت کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ بعد میں محلے کے ایک آدمی نے اس کی نماز پر سخت تنقید شروع کر دی۔

”تمہارا وضو غلط تھا۔ تمہارا رکوع ٹھیک نہیں تھا۔ تم نے ہاتھ ٹھیک طرح سے نہیں باندھے تھے۔ تمہاری نماز قبول نہیں ہوگی۔“

چوٹی کو بڑا غصہ آیا۔ سر پر بندھا ہوا صافہ اتار کر زور سے فرش پر مارا اور اتنا کہہ کر مسجد سے باہر نکل گیا۔

”اب کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔“

امام مسجد پیر جی کو بڑا افسوس ہوا۔ وہ اسی وقت چوٹی کے گھر گئے اور اسے کچھ ایسی محبت، پیار اور اخلاق کے ساتھ سمجھایا کہ وہ اس کے بعد سے پکا نمازی بن گیا۔ پیر جی کا اخلاق بڑا بلند تھا۔ مسجد کی رونمائی پر بیٹھے ہوتے اور گلی میں گورتے ہر چھوٹے بڑے کو سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے۔ میں نے کبھی انہیں کسی کے ساتھ اونچی آواز میں بات کرتے نہ سنا تھا۔ مسجد میں اگر ہم شور مچاتے تو اپنے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر ہمیں منع کرتے۔ زیادہ شرارتیں کرتے تو بس کان میں فرسا سانا سن چھو دیتے۔

عید میلاد کے مبارک دن اسی مسجد کے باہر سے جلوس تیار ہوتا۔ ہم میں سے ہر لڑکے کی یہی خواہش ہوتی کہ سبز پرچم تمام کر جلوس کے آگے آگے چلے اس روز امین کی دوستی بڑی کام آئی۔ وہ مجھے ایک نہ ایک جھنڈا ضرور تھا دیتا جسے کندھے کے ساتھ لگا کر میں بڑی شان سے جلوس کے ساتھ ساتھ

چلتا۔ رات کو مسجد میں ختم شریف ہوتا تو فیروز نعت خوان کی آواز محلے کے ہر گھر میں جاتی۔ میں بڑے شوق سے تبرک کے مکھانے اور کھجوریں لے کر گھر جاتا۔

مسجد کی چھت میں ایک خوبصورت فانوس لگا تھا۔ جس کی روشنی میں دیواروں پر لگی زرد روغنی ٹائلیں اور ان پر ابھرے ہوئے۔ گلاب کے پھول چمکا کرتے۔ گرمیوں کی سسنان دھیموں میں مسجد کے صحن سے اذان کی آواز ابھر کر فضا پر چھا جاتی۔ نماز کے وقت مسجد کے دروازے کے آگے عورتیں اور محلے کی لڑکیاں اپنے کمن بچوں اور بھائیوں کو کاندھے سے لگائے کھڑی رہتیں نماز کے بعد نمازی باہر نکلتے تو ان بچوں پر پھونکیں مارتے جاتے۔

سن ۱۹۷۱ء کے اگست کے مہینے کی چودہ تاریخ کی رات کو ہمارے محلے پر ہندوؤں اور سکھوں نے اس قدر شدید فائرنگ کی کہ اتنی گولی پہلے کبھی نہیں چلی تھی۔ اسی رات پیر جی کا مسجد کے حجرے میں انتقال ہو گیا دوسرے روز ہماری گلی کے آہنی دروازے پر ڈوگرہ فوج نے بم مارا ہر طرف جھگڑا مچ گئی۔ عورتیں، بچے جوان اور بوڑھے سرسیمہ ہو کر گلی کے دوسرے دروازے سے ہو کر جی ٹی روڈ پر آ گئے۔ سامنے شریف پورہ تھا بیچ میں ایک سڑک تھی۔ برج پھولا سنگھ میں نہنگ سکھ بیٹھے اندھا دھند گولیاں برسار رہے تھے۔ غلام محمد شال مرچنٹ کا بڑا لڑکا موسیٰ اپنے بچے کو گود میں اٹھائے نالا عبور کر رہا تھا کہ گولی بچے کے سر میں لگی اور کھوپڑی کو توڑ کر اس کے باپ کے سینے سے نکل گئی۔ دونوں نالے میں گرے اور پاکستان پر قربان ہو گئے۔

کیا کیا کچھ پاکستان پر قربان ہو گیا! کیسے کیسے انمول موتی خاک میں مل گئے! ہماری تاریخ کا یہ ایک الم انگیز باب ہے جس کا ہر ورق ہمارے عظیم شہداء کے خون سے سرخ رو ہے۔ جس کی ہر سطر ایک دیوار گریہ ہے۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ پاکستان کی نئی نسل کو اس دیوار گریہ کے سامنے لے جاؤں۔ اس کی ایک ایک اینٹ پر اپنے شہیدوں کے خون کے چھینٹے دکھاؤں اور پھر ان سے پوچھوں کہ کیا یہ قربانیاں اتنی بھی اہمیت نہیں رکھتی کہ ہم اپنے وطن کی ابرو پر اپنی جانیں قربان کر دیں؟

تقسیم کے بعد میں دیراے کرام تر گیا تو اپنے محلے میں بھی آیا۔ مسجد عیدالون کے صحن میں پہلی کاہفتہ آگ رہا تھا اور اندر جہاں کبھی پتھر کے منبر پر بیٹھ کر پیر جی جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ وہاں گیش دیوتا کی مورتی رکھی تھی۔ اور ایک مہنت وہاں بیٹھا پوجا پاٹھ کر رہا تھا۔

بہر والی مسجد ہمارے بازار میں پکی گلی کے سامنے تھی۔ ڈیوڑھی سے گزر کر سیڑیاں مسجد کی گیلری کو جاتی تھیں جو مسجد کے اندر بنی ہوئی تھی۔ اس گیلری کا فرش کھڑی کا تھا اور رمضان شریف کے مہینے میں ہم بڑے یہاں تراویح پڑھا کرتے۔ گیلری میں تراویح اس لیے پڑھتے تھے کہ جب تک جلتے تو چپکے سے کھسک جایا کرتے۔ اس مسجد کے امام کا نام اگر بھول نہیں رہا تو احمد شاہ تھا۔ گورے چٹے ادھیڑ عمر کے کشمیری بزرگ تھے۔ شرعی دائرہ تھی۔ ہمیشہ سفید لباس پہنتے۔ سنہری فریم والی عینک لگی ہوتی۔ چہرے پر نور برسا کرتا۔ سر پر سفید صاف باندھتے تھے۔ بڑے ہی پاک صاف رہتے۔ ابراہیم عطار کی دکان شربت پینے آتے تو پہلے شیشے کے گلاس کو نمک سے دھواتے۔ پھر ہونٹوں پر تل کا دھلا دھلا یا رومال لٹک کر شربت پیتے۔ ہفتے میں شاید ایک بار وہ چپ کا روزہ رکھتے۔ پھر وہ چراغ سبزی والے کی دکان پر کھڑے ہو کر اشاروں سے سبزی خریدتے۔

اس مسجد کے باہر بڑا گھٹا درخت تھا۔ جس نے آس پاس کے مکانوں پر اپنا سایہ کر رکھا تھا۔ کنواں باہر کی طرف تھا۔ جہاں سے محلے کے بہشتی مشکیں بھر آتے۔ سحری کے وقت سخت سردی میں اس مسجد کی گیلری کی فضا گرم ہوتی۔ محرابوں پر غندے گرے ہوتے۔ جماعت کھڑی ہوتی تو مسجد کی فضا میں ایک پُر جلال خاموشی چھا جاتی۔ اس مسجد کی دیواروں پر قرآنی آیات کے قلعے لگے تھے یہ مسجد بھی اتنی کشادہ نہیں تھی۔ مسجد عیدالون کی طرح یہ بھی مکانات میں گھری ہوئی تھی۔ اس کے کنویں کے تھڑے پر سبز کائی جی رہتی۔ جس پر گرمیوں میں زرد بھڑی اگر بیٹھا کرتیں۔ ہم ان پر گیلا کا غذا مار کر پکڑتے۔ ان کے ڈنک نکال کر دھاگہ باندھ کر اڑایا کرتے۔ عید شبرات اور رمضان شریف میں اس مسجد میں بڑی رونق ہوتی۔

تقسیم کے بعد اس مسجد کو دیکھا کہ فترتہ حالت میں تھی لیکن کشمیری باتو اور پاٹھی یہاں رہ رہے تھے جن کی وجہ سے یہ مندر بننے سے بچ گئی۔

ہمارے محلے میں ہی کٹی کے باغ کے پہلو میں مسجد جان محمد تھی یہ مسجد دوسری منزل پر تھی اور کافی کشادہ تھی۔ نیچے دکانیں تھیں۔ ایک طرف سے یہ مال بازار کو لگتی تھی۔ مال بازار کی جانب مسجد کے نیچے امرتسر کے مشہور و معروف پینٹر عبدالغفار کی دکان تھی۔ مسجد کا دروازہ ہمارے بازار میں تھا۔ دونوں جانب دھوکے لئے نلکے لگے تھے۔ پیچھے سقاوے تھے۔ صحن چوڑا تھا۔ محرابوں پر غندے سردیوں

میں گرا دیئے جاتے اور گرمیوں میں پلٹے رہتے۔ دائیں جانب ایک احاطے میں مسجد کے بانی جان محمد کی قبر تھی۔ جو مسجد سے باہر تھی۔ اوپر کھلا آسمان تھا۔ امرتسر کا خوبصورت نیلا آسمان! سلام بابا اس مسجد کے پیش امام تھے۔ بھاری بھر کم، گھٹی سفیدی مائل داڑھی۔ چھوٹا قد مگر مضبوط جسم امرتسر کے پرانے کشمیریوں کی طرح سرخ و سفید رنگت تھی تیز تیز باتیں کرتے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر مسجد کے دروازے کے بالمقابل ان کا حجرہ تھا مگر بازار میں اپنے الگ مکان میں رہتے تھے ان کا ایک بڑا بالکل ان کی شکل کا تھا۔ عجیب سے بڑا تھا۔ عینک لگا تھا۔ اوپر والے ہونٹ پر سردیوں میں بھی پسینہ آیا رہتا۔ پانگ شو کے سگریٹ پیتا تھا۔ جس کی خوشبو مجھے بڑی اچھی لگتی تھی۔ گھر کی بیٹھک میں ہر وقت کتابیں پڑھتا رہتا۔ بڑا کم گو تھا۔ کسی وقت میری طرف دیکھتا تو مجھے موٹے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھوں میں ایک گہری اداسی کی جھلک دکھائی دیتی۔ تقسیم کے بعد پھر ان صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی مجھے ان کا نام بھی یاد نہیں رہا۔

اس مسجد کی ایک خاص بات یہ تھی کہ سال میں ایک بار یہاں کوئی کانفرنس ہو کرتی جو تین روز تک جاری رہتی۔ اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں سے علماء کرام تشریف لایا کرتے۔ ایک بار معراج شریف کے موضوع پر باہر سے آئے ہوئے ایک مولانا صاحب نے سائیفک حوالوں کے ساتھ ایسی پر مغز تقریر کی کہ لوگ عیش عیش کرا گئے۔ میں بھی اس جلسے میں بیٹھا تھا۔ امرتسر میں مدتوں ان مولانا صاحب کی تقریر کے چرچے رہے۔ اس مسجد میں مجھے اپنا نماز پڑھنا یاد نہیں۔ لیکن کانفرنس کے اجلاسوں میں ضرور جاتا تھا۔ تقسیم کے بعد اس مسجد کو بھی سرنگر سے آئے ہوئے کشمیریوں نے اپنی تحویل میں لے لیا اور سنا ہے کہ بوہڑ والی مسجد کی طرح یہاں بھی پانچوں وقت اذان ہوتی ہے۔

مسجد خیر الدین مال بازار میں تھی کشادہ صحن بیچ میں پانی کا حوض جس میں سرخ مچھلیاں تیرا کرتیں۔ چھتی ہوئی ڈیوڑھی میں ٹھنڈا ٹھنڈا نیم روشن اندھیرا سا چھایا رہتا۔ مولانا عطار اللہ شاہ بخاری نے اس مسجد میں جو دلولہ اگیو پر جوش تقریریں کیں وہ امرتسر کے مسلمانوں کو آج بھی یاد ہوں گی۔ جس روز شاہ صاحب کی تقریر ہوتی مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی چونکہ لڑکیوں کی یادوں کے سہارے یہ مضمون لکھ رہا ہوں اس لئے شخصیتوں کے منصوبوں کے تعین کے سلسلے میں اگر کوئی سہو ہو جائے تو معذرت

چاہوں گا میرا خیال ہے کہ امرتسر کے مشہور اور جید عالم دین مفتی محمد حسین اس مسجد کے پیش امام تھے۔ میں انہیں اکثر اس مسجد میں تشریف لاتے دیکھا کرتا تھا۔ ان کے ایک پاؤں میں تکلیف تھی۔ جس کی وجہ سے وہ پیوں والی کرسی پر بیٹھ کر تشریف لاتے ان کے قابل قدر صاحبزادے حافظ عبید اللہ میرے دوست تھے اور ماٹار اللہ اب بھی ہیں حافظ عبید اللہ اس مسجد میں حدیث اور فقہ پڑھتے بھی تھے اور درس بھی دیتے نو عمری میں ہی علوم کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے ان کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کو ہم چشم غزال کیا کرتے تھے۔ ایسی خوبصورت آنکھیں ہمارے دوستوں میں سے کسی کی بھی نہیں تھیں آج بھی جب کبھی وہ مجھے ملتے ہیں تو میں ان کا ٹھنڈا چشمہ اتار کر چشم غزالاں کا دیدار ضرور کر لیتا ہوں۔ مسجد کی ڈیوڑھی میں دائیں جانب ایک حجرہ تھا جہاں حافظ شفیع بچوں کو قرآن شریف پڑھایا کرتے دبلے پتلے، خوش مزاج، خوش اخلاق و پرہیزگار، استعنا اور توکل علی اللہ کی زندہ تصویر مجھ سے عمر میں پندرہ بیس سال بڑے تھے۔ سبحان اللہ! تکیہ کلام تھا۔ کھانے کو مل گیا تو سبحان اللہ فاقہ آگیا تو بھی سبحان اللہ کہہ کر مسکرا دیتے۔ بار بار سے دو آنے کی چائے کی چٹیک منگواتے صندوقچی میں سے ٹین کی گول ڈبی نکال کر اس میں سے تھوڑا اصلی زعفران چائے میں ڈالتے اور پھر جب زعفران کی خوشبو اڑتی تو پیالی ہمارے آگے بڑھاتے ہوئے مسکرا کر کہتے۔

”سبحان اللہ“

بات کرتے وقت ان کے منہ سے لوگ کی خوشبو آتی کرتی۔ کیونکہ وہ پان میں لوگ ڈال کر کھاتے تھے۔ مسجد کی ڈیوڑھی میں ان کے حجرے کے باہر ایک گھنی بیل کا سایہ تھا جس کی شاخیں موسم بہار میں گلابی پھولوں کے جھرمروں سے لد جاتیں۔ یہ پھول فرش پر بھی گرا کرتے۔ حافظ شفیع ان پھولوں کو دیکھ کر کہا کرتے۔

”سبحان اللہ! میری بیل نمازیوں کے قدموں میں پھول بچھا کر دیتی ہے۔“

اب میں آپ کو مسجد عید گاہ کی طرف لئے چلتا ہوں۔

یہ ہمارے محلے کی عید گاہ والی مسجد تھی۔ دروازہ رام باغ سے نکل کر سیدھا کھپنی باغ کی طرف چلیں تو جی روڈ کراس کرنے کے بعد یہ مسجد بائیں ہاتھ کو ریوے پھاٹک سے پہلے آتی تھی عید گاہ کی چار دیواری میں ایک دروازہ تھا۔ دروازے کی ڈیوڑھی میں سے گزریں تو سامنے انار کے درختوں

نے اپنی ٹھنڈی چھاؤں ڈال رکھی تھی۔ اس کے بعد عید گاہ کا محقر سامیان تھا۔ یہاں ہم اگلے اگلے پہن کر ماؤں کے لگائے ہوئے سرے اور عطر میں بے عید کی نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر یہاں چھوٹے چوڑے بنے تھے۔ جن پر بکر کھڑے ہوتے اور اللہ اکبر کی صدا کو آگے بڑھاتے آج کل لاؤڈ سپیکروں کی وجہ سے بہت کم بکر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہر شخص نے اپنے گھر سے لایا ہوا کپڑا آگے بچھایا ہوتا۔ جس پر کھڑے ہو کر عید کی نماز پڑھی جاتی اور بیٹھ کر عید کا خطبہ سنا جاتا۔ خلیفہ یسین صاحب اس مسجد کے امام تھے جن کا گھر ہماری گلی میں تھا۔ سیاہ گھنی شرعی ڈاڑھی اور مشہدی کے ساتھ بڑے بارعب گئے۔ مسجد کے چھوٹے سے باغچے میں ان کا جڑہ بھی تھا۔ ریلوے لائن عید گاہ کی دیوار کے پار تھی ہم اس دیوار پر بیٹھ کر ریل گاڑیاں دیکھا کرتے تھے مسجد کے حوض کے ارد گرد برسات میں موٹی موٹی جامنیں ٹپکنا کرتیں جنہیں ہم بہت شوق سے کھلیا کرتے۔ مسجد کے سامنے والے درختوں میں انار پکتے تو ہم خلیفہ صاحب کی نظریں بچا کر انہیں توڑ کر نیکر کی جیبوں میں بھر لیتے سادوں کی لمبی جھڑیاں لگتی تو ان جامنوں میں کوئیں بولا کرتیں۔

برسات کی بارش میں خالی نیکریں پہنے، ننگے پاؤں اپنے محلے سے نکل کر عید گاہ والی مسجد میں آتے اور جامن کے درختوں پر چڑھ کر جامنیں توڑا کرتے۔ بچپن ہی سے ہمارے دلوں میں یہ فوف بٹھا دیا گیا تھا کہ جامن کا پیڑ بڑا کچا ہوتا ہے پھر بھی ہم بندروں کی طرح ان درختوں پر چڑھ کر کھل کھاتے اور کھیل تماشے کیا کرتے۔ گرمیوں کی راتوں کو چھت پر سوتے ہوئے میری آنکھ کھل جاتی تو میں دیکھتا کہ امرتسر کے پچھلے پہر کے آسمان پر نیلے چمکیے ستاروں کے فانوس جگمگا رہے ہیں۔ ہر طرف گہری، ٹھنڈی، شبنم آلود خاموشی ہے اور عید گاہ کی طرف سے کوئل کے بولنے کی آواز آرہی ہے یہ قلب کو گرما دینے والی اور روح کو تڑپا دینے والی آواز میں آج بھی آدمی آدمی راتوں کو کبھی کبھی سنتا ہوں اور کمرے سے باہر نکل کر آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھتا ہوں لیکن وہ سبز پانی کا حوض اور جامن کے درختوں کے جھنڈ کہیں نظر نہیں آتے۔

پاکستان بننے کے بعد یہ مسجد بھی ویران ہو چکی تھی۔ عید گاہ میں لوگوں نے کواٹر بنائے تھے اور امام صاحب کے حجرے میں ایک سکھ شزار تھی سا نیکیوں کو پنکچر لگا رہا تھا۔ حوض پر ہلکے ہوئے جامن کے درخت ویران ہو گئے تھے اور حوض میں لمبی لمبی خشک گھاس اگی تھی، مسجد کے صحن

میں ایک جانب سکھوں نے گائے بھینسیں باندھ رکھی تھیں اور اناروں کے درخت کہیں بھی نہیں تھے نہ انار تھے۔ نہ اناروں والا راستہ تھا۔

مسجد قاصداں ہمارے گھر سے دوسرے محلے میں تھی۔ مجھے اس محلے کا نام یاد نہیں رہا۔ کمرہ جیل سنگھ سے نکل کر ہم چوڑے کی دکانوں والے ایک بازار میں آ جاتے۔ یہاں سے نکلتے تو دائیں جانب ایک گلی مڑتی۔ آگے گوبروں کا دیہڑا آ جاتا۔ یہاں مکانوں کی دیواروں پر پھاتیاں لگی ہوتیں گوبر کی بدبو پھیلی ہوتی اسی گلی میں ایک جگہ سفید چھوٹے میناروں اور دو دھیا گنبد والی چھوٹی سی مسجد قاصداں مکانوں کے درمیان میں جیسے کوزے مہری کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ جمعہ کی نماز میں اپنے چھوٹے بھائی یا کسی دوست کے ساتھ ہمیشہ اسی مسجد میں پڑھنے آتا۔ اس کی وجہ امرتسر کے آتش نوا اور شعلہ بیاں مبلغ دین مولانا ترنم کا خطبہ تھا پھندرنے والی رومی ٹوپی بھری بھری گھنی ڈاڑھی اور چوڑے شانوں والا گٹھا ہوا جسم۔ درمیانہ قد، پاٹ دار آواز تقریر کرتے ہوئے جوش میں آتے تو گردن کو دائیں بائیں ہلاتے جاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر عالی پر مولانا ترنم کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑتے عموماً سفید قمیض شلوار میں ہوتے۔ چلتے وقت رومی ٹوپی کا پھندا گردش میں ہوتا۔ امرتسر کا بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔ جن محلے میں ان کی تقریر ہوتی وہاں لوگ شہر سے کھینچ کھینچ کر پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی تقریر کرتے کرتے اچانک پنجابی میں مکالمے شروع کر دیتے۔ جب لوگ ان کی کسی بات پر محفوظ ہوتے تو مولانا اچانک کوئی جملہ بلند آواز میں ادا کرتے اور ہر طرف سنا جاتا۔

جمعہ کے روز اس مسجد میں شامیانے تن جاتے چھت پر عورتوں کے لئے نماز ادا کرنے کا انتظام ہوتا مسجد میں کل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی۔ مسجد چھوٹی تھی اور دھنکرنے کا انتظام محدود تھا۔ میں عموماً گھر سے دھنکرنے کے جایا کرتا۔ خطبے کے وقت مولانا ترنم سرخ گلاب کے باروں سے لدے پھندے، سیاہ جینہ پہنے، رومی ٹوپی کے اوپر سفید رومال لپیٹے منبر پر تشریف لاتے تو مجھے یوں لگتا جیسے عباسی دور کا کوئی خلیفہ مسجد میں نکل آیا ہے۔ ان کی گردن سرخ گلابوں میں چھپی ہوتی۔ پھولوں کی کچھ ٹپکڑیاں ان کی ڈاڑھی میں بھی سجی ہوتیں ان کے آتے ہی مسجد کے صحن میں ہر شخص جہتہ تن گوش ہو جاتا وہ خدا اور اس کے رسول مقبول کی حمد و ثنا کے بعد قرآن حکیم کی کوئی آیت پڑھتے اور پھر خطبے کی تقریر اپنے چشے سے نکل کر عظیم سمندر کی طرف بڑھنا شروع کر دیتی۔ وہاں کوئی مانگر و فون اور لاؤڈ سپیکر نہ تھا لیکن مولانا ترنم

کی آواز سے گئی محلے کے درو دیوار گونج رہے ہوتے۔

اب نہ وہ مسجد رہی ہوگی اور نہ اس گئی محلے کے درو دیوار مولانا ترنم کی تلاوت کلام پاک سے گونج رہے ہوں گے۔ پاکستان بننے کے بعد میں اس مسجد کو نہ دیکھ سکا۔ ظاہر ہے اب وہاں سب کچھ ہوگا مگر مسجد نہیں ہوگی۔ امرتسر سے ہجرت کرنے سے دو تین روز پہلے سنا تھا کہ مسجد قاصداں کے علاقے میں خوفناک آگ لگی ہوئی ہے۔

بہاولپور روڈ سے ایک سڑک قبرستان سے ہو کر بن آباد کو جاتی ہے۔ اس کے موڑ پر سڑک کے کنارے مولانا ترنم محو خواب ہیں۔ میں وہاں سے گزرتے ہوئے انہیں بہت یاد کرتا ہوں اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتا ہوں۔ مسجد قاصداں میں خطبہ دیتے ہوئے ان کا مسکراتا، نورانی چہرہ یاد آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ کبھی یہ خیال بھی آیا تھا کہ یہ زندگی سے بھرپور چہرہ جس مرقہ میں محو خواب ہوگا اس کا لوح مزار میں ہر روز آتے جاتے پڑھا کروں گا اس کا لوح مزار میں ہر روز آتے جاتے پڑھا کروں گا۔ یہ میرے امرتسر کے انمول میرے تھے جولاہور میں اگر اسودہ خاک ہوئے خدا ان کے درجات بلند فرمائیے۔ آمین!

اب میں آپ کو ایک ایسی مسجد میں لئے چلتا ہوں جو حجم میں شاید امرتسر کی سب سے چھوٹی مسجد تھی یہ کہنی بارغ کی ٹھنڈی کھوئی کے پہلو میں گویا کسی بڑی مسجد کے چھوٹے ماٹل کی طرح زمین پر رکھی ہوئی تھی۔ ساری کی ساری سبزی مائل پتھر کی تھی اور اسے شیخ صادق حسین نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کا گنبد نہیں تھا۔ چھوٹے سے دو مینارے تھے۔ پندرہ بیس نمازیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ دیواروں میں پتھر کی جالیاں لگی تھیں۔ چیت میں بجلی کے دو سبز گوب لگے تھے رات کو ان کی سبز روشنی جالیوں سے کرون کی طرح پھوٹ پھوٹ کر باہر آ کر تھی۔ دور سے دیکھنے پر یوں لگتا جیسے آسمان سے کوئی نتھاسا سبز ستارہ کہنی بارغ میں اتر آیا ہے۔

ان کی روشنی میں یہ درختوں پھولوں میں گھری ہوئی چھوٹی سی مسجد خود بھی ایک پھول لگتی۔ سبز پھول جو کسی درخت کی شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر گرتے ہی پتھر ہو گیا ہو۔ بہار کے موسم میں اس کی چھت پر درختوں سے پھول گرا کرتے۔ اس کے عقب میں ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی۔ گرمیوں کی صبحوں کو میں منہ اندھیرے میں گرنے آتا تو مجھے دور سے اس مسجد سے بلند ہوتی اذان کی آواز

سنائی دیتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے کہنی بارغ کے سارے درخت، سارے پھل، سارے پھول اور شاخے ٹھگوفے ایک ہی آواز کی لہروں میں بدل گئے ہیں۔ اللہ بہت بڑا ہے! اللہ بہت بڑا ہے۔ مجھے منہ اندھیرے کی پُر نور خاموشی میں اس اذان کی آواز میں درختوں، پھولوں اور ٹھگوفوں کی ٹھہک آتی محسوس ہوتی اور شکستہ گلاب کے سرخ پھولوں سے مجھے اذان کی آواز خوشبو بن کر ابھرتی سنائی دیتی ہے۔ میں پردہ کلب کے قریب سے گزر کر حوض والے درختوں کے جھنڈ میں آتا تو دور اس مسجد کی جالیوں میں سے پھوٹی سبز روشنی دکھائی دیتی۔ معلوم ہوتا آسمان سے فرشتے صبح کی نماز پڑھنے وہاں اترے ہوئے ہیں۔ میں سیر کرتا ہوا مسجد کے کچھوڑے چھوٹی ندی پر آ کر رک جاتا۔ یہاں مجھے ایک خوشبو آتی۔ موتیے کے پھولوں میں لپٹی ہوئی لالچیلوں کی خوشبو۔ یہ ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز خوشبو تھی۔ معلوم ہوتا جیسے وہ چھوٹی سی سبز مسجد سانس لے رہی ہے۔

مذہب یہ اس مسجد کے سانس کی خوشبو تھی۔ میں ندی کے چھوٹے سے پل پر بیٹھ جاتا اور مسجد کے ساتھ سانس لینے لگتا۔ افسوس! میرا سانس چھوٹا تھا اور خوشبو بہت بڑی تھی۔ بہت وسیع تھی۔ سارے کہنی بارغ، ساری دنیا، ساری کائنات پر محیط تھی۔ اس وقت دل سہی چاہتا کاش میری ساری زندگی ایک سانس میں سمٹ آئے۔ جسے میں اس خوشبو کے ساتھ اپنے اندر جذب کر لوں اور پھر کبھی اسے باہر نہ نکالوں۔ میں پلپا پر بیٹھا ندی میں بہتے پانی کی آواز سنتا سر۔ سرر ایک دھیمی۔ بہت دھیمی سی سرسراہٹ ایک خواب آلود سی سرگوشی۔ جیسے پچھلے پہر میں خاموشی میں ندی کا پانی کچھ کہہ رہا ہو۔ کچھ سنار رہا ہو اس پر جھکے ہوئے ام اور ناشپاتی کے درختوں کی شاخیں اور زیادہ جھک جاتیں۔ گویا جھک کر ہمہ تن گوش ہو کر ندی کی سرگوشیاں سن رہی ہوں۔ پانی کچھ بولتا ہو اگر جاتا اس کی لہروں پر تیرتے پھول بھی آگے نکل جاتے اور ان کی خوشبو ان کی دھیمی سرگوشیاں پیچھے رہ جاتیں۔

اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ آج یہ دھیمی خوشبودار سرگوشیاں بھی آگے نکل گئی ہیں اور میں وقت کے پل پر اکیلا بیٹھا، بہتے دریا کو دیکھ رہا ہوں۔

پاکستان بننے کے بعد میں امرتسر گیا تو کہنی بارغ کی اس خوبصورت چھوٹی سی سبز مسجد چھوٹے سے سبز پھول کو اس حالت میں دیکھا کہ وہاں سوائے دو چار ٹوٹے پھولوں کے اور کچھ

نہیں تھانہ سبز جالیاں نہ سبز روشنیوں کے گوب اور نہ صبح کی شبنمی فضاؤں میں ابھرتی اذان کی آواز اور نہ اس مسجد کے سانس کی مقدس خوشبو۔ سبز پھول، پھری سانس لے کر مرجھا گیا تھا۔ اور ہوا اسے اڑا کر لے گئی تھی۔

لیکن امرتسر کی میری مسجدیں ان کی اذانیں ان کے سارے پھول ان پھولوں سے اٹھتی خوشبوئیں میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ میں پانچوں وقت ان مسجدوں سے بلند ہوتی اذانوں کی آواز سنتا ہوں۔ مجھے ہر سانس کے ساتھ ان اذانوں کی جھک اُتی ہے اور میں گلاب کے ہر پھول میں محرابوں سے پھوٹتی روشنیوں کی کرنیں دیکھتا ہوں۔ اندلس نہ رہا، قرطبہ نہ رہا۔ لیکن مسجد قرطبہ کی اذانیں تو ہمارے ساتھ ہیں ہمارے لئے تو ساری دنیا ایک مسجد ہے۔ سارا وطن پاک، ایک مسجد ہے اور اس مسجد کا صحن کس قدر کشادہ ہے۔ کتنے حسین ہیں وہ بارغ جو اس مسجد کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں! کس قدر خوب صورت ہیں یہ ٹھنڈی چھاؤں والے درخت جن کی شاخوں کے پھول خانوس بن کر اس مسجد کی دیواروں پر جھول رہے ہیں اور کتنی سحر خیز ہیں یہ اذانیں جو اس مسجد کے میناروں سے صبح و شام بلند ہوتی ہیں:-

وطن پاک خدا کا گھر ہے۔ خدا مجھے دنیا کی جنت سے نکال دے لیکن اپنے گھر سے کبھی نہ نکالے۔

امرتسر کا رمضان المبارک

(میری والدہ محترمہ) کے چلنے اور برتن اٹھانے رکھنے کی آواز آرہی ہے۔ سامنے والی مسجد میں باجی ٹوٹلی کھول کر وضو کر رہا ہے اور زور زور سے کھانس کر گلا صاف کر رہا ہے۔ کہیں کہیں مسلمانوں کے مکانوں سے پانی پینے کی آوازیں آنے لگی ہیں۔

آپو جی نے باورچی خانے سے میری بڑی بہن سرور کو آواز دی ہے۔

”آج اٹھنا نہیں بانو!“

میری بڑی بہن کھمڑے پڑھتے ہوئے اٹھتی ہے اور سر پر دوپٹے لے کر باہر نکل گئی ہے۔ کیوڑا کھٹنے سے بروت کی مانند ٹھنڈی ہوا میری ناک کو لگی ہے۔ میں آنکھوں پر سے لحاف ڈرا سا اٹھائے طاق پر چلتے ہوئے کڑوے تیل کے دیٹے کو دیکھ رہا تھا۔ دیٹے کی نو سرور ہوا میں ذرا سی کپکپا کر پھر سیدھی الف ہو گئی ہے۔ مجھے اس نویں روشنی و نور کی ننھی منی پر یاں ناچتی نظر آرہی ہیں۔

”وے حمید! وے اٹھ وے دہی لیا“

اب آپو جی نے مجھے آواز دی ہے۔ میری ڈیوٹی یہ ہے کہ میں دکان پر سے جا کر دہی لاؤں۔ فور گوگے بگل والے کے بگل کی بے سُر آواز گونجی ہے۔ ساتھ ہی اُس نے اپنی گونگی زبان میں زور سے آواز لگائی ہے۔ گلی کے کونے میں غلام رسول علوانی کی دکان کے پاس حافظ جی نے اپنی نوبت بکائی ہے۔ اُن کے نوبت بجائے کا انداز یہ ہے کہ پہلے دو ہاتھ کھلے سجاکر ایک ٹکے کے لیے رکتے ہیں اور پھر ایک منٹ تک دھڑا دھڑا بجاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نوبت ان کے گلیے میں لٹکی ہوئی ہے۔ گھنی سیاہ ڈاڑھی، گنٹھا ہوا بدن بچپاس برس کی عمر میں جوان لگتے ہیں۔ بینائی سے محروم ہیں لیکن رزقِ حلال کی دولت سے مالا مال ہیں سارا دن غلام محمد ہٹوانیے کی دکان پر اُٹھے میرے

کی بوریاں ڈھوتے ہیں۔ انہیں لگی مٹے کے ایک ایک گھر کا پتہ ہے۔ کشمیری ہیں۔ دو ڈھائی من کی بوری کمر پر لا کر قرآن شریف کی آیات کا ورد کرتے گل میں چل پڑتے ہیں اور سیدھے اسی گھر کا جا کر روزہ کھٹکھٹاتے ہیں جہاں انہیں جانا ہوتا ہے۔ لاشی اُن کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ پسینے میں شرابور حافظ جی بوری کے ساتھ ٹیک لگا کر ڈیوڑھی میں بیٹھ جاتے اور لاشی دروازے پر مار کر آواز لگاتے۔

”خلیفہ جی آٹے کا بوری آیا“

رمضان شریف میں وہ گئے میں نوبت نکال کر مٹے کے روزہ داروں کو سحری کے وقت جگایا کرتے انہیں سب معلوم تھا کہ کس مکان میں کون رہتا ہے، چنانچہ ہر گھر کے آگے جا کر نوبت بجاتے اور پھر لاشی مکان کے بند کیواڑوں پر مار کر اُس مکان میں رہنے والے کا نام لے کر اُسے جگاتے۔ ہمارے دروازے پر نوبت بجا کر وہ ہمیشہ کہا کرتے۔

”خلیفہ عبدالعزیز! اٹھو میاں اٹھو!“

ہماری گلی میں شیخ سنار کے مکان کے بالکل سامنے دو بھائی جلال دین اور کمال دین رہا کرتے تھے۔ انہیں فوت ہونے مدت ہو چکی تھی، لیکن حافظ جی سحری کے وقت اُن کے مکان پر جا کر ہمیشہ یہی آواز لگاتے۔

”جلال دین کمال دین مرحوم! اٹھو میاں! اٹھو!“

حافظ جی کی نوبت اب ہمارے مکان تک پہنچ گئی ہے۔ آپو جی نے مجھے پھر آواز دی ہے میرا بڑا بھائی لحاف کے اندر ہی اندر مجھے ٹھوکے دے رہا ہے۔

”چل بمبئی اٹھ“

مجھے نیند بھی آرہی ہے، مگر سحری کے وقت گلی میں نکلنے کا شوق بھی ہے۔ اُن لوگوں کو دیکھ کر شوق جو ڈھول تاشے بجاتے روزہ داروں کو جگاتے ہیں۔ بچی گلی کی طرف سے نعتیں گانے والوں کی ٹولی کی آواز آتی ہے۔

جلوہ گر جلوہ گر جلوہ گر ہو گیا

شاہ جن و بابر جلوہ گر ہو گیا

سامنے والی مسجد عیدالون کے باگھی نے سحری کے شروع ہونے کی نوبت بجا دی ہے۔ دھادم

دھادم دھادم۔ اب میں لحاف سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا ہوں اور باہر صحن میں آ گیا ہوں۔ برف آٹن ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے میرے ماتھے کو چوم لیا ہے۔ باورچی خانے کے دروازے پر مندا پڑا ہے میں سندا اٹھا کر اندر جاتا ہوں۔ باورچی خانے کی فقنا گرم ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی نے گرم شال اوڑھادی ہو۔ آپو جی نے دونوں چوہے جلا رکھے ہیں۔ دیواروں پر کٹریں کے شعلوں کی چمک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک چوہے پر رات کا پکا ہوا گرم پالک کا ساگ گرم ہو رہا ہے اور دوسرے چوہے پر سبز چائے دم ہو رہی ہے۔ چائے کی خوشبو اڑ رہی ہے۔ آپو جی کا سرخ و سفید گول کشمیری جیروہ چائے کی خوشبو اور آگ کی روشنی میں دمک رہا ہے۔ میں وہی کا برتن اٹھا کر باہر جانے لگتا ہوں کہ آپو ڈانٹ کر کہتی ہیں۔

”فردے کے جا دیں دے“

فرد یعنی گرم کشمیری شال اوڑھ کر جانا۔ میں فردے سے بڑا گھبراتا تھا۔ میں چھوٹا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال کی عمر ہوگی اور فرد بڑی تھی۔ وہ گلی میں مجھے سے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ ویسے بھی اس عمر میں سردی کم ہی لگا کرتی ہے اور پھر ہم غریب مھنتی ماں باپ کی اولاد تھے۔ سردیوں میں تنگ پیر ہی گیوں میں بھاگتے پھرتے تھے۔ کبھی زکام تک نہیں ہوا تھا۔ میں ٹھنڈا کٹورہ ہاتھ میں لیے گلی میں آگیا ہوں۔ آسمان پر چکیے ستارے بڑے بڑے موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ گلی دور تک سنانا ہے۔ مسجد کے کنوئیں میں سے برکت ماشکی بو کے نکال نکال کر مشک بھر رہا ہے۔ کنوئیں کی چرخ کی چیلوں چیلوں کی آواز گلی کی خاموشی فضا میں گونج رہی ہے۔ برکت ماشکی بچپن سے لوگوں کے گھروں میں پانی بھر رہا ہے۔ اب وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ کمر جھک گئی ہے۔ ہاتھوں اور پنڈلیوں کی سبز رگیں پھول گئی ہیں۔ وہ کنوئیں میں سے پانی نکالتے ہوئے ساتھ ساتھ گا بھی رہا ہے۔

کدی میں دی مدینے جاواں۔

سیدہ کے گھر کی کھڑکی بند ہے۔ روشندان میں سے ملکی ملکی روشنی گلی کی کبر آلود فضا میں چھن رہی ہے۔ وہ سحری کے لیے اٹھی ہوگی۔ اُس نے لمبے سنہری بالوں کو پیچھے سے مقام کر سر پر جوڑا سا جالیا ہوگا اور پرات میں آٹا گوندھ رہی ہوگی۔ چودھری نور دین کے مکان میں سے پراٹھوں کی خوشبو آرہی ہے۔

میں لگی کے سرے پر پہنچا تو دھول والا بازار میں پہنچ گیا تھا۔ اُس نے بڑے زوردار انداز میں
دھول کو خوب پیٹا۔ پھر آواز لگائی :-
جاگو اللہ کے پیارو! جلال دین آگیا!
سو توں کو جگا گیا!

میں بڑے اشتیاق سے اُسے دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے دکان پر بیٹھے ہوئے میرے والد صاحب
سے پوچھا:

”خلیفہ جی کیہ وجہ لگیا اسے؟“

اور پھر دھول بجاتا تیز تیز قدموں سے اُگے نکل گیا۔ ڈاک خانے کے پاس گونگے کا تیز آواز
تین رنگ گونج اٹھا۔ پھر وہ نازن کی طرح اپنی گونگی آواز میں چیخ اٹھا۔ میں وہی برتن میں ڈلو کر واپس
لگی کی طرف مڑا تھا کہ گونگے کے رنگ کی آواز بہت قریب ہی گونجی۔ اب وہ بھاگتا ہوا ہاتھ میں رنگ
تھامے بازار میں نمودار ہوا۔ لگی کی طرف منہ کر کے اُس نے زور سے رنگ بکایا۔ نازن کی آواز میں،
ایک وحشی چیخ ماری اور اُگے کو نکل گیا۔ میں اپنے مکان کے پاس پہنچا تھا کہ سامنے سے نعت خوانوں
کی ٹولی کے گیس کی روشنیاں لگی میں جھلانی۔ میں اپنے مکان کے سامنے مسجد کے قطرے پر
کھڑا ہو گیا۔ ٹولی سبز رنگ کے گونا گونا رنگی لگے جھلاتے جھنڈے اٹھائے نعت پڑھتی آرہی تھی۔
وہ مسجد کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ نعت خوانوں نے سروں پر سبز صاف باندھ رکھے تھے۔
ایک آدمی نے گیس اٹھا رکھا تھا۔ گیس کی روشنی میں نعت خوانوں کے چہرے چمک رہے تھے
اور سردی میں گاتے وقت منہ سے بھاپ نکل رہی تھی۔ میں فرد میں لیٹا۔ وہی کا کٹورہ ہاتھ میں
مسجد کے قطرے پر کھڑا گردن ایک طرف ڈھکائے آنکھیں ٹکیرے اُس ٹولی کو نعت پڑھتے دیکھتا
رہا۔ مجھے ان ٹولیوں کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اکثر وہ میرے سوتے ہی لگی میں سے نعتیں پڑھتی نکل
جایا کرتی تھیں۔ لیکن اگر میری آنکھ کھل جاتی تو میں بھاگ کر کھڑکی میں آن کھڑا ہوتا یا لگی میں نکل آتا۔
مجھے یوں لگتا جیسے نعت خوانوں کی یہ ٹولیاں خیال کی دنیا سے آتی ہیں اور خوابوں کی سرزمین کو چلی
جاتی ہیں۔

ٹولی نعت کا پورا بند وہاں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا اور پھر نعت پڑھتی ہوئی وہاں

سے نکل گئی۔ میں نے آنکھیں سے سیدہ کے مکان کی طرف دیکھا۔ سیدہ جی ذرا سی اوپر اٹھائے نعت
خوانوں کو لگی میں سے گزرتے دیکھ رہی تھی۔ گیس کی روشنی میں سیدہ کی ناک کا سرخ کیل چمکا اور
پھر وہ پیچھے ہٹ گئی۔

بانگی مسجد کے رونٹ پر بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھے قطرے پر کھڑے دیکھ کر کہا۔
”اوے! وہی لے کے گھر جا۔“

عمدو کا کانا بنائی کے تنور میں سے نارنجی رنگ کے شعلے نکل کر چھت کو چھو رہے ہیں۔
گامی سینڈ و دونوں ہاتھوں سے میدے کے پیڑے بنا کر تختے پر ساتھ ساتھ جوڑے جا رہے ہیں۔ عمدو
کا کاکڑے میں دودھ اور کھجوریں بھگور رہا ہے۔

بودی چوکیدار منہ سر لیٹے گرم فوجی برانڈی میں لیٹا پنچ پر ڈنڈا ہاتھ میں لیے بیٹھا سگریٹ پی رہا
ہے اور اس کا بادامی رنگ کا کتا اُس کے پاؤں میں سگڑا بیٹھا ہے۔ بودی اپنی طرز کا واحد سپرے دار
ہے۔ وہ ساری رات بوٹ پیٹی کے منہ سر لیٹے پنچ پر دراز رہتا ہے۔ ادھر ادھر کہیں کوئی کھٹکا ہو تو
گتا جا کر خبر لاتا ہے۔ بودی اپنی جگہ سے ہرگز نہیں ہٹتا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ غزنی لگی کی جانب کسی شے
کے گرنے کی آواز آئی۔ رات کے دو بجے کا ٹل تھا۔ بودی نے کتے کو اشارہ کیا۔ کتا لپک کر دوڑاؤ
کوئی ایک منٹ بعد کتے کے بھونکنے اور چور کے شور مچانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کوتوالی کے
پاس جا کر کتے نے چور کو گرایا۔ پھر بودی بڑے آرام سے اٹھا، برانڈی کی پیٹی کسی، ہاتھ میں ڈنڈا
تھاما، سگریٹ سٹگایا اور کوتوالی کے پاس جا کر چور کو اس حالت میں پکڑا کہ وہ نیچے سڑک پر گرا ہوا تھا
اور کتا اس کی چھاتی پر چڑھا بھونک رہا تھا۔ بودی ہر فن مولا بھی ہے، محلے میں کسی کا پتکھا، گراموفون
مشین، بجلی کی امتری، تالہ چاہے کچھ خراب ہو بودی اُسے ایک دم سارا کھول کر دوبارہ ٹھیک کر دیتا۔
اب لگی کے ہر گھر کے باورچی خانے میں لیمپ روشن ہیں اور کہیں کہیں پر نالوں سے پانی
گرنے کی آواز آرہی ہے۔ میر صاحب بھی جاگ اُٹھے ہیں اور بڑی اونچی آواز میں کسی آیت شریفہ
کا بار بار ورد کر رہے ہیں۔ بوڑھا جھکی ہوئی کمر والا گاما شکی کمر پر پانی سے بھری ہوئی مشک لیے
میرے قریب سے گزر گیا ہے۔ چمڑے کی گیلی مشک میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔
میں۔ اتنی سردی میں وہ صبح صبح لوگوں کے ہاں پانی بھرتا ہے خدا جانے اُسے سردی کیوں نہیں لگتی۔

میں دہی لے کر اپنے گھر آگیا ہوں۔ گھر میں سبھی بیدار ہو چکے ہیں۔ ایک اور نعت خوان ٹولی نعت گاتی ہوئی گلی میں سے گزر گئی ہے۔

تینڈی سواری یا نبی عرشی بریں آتے گئی لے دیکھ کے جلوہ مورتے موسیٰ نون ہوش درہی لے میں کھڑکی کی طرف بھاگتا ہوں۔ ٹولی گیس کی روشنی میں سبز جھنڈے لہراتی گلی کا موڑ گھوم رہی ہے اُن دنوں ہمیں روزہ رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ ہم بڑے اشتیاق سے سحری کے وقت اٹھ کر سحری کھاتے لیکن دوپہر کے بعد جب بھوک برداشت سے باہر ہو جاتی تو ہم پانی پی کر روزہ توڑ دیتے، مگر گھر میں کسی کو نہ بتاتے۔ افطاری کے وقت گھر پہنچ جاتے اور پھل وغیرہ رکابی میں رکھ کر یوں نوبت بچنے کا انتظار کرنے لگتے جیسے بڑے روزہ دار ہوں۔ کسی روز روزہ رکھ بھی لیتے تھے۔ اس روز تو گھر کے علاوہ سامنے والی مسجد میں جا کر بھی افطاری کی مٹھائی اور پھل وغیرہ اڑاتے۔

میرے ہم جو لیوں نے ڈیوڑھی میں اگر مجھے آواز دی ہے۔ میں نے جلدی جلدی سحری کھائی ہے اور آدھے پرائے میں ایک بوٹی رکھ کر اپنے ساتھ لے کر نیچے آگیا ہوں۔ ہم بچے خیر دین گڈی والے کی بند دکان کے پھٹے پر ایک دوسرے میں گھس کر بیٹھ گئے ہیں اور باتیں کرنے لگے ہیں۔ اب گلی میں سے نہ تو کوئی نعت خوانوں کی ٹولی آرہی ہے اور نہ دھول تاشے بجا کر جگانے والے آرہے ہیں۔ یہ لوگ بھی اب سحری کھانے میں مصروف ہوں گے۔ اب گلی میں اکا دکا فقیروں کی صدائیں آنے لگی ہیں۔ گلی کی ٹکڑ پر اکتارے والا سائیں نمودار ہوا ہے۔ لمبی جٹائیں، سرخ آنکھیں، پر سوز آواز اور کندھے پر بیوند لگا کیل۔ وہ اکتارے پر گاتا ہوا چلا آرہا ہے۔

تیرا ہو جائے گا باغ ویران

تے والی نے ٹر جاناں

مجھے یاد ہے میں اس کی آواز پر بڑا آداس ہو جاتا تھا۔ مجھے یوں لگتا جیسے والی چلا گیا ہے اور باغ ویران ہو گیا ہے۔ درخت سوکھ گئے ہیں۔ ندی نالے خشک ہو گئے ہیں۔ گھاس پر زرد پتے بکھرے پڑے ہیں۔ ابراہیم عطار کے گھر کی جانب اس بوڑھے فقیر کی آواز گونجی ہے جو ہر مکان کے پاس کھڑا ہو کر حضرت بابا فرید گنج شکر کا یہ شعر پڑھتا ہے اور پھر آگے چل دیتا ہے۔

اٹھ جاگ فرید استیا تیری ڈاڑھی آیا بڑا • اگلا نیڑے آگیا، تے بچپارہ گیا دور

اُن دنوں میں اس شعر کے مفہوم سے بے خبر تھا۔ میں بوڑھے فقیر کی زبان سے اسے سنا تو مجھے یوں لگتا جیسے ایک بوڑھا آدمی سے جس کی ڈاڑھی پر آم کا بوڑگر رہا ہے۔ مجھے اس بوڑھے کا چہرہ بڑا نڈانی لگتا اور میری آنکھوں میں ٹھنڈے نور کی روشنی سی سما جاتی۔

سحری کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ گلی میں چیل پیل شروع ہو گئی ہے۔ مکانوں کے دروازے، محلے میں۔ کوئی دودھ لے کر جا رہا ہے۔ کوئی دہی لے کر جا رہا ہے۔ گرم بچھونوں سے زبردستی اٹھوائی گئیں بچیاں سردی میں ٹھہرتی، تیند بھری آنکھیں لیے تنور کے پاس رومال بچھائے بیٹھی ہیں اور اپنی باری کا انتظار کر رہی ہیں۔ کسی کے مکان کا در کچھ کھلتا ہے اور کسی عورت کی آواز بلند ہوتی ہے۔

”کاکا جی! بڑی دیر ہو گئی۔ اذان ہونے کو ہے۔ لالی کو کچھے دے دیں اب۔“

کاکا عمدا دھڑ سے اُدھر جھولتے ہوئے تنور میں کچھے لگا بھی رہا ہے اور لوہے کی لمبی سلاخوں سے انہیں نکال بھی رہا ہے۔ گرم گرم بادھی اور سرخ رنگ کے خستہ کچھے، گردے تاخاٹے تنور سے نکلتے ہی رومالوں اور ٹوکریوں میں سمٹ کر گلی محلتے کے مکانوں کو جا رہے ہیں سینڈ ورنے دہی کا پیالہ اپنے پاس ہی تختے پر رکھا ہے۔ وہ میدانے کے پیڑے بھی گھڑ رہا ہے اور ساتھ دسی کچھ بھی کھا رہا ہے۔ یہ اس کی سحری ہے۔ میدانے کی بوڑیوں کے پاس چوکی پر رکھے ہوئے سادار میں سبز چائے جوش کھانے لگی ہے۔ کاکا عمدا اپنے کاربگر کو آواز دیتا ہے۔

”جیرے اونے۔ چائوں دیکھ۔“

سحری کا وقت ختم ہو گیا۔ گلی والی مسجد کی نوبت و صلاہم بجنے لگی۔ ہم بھاگ کر مسجد میں گھس گئے اور بانگی کو نوبت بجاتے دیکھنے لگے۔ دل میں ہمیشہ یہ آرزو رہتی کہ ہمیں بھی نوبت بجانے کا موقع ملے۔ بانگی اونچا لمبا پورا کشمیری ہا تو تھا۔ وہ دھڑا دھڑ نوبت کو کوٹ رہا ہوتا۔ جب وہ خشک جاتا تو ہم باری باری نوبت بجاتے اور بڑے فوش ہوتے۔ بانگی پانی پی کر گلا صاف کرتا اور اذان دینی شروع کر دیتا۔ اُن دنوں مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر نہیں لگے ہوتے تھے، مگر مؤذنوں کی آوازیں بڑی صاف، روشن اور پاٹ دار ہوتی تھیں۔ ہمارے محلتے کی اذان بکرواناں بازار میں جاتی اور وہاں کی اذان کی آواز ہماری گلی میں آیا کرتی تھیں۔ اذان کی آواز کے ساتھ ہی ہم سارے بچے دھنوکریوالی ٹوٹیوں کی طرف لپکتے۔ مؤذن جب اذان کے آخر میں اللہ اکبر کہتا تو ہم ٹوٹیوں سے منہ لگا دیتے

اور پیٹ بھر کر پانی پی لیتے۔ اس خیال سے کہ ہم نے روزہ رکھا ہے اور اب افطاری تک پانی نہیں پینا یہ دوسری بات ہے کہ ہم اسکول کے نلکے پر چھپ چھپ کر پانی پی لیا کرتے تھے۔

مسجد کے خرابی دروازوں پر بندے گرے ہوتے۔ باہر ٹھنڈے فرش والے صحن میں سخت سردی ہوتی، لیکن مسجد کے اندر کی فضا نیم گرم ہوتی اور نمازی بڑے سکون سے عبادت کرتے۔ یہیں نماز پڑھنی نہیں آتی تھی۔ کچھ نماز پڑھنے کا شوق اور کچھ دسمبر کی ٹھنڈی رات میں مسجد کے اندر کی گرم فضا کا تصور ہمیں کھینچ کر مسجد کے اندر لے جاتا۔ سب سے پچھلی قطار میں ہاتھ باندھے، آنکھیں بند کیے کھڑے ہو جاتے اور کبھی کبھی آنکھ کھول کر دیکھ لیتے کہ نمازی کب رکوع میں جا رہے ہیں اور کب سجدے میں۔ مجھے یاد ہے ایک بار مسجد میں شاید ستائیسویں کی رات تھی۔ تراویح کے بعد ختم شریف تھا۔ تمام نمازی مسجد کے اندر دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ بیچ میں رکابیوں اور خوانوں میں قسم قسم کی مٹھائیاں، کھجوریں گلاب کے عرق سے بھری ہوئی گلاب دانیاں اور پھولوں کے گلدستے رکھے تھے۔ اگر دانوں میں اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ فضا پھولوں، پھولوں، مٹھائیوں اور اگر بتیوں کی خوشبوؤں سے بو بھل ہو رہی تھی۔ اس پر فکر یہ کہ بانگی ہر دو منٹ کے بعد گلاب دانی اٹھا کر لوگوں پر گلاب کا عرق چھڑک دیتا۔ ہم عرق کے ٹھنڈے پھینٹوں سے بچنے کے لیے بازوؤں میں منہ چھپا لیتے۔ آخر ایک نمازی نے اسے منع کر دیا کہ وہ بار بار عرق نہ چھڑکے۔

ایک مقام ایسا آیا کہ بتیاں گل کر دی گئیں اور اندھیرے میں نمازی بند آواز سے بڑے ذوق شوق کے ساتھ "یا حنی ویا قیوم" کا ورد کرتے گئے۔ اندھیرے میں خدا جانے مجھے کیا سوچھی کہ میں نے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ بیچ میں رکھی ہوئی شکر پاروں کی پلیٹ کی طرف بڑھا کر شروع کر دیا۔ جونہی میرا ہاتھ نے پلیٹ میں رکھے ہوئے شکر پاروں کو چھوا، میں نے ڈر کر ایک دم ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ مجھ سے پہلے کسی کا ہاتھ شکر پاروں کی پلیٹ تک پہنچ چکا تھا اور ہم دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے نے بھی اپنا ہاتھ ڈر کر کھینچ لیا ہوگا۔ اتنے میں بتیاں روشن ہو گئیں۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک باریش بزرگ کو بڑے غور سے دیکھا۔ مجھے آج بھی اس بات کا یقین ہے کہ مجھ سے پہلے شکر پاروں کی پلیٹ تک پہنچا ہوا ہاتھ ان بزرگ کا نہیں تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد تراویح کا وقت ہوتا تو محلے بھر میں بڑی رونق ہو جاتی۔ کوئی اس مسجد میں تراویح پڑھنے جا رہا ہے تو کوئی اس مسجد میں۔ ان دنوں میں خوب نمازیں پڑھا کرتا اور تراویح تو بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ آخری تراویح کے قریب پہنچ کر ٹھک جاتا، مگر جماعت نہ چھوڑتا تھا۔ خاص طور پر جب نمازی دو تراویح کے درمیانی وقفے میں "یا ارحم الراحمین" کا ورد کرتے تو جذبہ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ میں آنکھیں بند کر لیتا اور پھر تصور میں خوبصورت باغ گھنے درخت، درختوں پر کھلے ہوئے پھول، سنہری دھوپ میں نیلے آسمان پر اڑتے سفید کبوتر اور آلوچوں کے باغ میں سے ہو کر گزرنے والی شبک رفتار نمایاں دیکھتا۔ آج بھی رمضان المبارک کے مہینے میں میں جب کسی مسجد، یہ آواز سنا ہوں تو بعینہ بچپن کی اسی کیفیت میں ڈوب جاتا ہوں۔

شبینہ یعنی ستائیسویں کی رات کو شہر میں اور خاص طور پر ہمارے محلے میں بڑی رونق ہوتی۔ اس رات میرا خیال ہے شاید ہی کوئی شخص سوتا ہوگا۔ گلی گلی، محلے محلے لوگوں کی چل قدمی رات بھر جاری رہتی۔ مسجدوں میں جھاڑ فانوس روشن ہوتے۔ میناروں اور گنبدوں پر لال پیل بتیاں روشن ہوتیں۔ مسجدوں کے دروازوں کو کیلے کے پتوں اور گیندے کے کیسری پھولوں سے سجایا جاتا۔ ان دنوں گیندے کے کیسری اور زرد پھولوں میں ایک عجیب قسم کی جھک ہو کر رہتی تھی۔ اور یہ پھول امرتسر میں بڑا عام تھا۔ ویسے تو امرتسر کے باغوں اور کھیتوں میں سجا پیازی رنگ کا گلاب بھی بڑی کثرت سے پایا جاتا تھا، لیکن گیندے کا رواج زیادہ تھا۔ بیاد شادیوں پر گیندے کے ہار پہنے جاتے تھے۔ میں سرویوں کی ٹھنڈی صبح کو سیر کے لیے باہر کھیتوں میں جاتا تو چالیس کنوؤں کی جانب ٹیوب ویل کے پھوڑے بٹالہ گورو اسپور کو جاتی ہوئی ریلوے لائن کے پاس کھیتوں میں گیندے کے پھول ٹھنڈی رخ شبنم میں بھیگے ہوتے۔ میں ذرا ہاتھ لگاتا اور میرا ہاتھ ٹھنڈی شبنم سے بھر جاتا۔ میں وہ ہاتھ آنکھوں پر لگالیتا۔ آج لاہور کی گرد و آلودگیوں پر چلتے چلتے گیندے کے ان پھولوں کی یاد آتی ہے تو اپنا خالی ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیتا ہوں اور میرا ہاتھ آنسو کی گرم شبنم سے بھر جاتا ہے۔ الوداع! گیندے کی جھک! الوداع! گلاب کی جھک! الوداع! سبز چائے اور لوہنگ کی خوشبو! الوداع! رمضان المبارک کی خوشبو!

شبینہ کا ہم بڑی بے تابی سے انتظار کیا کرتے اور ساری رات جگ کر گزارتے۔ ابھی مسجد میں لوگوں کی نہیں تو ابھی مسجد جہان محمد میں۔ وہاں سے اٹھے ہیں تو بال بازار والی مسجد خیر الدین میں تبرک

کھا رہے ہیں۔ ایک مسجد کے روضہ پر بیٹھ کر نان اور حلوہ کھاتے۔ دوسری مسجد میں جا کر پیالوں میں تیز نمک والی سبز چائے پیتے۔ سبز چائے کے بڑے بڑے پتیلے ہر مسجد کی ڈیوڑھی میں آگ پر چڑھتے ہوتے اور دو ایک بوڑھے ان کے پاس بیٹھے آگ تپ رہے ہوتے اور ساتھ ساتھ پتیلے میں پانی کے ڈونگے بھی اُٹھاتے جاتے۔ مسجد کے صحن سردی میں ٹھٹھ رہے ہوتے۔ مسجد کے خرابی دروازوں پر مندے گرے ہوتے اور اندر سے حافظ کے تیز قرآن شریف پڑھنے کی آواز آرہی ہوتی۔ سردیوں کی رات کے کھڑے ہوئے آسمان پر ستارے بڑی آب و تاب سے جھللا رہے ہوتے۔ لوگ ٹوٹیوں کے ٹھنڈے پانی سے دھو کر تے اور جلدی جلدی یخ بستہ صحن عبور کر کے مندا اٹھا مسجد کے اندر چلے جاتے۔

افطاری کے وقت یوں تو محلے کی دوسری دکانیں بھی خوب اہتمام سے سجائی جاتیں، مگر کاکا عمو کی دکان کی سچ و سچ نرالی ہوتی تھی۔ پہلے روزے ہی کو وہ دکان کے آگے فرش سے لے کر دکان کی پیشانی تک لکڑی کے لمبے لمبے تختے جوڑ کر سیڑھیاں سی بنا دیتا۔ ان سیڑھیوں پر سفید چادریں ڈال دی جاتیں اور ان پر ورق لگی باقر خانیان، بڑے بڑے اراروٹ، شیرمال، کھنڈ کھجور کے تھال نمکین کھجور کی سینیان، خشک شیش لگے گروے تافانے اور کچے اس طرح سجادیے جاتے کہ کہیں کوئی جگہ نہ بچتی۔ کاکا عمو بوسکی کی قمیض، ریشمی تہجد اور کالا پپ شوپنے خوشی سے جھوم جھوم کر دکان کے اندر باہر پھر رہا ہوتا۔ وہ اپنا سماوار تخت پر لا رکھتا۔ افطاری کی ذیت بچتی تو وہ سبز چٹے کا خوشبودار گھونٹ پی کر روزہ افطار کرتا۔ اس کا کارگر سینڈ وکابوں کو سودا دینے میں مصروف ہوتا اور ساتھ ساتھ چائے بھی پیتا اور کاکا عمو کی آنکھ بچا کر ایک آدھ کھنڈ کچھ اٹھا کر اپنی پیالی میں بھی گرا لیتا۔ عیناتی حلوائی کی دکان پر بھی بجلی کے قمقمے روشن ہوتے اور تختوں پر انواع و اقسام کی ورق لگی مٹھائیاں بجلی کی روشنی میں چمک رہی ہوتیں۔ اس کا لکڑی جی بھی مٹھائی کے سرخ گلاب جانے میں بڑا ماہر تھا۔ یہ گلاب بالکل سرخ گلاب کے پتوں کی طرح مٹھائی کے ہر تھال میں ہاروں کی طرح سجے ہوتے۔ دور سے وہ اصلی گلاب کے ہار معلوم ہوئے۔ مٹھائی کے یہ سرخ گلاب بڑے پیارے لگتے۔ میں حیران ہوتا کہ لوگ اسے کس طرح کھا جاتے ہیں۔ گھر میں مٹھائی کی ٹوکی اتنی تو میں گلاب کا پھول اٹھا کر اپنی الماری میں چھپا لیتا۔ دوسرے روز اس پر حیرتیاں چڑھی ہوتیں۔ میں پتوں کی مار مار کر چوٹیوں کو جھاڑتا، مگر وہ دو ایک روز ہی میں مٹھائی کا آدھا گلاب کھا جاتیں۔ اب مٹھائی کے وہ گلاب نہیں بنتے۔

اب گلاب ویسے بھی دکھائی نہیں دیتا۔ سرخ گلاب سے اب بیاہ شادی یا جنازے ہی پر ملاقات ہوتی ہے بیاہ شادی پر وہ موٹر کے پتے بونٹ پر ٹل رہا ہوتا ہے اور جنازے پر لوگوں کے پاؤں تلے کچلا جا رہا ہوتا ہے۔

امر تر کے رمضان المبارک کی سحری میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ سحری کا انتظار میں اس شوق سے کرتا گویا صبح عید ہے۔ تراویح کے بعد گھر کے سب لوگ سو جاتے، مگر میں جاگ رہا ہوتا۔ کان سحری کے وقت جگانے والی نعت خوانوں کی آوازوں یا ڈھول تاشوں کی دُور سے آتی صداؤں پر لگے ہوتے اسی انتظار میں، میری ہلکی بوجھل ہو جاتی اور میں سو جاتا۔ آدھی رات کو کسی وقت آنکھ کھل جاتی تو چپکے سے کھات سے نکل سخت سردی میں باہر صحن میں آجاتا۔ آسمان پر ستارے موتیوں کی طرح چمک رہے ہوتے۔ میں نے چند ستاروں کا حساب لگا رکھا تھا کہ جب یہ آسمان کے ایک خاص حصے میں آجائیں تو سحری کا وقت ہو جاتا ہے۔ میں بظنوں میں ہاتھ دیتے، سردی میں ٹھٹھرتا۔ آدھی رات کو مکان کے ٹھنڈے صحن میں اکیلا کھڑا آسمان کی طرف مندا اٹھائے اپنے مطلب کے ستارے تلاش کرنے لگتا، مگر وہ ستاروں کے عظیم جھرمٹ میں گم ہو گئے ہوتے اور مجھے کہیں نظر نہ آتے۔ پھر میں کھڑکی میں سے نیچے لگی میں جھانکتا۔ لگی کٹی کے لیمپوں کی دھیمی روشنی میں سنان ہوتی۔ پھر میں سانس روک کر بہہ تن گوش ہو کر دُور سے آنے والی کسی ڈھول کی آواز سننے کی کوشش کرتا۔ پھر بھلا رات کے ایک بجے کون جگانے آتا ہے! اب مجھے سردی لگنے لگتی اور میں نا اُمید ہو کر واپس اپنے کھات میں گھس جاتا اور گرم گرم کھات بہت جلد مجھے ایک بار پھر نیند کی دنیا میں لے جاتا۔ اور جب ڈھول تاشوں اور ٹوٹیوں کے نعتیں پڑھنے کی آواز پر آنکھ کھلتی تو یوں خوش ہوتا گویا کھویا ہوا خزانہ مل گیا ہو۔

رمضان شریف کی آخری سحری بڑی دل گداز اور آداس ہوتی۔ تراویح پڑھنے کے بعد روزہ دار ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے۔ حافظ اور سامع کو نذرانہ دیا جاتا۔ سر پر ٹپکا باندھا جاتا سحری کے وقت بہت کم ڈھول بجانے والے آتے۔ جوں جوں رمضان شریف کی آخری تاریخیں قریب آتی جاتیں، ایک ایک کر کے سب بچھڑتے جاتے۔ صرف گونگا بگل والا، حافظ ذہبت والا اور نعت خوان ٹولیاں باقی رہ جاتیں۔ نعت خوان ٹولیاں رمضان المبارک کی رخصتی کے گیت گاتے ہوئے آتیں۔

بہن ہوں جدائیاں لگیاں نے

پچھلے پہر لگی کی ٹھٹھرتی ہوئی سنان فضا ملکین لبادہ سا اور صلیتی۔ میں لگی میں اگر ایک ایک نعت خوان کی صورت کو تکتا رہ جاتا۔ اب یہ شکلیں ایک برس تک دیکھنے کو نہ ملیں گی۔ کون پچھل رات کو ستاروں کی چھاؤں میں اٹھتا ہے اور لگی لگتی پڑھتے ہوئے روزہ داروں کو جگاتا پھرتا ہے بھلا! میں اُن کے غم زدہ الوداعی گیت سن کر اداس ہو جاتا۔ بعض نعت خوانوں کی آنکھیں ابدیدہ ہوجاتیں مجھے یوں لگتا جیسے لگی میں سے کوئی دلہن ڈولی میں بیٹھ کر رخصت ہو رہی ہے بابل کے پیارے گھر کو چھوڑ کر سسرال جا رہی ہے۔ مجھے سحری ایک دلہن کے روپ میں دکھائی دیتی۔ سُرگیں آنکھوں او تاروں جڑے آنچل والی دلہن! پچھلے پہر کی دلہن! آنکھوں میں آنسوئیں۔ بابل کی دلیز سے قدم نہیں اٹھ رہے، مگر جانا بھی ضرور ہے۔ جدائی! جدائی! مقدور ہو چکی ہے۔ بوجھل دل لے کر ڈولی میں بیٹھ چکی ہے۔ سسکیاں ہیں۔ سکھیں کی آہیں ہیں۔ محبت کرنے والوں کی نگاہیں دور تک تعاقب کر رہی ہیں۔ ڈولی لگی میں سے ہونے ہوئے رخصت ہو رہی ہے۔ الوداع! الوداع! اے عروس رمضان! الوداع! تو نے گہر دم اٹھ کر ہمارے منہ شبنم سے دھلائے۔ یہاں ستاروں کی چھاؤں میں گیندے اور گلاب کے باغوں کی سیر کرائی۔ ہم نے تیرے دامن کو تمام کر صبح کی شبنمی ہواؤں میں پرواز کی۔ ہم تیرا خیال دل میں لے کر سوئے اور تیری یاد کو گے لگا کر تجھ سے رخصت ہوئے۔ الوداع! الوداع! گلاب کے پھول! قہوے کی خوشبو! دار چینی اور لونگ کی خوشبو! سبز چائے اور گیندے کی خوشبو!

میں نے گیندے کو ہاتھ لگایا تھا تو میرا ہاتھ پاکیزہ شبنم کے موتیوں سے چمک اٹھا تھا اور آج میں جس پھول کو ہاتھ لگاتا ہوں مجھے کسی مردہ جسم کو چھونے کا احساس ہوتا ہے۔ آہ! خوشبو، میرے بازوؤں میں پھول کی لاش چھوڑ کر اڑ گئی!

امرتسر کی عید

امرتسر کی عید کا خیال آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے ایک بھولی بھالی معصوم بچی کی تصویر آ جاتی ہے۔ اس کے ریشمی کپڑوں پر گونا گونا گے سر پر جھلک کرتی چٹنی ہے۔ آنکھوں میں کاجل لگا ہے۔ پیروں میں لال گرگابی ہے۔ لال پٹی چڑیاں کھٹک رہی ہیں۔ ایک ہاتھ میں غبارہ ہے اور دوسرے ہاتھ میں ورق لگی سویتوں سے بھری ہوئی نقالی ہے جس پر کروشیے سے کاٹھا ہوا سفید رومال پڑا ہے اور وہ لگی میں سے گزر رہی ہے۔ لگی عید کی خوشیوں بھری صبح کے ساتھ بیدار ہو گئی ہے۔ غباروں کے ساتھ گلے باجوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ گھروں میں مائیں بچوں کو نہلا دھلا کرتے نئے کپڑے پہنا رہی ہیں۔ گرم گرم سویتوں سے بھرے ہوئے طشتوں پر چاندی کے ورق لگا رہی ہیں۔ ہر گھر سے اصلی گھی ملی سویتوں کی مہک کے ساتھ جتنا کہ عطر، افغان سنو اور پاؤ ڈر کی خوشبوئیں آرہی ہیں۔ بچے لال گرابی داسکٹیں، ٹیلی پٹی ٹوپیاں اور نئے جوتے پہن گھروں سے نکل کر اپنے بہن بھائیوں اور ہم جویوں کے ساتھ لگی میں عنایتی مٹھائی والے، گاما گلیٹینوں والے، جان کھلوتوں والے اور عید دوہی بھٹے والے کی دکانوں کے باہر موڑھوں پر بیٹھ کر کھاپی رہے ہیں اور بے دھڑک عیدی کے پیسے خرچ کر رہے ہیں۔ سویتوں کی نقالیاں بھی سجائی بچیوں کے ہاتھوں ایک گھر سے دوسرے گھر کو جا رہی ہیں۔ لگی والی مسجد میں جتنے کے ہر گھر سے سویتاں پہنچ رہی ہیں۔ بانگی بھری ہوئی نقالی جڑے میں لے جاتا ہے اور خالی نقالی لے کر باہر آ جاتا ہے۔ سویتوں کے گھی سے اُس کے ہونٹ چمک رہے ہیں۔ آج اُس کی شوگر میٹھی بھی دھلی دھلائی ہے اور ڈاڑھی میں تیل لگا ہے۔

سحری کے وقت ڈھول تاشے بجا کر جگانے والے لگی میں گھوم پھر رہے ہیں۔ وہ ہر مکان کے آگے ہار ڈھول بجاتے ہیں اور وہی آواز لگاتے ہیں جو رمضان المبارک میں سحری کے وقت لگایا کرتے

تھے۔ ایک بڑے سے جھولے میں وہ سوتیاں، پلاؤ، چاول، آٹا، گڑ کی ریوڑی جو کچھ ملتا ہے ڈالتے جاتے ہیں اور پھر اگلے مکان پر جا کر آواز لگاتے ہیں۔

خیر دین اگیا، سوتوں کو جگا گیا۔

ہم انہیں بڑے شوق سے دیکھ رہے ہیں۔ اچھا تو یہ وہ پراسرار ڈھول والے تھے جو سڑوں میں پچھلے پیر کے اندھیروں میں ڈھول بجاتے گلی میں سے گزر جایا کرتے تھے۔ ایک طرف سے گونگا بگل والی نمودار ہوتا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں بگل بجا کر ٹانڈن کی طرح چیخ مار کر گلی میں سے گزر جاتا ہے۔

بازار میں سے سینما والوں کا جلوس گزر رہا ہے۔ دو آدمی دھڑا دھڑا ڈھول بجا رہے ہیں۔ ان کے چہرے سردیوں میں بھی پسینے سے تر ہیں۔ پرل ٹاکیو والا مشہور سکھ ترمی اچکن، چوڑی دار پا جامہ اور سیاہ جوتے پہنے ساتھ ساتھ ٹکی بجا رہا ہے۔ ٹکی بجاتے ہوئے ڈھول کی لے پر اس کا سر بھی ہل رہا ہے۔ پرل ٹاکیو میں بھی عید کی خوشی میں نئی فلم لگی ہے۔ گلی کے بچے جلوس کے ساتھ ساتھ ہولیتے ہیں اور جلوس کو اگلے محلے تک چھوڑ کر واپس آجاتے ہیں، محلے کی دکانیں دلوہنوں کی طرح سب ہوتی ہیں۔ کاکا عمو کی دکان کی تو آج سچ مچ ہی نرالی ہے۔ تخت پوش سے لے کر چھت تک ورق لگے اراروٹ، باقر خانیوں، کھنڈ قلیوں اور شیر مالوں کے تھال سجے ہوئے ہیں۔ عنایتی حلوائی نے قسم قسم کی مٹھائیاں بنا رکھی ہیں۔ لوگ کپاس کے سرکنڈوں سے بنی ٹوکریوں میں سیر سیر دو دو سیر مٹھائی لیے اپنے رشتے داروں کے گھروں کو عید کی مبارک دینے جا رہے ہیں عنایتی نے آج تھکے نہیں بنائے۔ قتلے ٹرڈ کے دن بنائے جاتے ہیں، کوئی دکاندار ایسا نہیں جس نے تخت بچا کر دکان آدمی سر تک نہ بڑھالی ہو۔ کیسر سنگھ اور میر حسن منہاری والے کی دکان پر بڑی گاڑی ہے۔ بچیاں ابھی تک کپ، کانٹے، کبوترے، گونا اور رنگ برنگے ربن خرید رہی ہیں۔ نوجوان اپنی پسند کی جڑا بنیں دیکھ رہے ہیں۔ ایک آدمی جھک کر اپنے بچے کی نیکر میں نئی پٹی ڈال رہا ہے۔ دوسرا اپنے ننھے بچے کو دکان کے تھڑے پر کھڑا کیے اس کے نئے بوٹ کے تسمے کس رہا ہے۔ دوست محمد قصائی کی دکان پر بھیڑ لگی ہے۔ وہ خود گوشت کاٹ رہا ہے۔ دوست محمد کافوری سفید ڈاڑھی والا سرخ و سپید چہرہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ پاؤں کے انگوٹھے میں چھری اٹکا کر وہ بڑے انہماک سے گوشت بنا رہا ہوتا تو

اس کے ہونٹ بائیں طرف کو اپنے آپ لٹک جاتے اور زبان کا پتلا سیراباہر جھلکنے لگتا اس کا بڑا بیٹا حسین مشین چلا کر قہر تیار کر رہا ہے اور چھوٹا بیٹا نذیر عورت جیرا سری پائے بنا رہا ہے۔ جیرا میرا دوست تھا۔ منہ اندھیرے وہ اپنی دکان کھولتا تو ہم رات کا بچا ہوا گوشت اور چربی اگ بھلا کر پکاتے اور مزے لے لے کر کھا جاتے۔ ایک بار وہ محلہ بجے والے کھوہ میں سری پائے بھنوانے گیا تو میں بھی اس کے ساتھ گیا۔ تنور میں سے آگ کے سرخ و زرد شعلے باہر نکل رہے تھے۔ ایک کالا بھونگ آدمی سامنے بوریے پر بیٹھا تھا۔ وہ بکری کی بری کو سلاخ میں گاڑ کر تنور میں لے جاتا۔ گوشت اور بالوں کے جلنے کی بو کے پھپکے اٹھتے۔ وہ جلدی سے بھنی ہوئی سیاہ کالی سری کو تنور سے باہر نکال کر دوسری طرف پھینک دیتا۔ میں آؤ جیرا اپنے سری پائے ٹوکری میں ڈال کر ایک طرف نکلے کے پاس بیٹھ گئے اور جھانویں سے انہیں نکل کر دھونے لگے۔ میں جیرے کو منع کیا کرتا۔

یارا ان کی آنکھوں پر جھانواں مت پھرو۔

اور جیرا ہنس کر کہتا۔

”اوئے، یہ تو میری ہوتی بریاں ہیں۔“

جیرا اور میں بڑے دوست تھے۔ ہم ایک ساتھ مل کر ہندو سکھوں کے محلے کے بجلی کے بلب توڑتے۔ اپنے محلے کی مرغیاں اٹھا کر قبرستان میں لے جاتے۔ وہیں ذبح کر کے انہیں خشک جھاڑیاں بھلا کر پکاتے اور کھا جاتے تھے۔ سنا ہے جیرا آج کل کراچی کی لی مارکیٹ میں دکان کرتا ہے اور مجھے بہت یاد کرتا ہے۔

ابراہیم عطار اور بندر سنگھ پنہاری کی دکانوں سے لوگ چاندی کے ورق، چینی، شہر، چھوہارے میوے گری اور بادام خرید رہے ہیں۔ بھاری بھر کم بدن، ناٹاقد، سرخ رنگ اور عینک کے شیشوں کے پیچھے جھللاتی آنکھیں۔ یہ ہے ابراہیم عطار۔ دکاندار کی سے زیادہ طب کی پڑائی کتابیں پڑھنے کا بے حد شوقین۔ ایک روز صبح صبح اگر دکان کھولی۔ خربت کی بوتلوں پر پانی چھڑک کر تانبے کی ٹوپیاں تان پر ڈالیں۔ پوری جھاڑ گدی پر بیٹھ گیا اور عینک صاف کر کے طب کی پڑائی کتاب کے مطالعے میں ڈوب گیا۔ اتنے میں ایک بچہ گلاس اتھ مٹی لیے آیا اور بولا:

”حکیم جی! اتنی کہتی ہے ایک آنے کا بیزوری خربت دے دیں۔“

ابراہیم عطار نے بڑے غصے سے بچے کو دیکھا۔ کتاب بند کر کے گدی پر رکھی اور یہ کہہ کر شربت کی بوتل اٹھائی۔

”عجیب مصیبت ہے۔ ادھر دکان کھولو، ادھر گاہک آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

گلی میں طرح طرح کے فقیروں کی صدائیں گونج رہی ہیں بٹے کئے گرز مارا ہتھوں میں کاٹے دار لوہے کے گرز اور شانے لیے ہر مکان کے اگے آواز لگا کر خیرات مانگ رہے ہیں۔ کوئی خیرات دینے سے انکار کرے تو گرز اپنے سر پر مار کر لوہان ہو جاتے ہیں۔ ایک فقیر ہمیشہ ہماری گلی میں آیا کرتا۔ اُس کے ساتھ اس کی بیوی بھی ہوتی۔ اونچا لمبا اور حیرت انگیز کایہ فقیر دھسے دھلائے کپڑوں میں ملبوس ہوتا سر پر سرمئی رنگ کی سمور کی ٹوپی ہوتی۔ وہ پان کھا رہا ہوتا اور بڑی بڑی مونچھوں میں کہیں کہیں سفید بالوں کے تار چمک رہے ہوتے۔ وہ میٹرھ صنم کا رہنے والا تھا اس کی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔ اس کا بچہ یہ مصرع یاد رہ گیا ہے۔

”بلا لے گیسوؤں والے“

اُسے دیکھ کر بچے ہمیشہ میکہ گور کی کے قازق کردار یاد آ جاتے تھے۔ اب گلی میں کمیاں یعنی کنول کے پھول بیچنے والی لڑکیاں نمودار ہو گئی ہیں۔ ان لڑکیوں نے سیاہ لمبی قمیضیں اور سیاہ تہمند باندھ رکھے ہیں۔ کانوں میں چاندی کی بالیاں ہیں۔ کندھوں پر کنول کے لیے لیے ڈنٹھلوں والے پھول ڈالے ہیں اور گلی میں آوازیں لگاتی پھرتی ہیں۔

”کمیاں لے لو کمیاں۔“

عورتیں کنول کے پھول خرید کر ان کے گھنے بنایا کرتیں۔ عید کے روز یہ جس گھر میں پھول بیچنے جاتیں وہاں سے سوئیاں ضرور اپنے حملے میں بھر کر لاتیں۔

بھنگینی سروں پر مقال اٹھائے ہر گھر میں جا رہی ہیں اور عید کی سوئیاں اور عیدی وصول کر رہی ہیں۔ امترسری عید کی تیاریاں ایک رات پہلے ہی شروع ہو جاتی تھیں۔ اُس رات کو حرفے کی رات کہا جاتا۔ حرفے کی رات میں خوشی سے نیند نہیں آتی تھی۔ تقریباً ساری رات جاگتے رہتے۔ حرفے کی رات کی خوشی بھی عید سے زیادہ ہوتی۔ یہ عید کی آمد کا اعلان تھا جس طرح دہسن کی زندگی میں شادی سے ایک روز پہلے کی رات، سہاگ رات سے زیادہ پُراسرار اور امنگوں بھری ہوتی ہے اس

رات کو حسین خوابوں کا محل تیار کیا جاتا ہے۔ سہاگ رات کو تو خواب ٹوٹ جاتے ہیں اور تعمیر کا سفر شروع ہوتا ہے یا زندگی کے دریا کے سرسبز کناروں پر خوشیوں بھری پک پک کا آغاز اور یا عبور۔ عبور دریا نئے شور۔

حرفے کی رات کو ہمارے محلے میں منہاری، پنساری، سبزی والے، گوشت والے اور درزی کی دکانیں نصف شب کے بعد تک کھلی رہتیں۔ امترسری کشمیری گھرانوں میں خاص طور پر یہ دستور تھا کہ حرفے کی رات کو شب دیگ اور ساگ مچھلی ضرور پکتی۔ شب دیگ کے لیے لال لال شلجم دوپہر ہی کو گھر میں آ جاتے۔ گوشت خاص طور پر گھر کا کوئی بڑا بوڑھا کھاتا۔ عشاء کی نماز کے بعد شب دیگ کو لکڑیاں جلا کر چولہے پر چڑھا دیا جاتا۔ دوسرے چولہوں پر ساگ مچھلی اور سفید چاول یعنی بھتہ پکنا شروع ہو جاتا اور گھر میں گرم سالوں کی تیز خوشبوئیں پھیل جاتیں۔ رت جگے کے لیے قبوہ تیار ہو جاتا اور ان سالوں میں در چینی اور بادیاں خطائی کی خوشبوئیں بھی شامل ہو جاتیں۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی جھٹ بازار سے منگوا لی جاتی۔ مجھے یاد ہے میں دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ ادھی رات باورچی خانے میں بیٹھا رہتا اور آپو جی اور بڑی بہنوں کو مختلف مانڈیوں اور ٹیلیوں میں کفگیر چلاتے دیکھتا رہتا۔ دل میں اس خیال سے پھول کھل رہے ہوتے کہ بس ابھی کوئی دم میں عید کی صبح طلوع ہو جائے گی اور ہم نئے نئے کپڑے پہن کر گلی میں دوستوں کے ساتھ نکل جائیں گے۔ غبارے خریدیں گے۔ وہی بھٹے کھائیں گے۔ سوئیاں اڑائیں گے۔ خواہ مخواہ رشتے داروں کے ہاں جا دھکیں گے اور عیدیاں وصول کرتے پھرے گے۔ ویلے اُن دنوں رشتے دار بھی آپس میں بڑا پیار کیا کرتے تھے۔ اب تو سوئے اپنے بچوں کے دوسروں کے بچوں سے کوئی پیار ہی نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ دور ہی محبت کا تھا، برکت کا تھا۔ اب ہر شے سے محبت اڑ گئی ہے۔ برکت جاتی رہی ہے ہم خوب بنے ٹھنڈے خالوں، پھوپھیوں کے ہاں جاتے۔ ہماری بڑی آؤ بھگت ہوتی۔ منہ سر چومے جاتے ذہرتی سوئیاں کھلائی جاتیں اور پھر عیدی دکی جاتی۔ اُس روز ہم بڑے شاہ خرچ ہوتے۔ ہر دکان پر جا کر کچھ نہ کچھ ضرور کھاتے۔ اب تو عید کے دن میں وہ رونق نہیں رہی۔ حرفے کی رات تو بالکل ہی ختم ہو گئی۔

اُس رات ہر دکان پر گیس یا بڑے بڑے بلب جل رہے ہوتے لوگ خرید و فروخت کر رہے

ہوتے۔ گھروں میں مشینوں سے سویاں نکل رہی ہوتیں۔ سردی کے باعث درزیوں کی دکانوں کے کپڑے نیم داہوتے۔ اندر روشنی میں ماسٹر صاحب اپنے کاریگروں کے ساتھ بیٹھے عید کے کپڑے تیار کر رہے ہونے۔ ہماری لگی کے ماسٹر شفیع بڑے وضع دار ٹیلر ماسٹر تھے۔ کیا مجال جو کبھی دھڑے پر کسی کو قمیص یا شلوار دے دیں۔ ایک بار میں اُن کی دکان پر بیٹھا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے اور بولے۔

”لایئے ماسٹر صاحب قمیص“

ماسٹر صاحب نے بڑے اطمینان سے حقے کا کش لگایا اور کہنے لگے۔

”بس ذرا بٹن لگنے والے رہ گئے ہیں۔ آپ ایسا کریں گول ہٹی سے جا کر بٹن لے آئیں۔“

وہ صاحب بولے۔

”مگر ماسٹر صاحب میں تو ملیمے پر جا رہا ہوں۔ آپ نے تو صبح کا وعدہ کیا تھا۔“

”میں نے کب انکار کیا ہے خواجہ صیب! آپ بٹن لائیں اور قمیص لے جائیں۔“

وہ صاحب سر جھکا کر بٹن لینے چل دیئے۔ اُن کے جاتے ہی ماسٹر صاحب نے حقے کی نئے

پرسے کی اور کاریگر کو پیچ کر کہا۔

”اوائے لیا اوئے خواجہ کی قمیص۔“

معلوم ہوا کہ قمیص صرف کٹی ہوئی ہے، سلائی ابھی نہیں ہوئی۔ لیکن آفرین ہے ماسٹر شفیع پر

کہ جب تک خواجہ صاحب گول ہٹی سے بٹن لے کر آئے، قمیص سل کر تیار ہو چکی تھی۔

عنائتی حلوانی عید پر مٹھائی بنانے کے لیے دکان کے آگے سڑک کے کنارے نئی بھٹی بناتا۔

حرفے کی ساری رات بھٹی کو لینے پوتے اور دکان کے اوپر شامیانے تاننے میں گزر جاتی۔ شامیانہ

ہمارے محلے میں قریباً ہر تیسرا دکاندار ضرور اپنی دکان کے اوپر تان دیتا۔ اس کی وجہ سے محلے میں چھاؤں

سی ہو جاتی جس کے نیچے سے گزرتے وقت میں بڑی خوشی ہوتی۔ دوست محمد کی دکان میں گردن کٹے

بکرے اور دنبے لٹے لٹے ہوتے اور گھروں میں دھڑا دھڑا گوشت جا رہا ہوتا۔ چراغ سبزی

والے کو سر کھلانے کی فرصت نہ ہوتی میر حسن منہاری والا کبھی کوئی پکیٹ کھولتا، کبھی الماری

کھولتا، کبھی کسی گاہک کی فرمائش پر دیوار کے ساتھ چھت تک گئے خانوں پر سیڑھی لگا کر چڑھ

جاتا اور کبھی کسی بچی کو گز سے ربن ناپ کر دیتا۔ اسد جو نے شاد سنار کی دکان کے تختے پر اپنا سامان

کر رکھا ہوتا۔ قدیم روسی جہاز رانوں ایسی بڑی بڑی مونچھوں کے اندر اُس کے دانت چمک رہے ہوتے اور ہ سمور کی کوٹ میں لپٹا لپٹا یا چائے کی چٹکیاں لے رہا ہوتا۔ بوڑھی چوکیدار بجلی کے کھمبے کے نیچے اپنے پنچ پر برائڈی اوڑھے بیٹھا پنڈلیوں پر گرم خاکی پٹیاں لپیٹ رہا ہوتا۔

اب حرفے کی رات آدمی کے قریب گزر گئی ہے۔

بچے عید کی مسرتوں کے خواب آنکھوں میں سمائے بچھونوں میں دُکب گئے ہیں۔ ایک

بچے کے بعد محلے کی دکانیں بند ہو گئی ہیں صرف ماسٹر شفیع کی دکان کے بند کیواڑوں کے پیچھے

سے سنگ مرثین چلنے کی آواز آرہی ہے۔ کسی وقت ماسٹر صاحب اقبال کا کوئی شعر گنگنا نے لگتے

ہیں۔ وہ عام طور پر کپڑے پر تجزیہ مارتے ہوتے یہ شعر گایا کرتا ہے۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

بجز ظلمات میں سوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

مستری عبداللہ حقے کا کش لے کر اسے ضرور ٹوکا کرتا۔

”ماسٹر! گھوڑے تو ہم نے ضرور دوڑاے تھے پر اب ہم مسلمان کیا کر رہے ہیں؟“

اوجھڑ عمر کا خشنکشی ڈاڑھی والا مستری عبداللہ منہ مارتا، لیکن وہ ہر فن میں ٹانگ اڑا دیا کرتا۔

سلکیے کا کشتہ بنانے کی بات ہو رہی تو مستری عبداللہ ضرور سیچ میں بول پڑتا۔

”جیب تک اُپلوں کی آگ میں دھرن بوٹی کا بڑا وہ نہ فہر کا دوائے سلکیا کبھی

تعبی مہرتا۔“

ایک بار ماسٹر شفیع نے کہا:

”سننا ہے جرمن کی فوجیں لندن کے اس پاس پہنچ گئی ہیں؟“

مستری عبداللہ جھٹ بولا:

”جرمنی والوں نے ایک ایسا لوہے کا چھینکا ایجاد کر لیا ہے جسے وہ جرمنی میں مکانوں کے

اوپر پھیلا دیتے ہیں۔ اوپر سے جو بم آتا ہے وہ چھینکے میں ہی گر کر رہ جاتا ہے اور پھٹتا نہیں۔“

مستری عبداللہ ہمیشہ گائے کا دودھ پیتا۔ دکان پر اگر وہ ایک پیسے کا دودھ پیالے میں ڈالتا

دودھ کے برابر پانی ڈالتا اور ایک ہی گھونٹ میں چڑھا جاتا۔ وہ اکثر کہا کرتا۔

”گو کے دودھ میں ماں کے دودھ کی تاثیر ہوتی ہے۔“

ایک بار وہ دلی گیا۔ واپس آیا تو دلی کے علاوہ بھٹی کے فرضی سفر کی داستان بھی سنا ڈالی۔ مہار وہ بڑا زیرک اور پائے کا تھا۔ یونہی چتے چتے کسی مکان کے سامنے گھڑا ہو جاتا۔ دو قدم اُدھر، دو قدم اُدھر جا کر، گردن ٹیڑھی کر کے اُس مکان کو اوپر سے نیچے دیکھتا اور پھر اپنے ساتھی سے اتنا کہہ کر آگے چل پڑتا۔

”مکان کی کرسی ٹیڑھی رہ گئی ہے۔“

حرفے کی رات ڈھل رہی ہے اور عید کی صبح طلوع ہونے والی ہے۔

امرتسر میں عید کی صبح کو اذان کے وقت لوگ قبرستان میں اپنے اپنے عزیزوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کو جایا کرتے تھے۔ ہمارے آباؤ اجداد کی قبریں بھی امرتسر کے گھی منڈی والے قبرستان میں تھیں۔ میں اپنے آبا جی کے ساتھ منہ اندھیرے قبروں پر جاتا۔ امرتسر کا یہ قبرستان ہمارے محلے سے دو ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ دروازہ وہاں سنگھ سے باہر نکلتا تو واسپے ہاتھ کو باغ کے ساتھ ساتھ کئی سڑک سکتی باغ کو جاتی تھی۔ بائیں ہاتھ کو دھوبی گھاٹ اور بھرج پھولا سنگھ آجاتا۔ یہاں سے ایک کچا راستہ قبرستان کو جاتا تھا۔ یہ قبرستان لاہور کے قبرستانوں کی طرح ویران اور خاک آلود نہیں تھا۔ یہاں امرو، بونو کاٹ اور آلو پے کے باغ تھے، بلکہ قبرستان ان سرسبز باغوں کے بیچ میں آگیا تھا، ان باغوں میں ٹھنڈے اور شفاف پانی کے نالے بہتے تھے جن کے کناروں کی ہری گھاس میں نیلے پھول کھلے رہتے۔ بڑی نہر سے نکل کر دریا صاحب کو جانے والی ہنسی اسی قبرستان سے ہو کر گزرتی تھی۔ یہاں گیندے کے کیسری پھولوں کے کھیت بھی تھے۔ بری دسمبر کی نیم گرم چکلی دھوپ میں ان پھولوں پر تیتلیاں منڈلایا کرتیں اور سنہری فضا میں گیندے کے پھولوں کا کیسری رنگ اڑتا ہوا نظر آتا تھا۔ اسی قبرستان میں حسین شاہ صاحب کا دربار غوثیہ بھی تھا جس کے سبز گنبد کے عقب میں چھوٹا سا چڑیا گھر تھا اور داہنے ہاتھ کو پے گلاب کی کھیتی تھی۔ گرمیوں کی دوپہروں کو اس کھیتی کی طرف سے گلاب کی گرم خوشبو آیا کرتی۔ قبرستان کے باہر پھلیرے بڑی بڑی چنگیروں میں گلاب کے سرخ پھولوں کے ڈھیر لگائے۔ بیٹھے ہوتے۔ صبح کی مہکی مہکی نیلگوں روشنی میں ان ٹھنڈے پھولوں پر شبنم کے موتی

چمک رہے ہوتے۔ آبا جی پھول خرید کر رومال میں باندھ لیتے۔ میں یہ رومال اُن سے لے لیتا اور قبروں پر جاتے جاتے ان پھولوں کی ٹھنڈی گہری خوشبو کو کئی بار سونگھتا قبرستان میں داخل ہوتے میں اُدھر اُدھر سے قرآن مجید کی تلاوت کی آوازیں آتی شروع ہو جاتیں۔ قبروں پر جگہ جگہ موم بتیاں اور کڑوے تیل کے دیئے ٹھٹھا رہے ہوتے۔ فضا میں اگر بیتوں اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوتی۔ کہیں کہیں دیوں اور موم بتیوں کی روشنی میں قرآن پڑھتی عورتوں اور مردوں کی شکلیں نظر آ جاتیں، پچھلے پہر کے آسمان پر سردیوں کے ٹھٹھرتے ستارے چمک چمک کر ماند پڑ رہے ہوتے۔ رومال بندھے ہوئے گلاب کے پھول ٹھنڈے ہو جاتے۔ امرو کے جھنڈوں کے عقب میں ہمارے اجداد کی قبریں تھیں ہم ان پر چاول بکھیرتے قبروں کے سر ہانے پڑے مٹی کے پیالوں میں تازہ پانی بھرتے، اگر بتیاں ٹلگاتے آبا جی قرآن شریف کی تلاوت کرتے رہتے اور میں درختوں پر سے اوس گرتی دیکھتا رہتا۔ مشرق کی طرف آسمان پر نیلی روشنی کا غبار سا بلند ہونا شروع ہو جاتا اور میرا دل اس خیال سے لبریز ہو جاتا کہ ابھی گھر جا کر نئے پھولوں کا اعیانہ لے گی اور دوستوں کے ساتھ خوب مزے اڑائیں گے۔

جب ہم واپس ہوتے تو دن نکل آیا ہوتا۔ عید کا دن۔ عید کی صبح — حسین اور خوبصورت صبح — محلے میں داخل ہوتے ہی ننھی ننھی بچیاں گونے کنارے والے کپڑے پہنے سہیلیوں کے ساتھ ہنسی کھیلتی دکھائی دیتی۔ گاما فوگر کہنی باغ کی طرف آتا نظر آتا۔ اُس نے سرخ رنگ کی شال اوڑھ رکھی ہوتی اور ہاتھ میں گلاب کے دو ایک پھول ہوتے۔ مٹی میں آتے تو جان اپنی چھوٹی سی دکان سجا رہا ہوتا۔ اُس نے مکان کے باہر تخت بچھا کر اوپر سفید چادر ڈالی ہوتی۔ دوغنی پیالوں کے بیچ میں گلاب کی دان میں پھول مسکرا رہے ہوتے۔ دیوار کے ساتھ کھلونوں کی قطار لگی ہوتی۔ وہ نہا دھو، نئے کپڑے پہن گدے پر بیٹھا ایک ایک پیسے دو دو پیسے میں مٹی کے کھلونے بیچ رہا ہوتا۔

مسجد کے سامنے گاما گنگنیاں والا بیٹھا تھا۔ تانبے کے نیچے والا حقہ قریب ہے۔ بالٹی میں مٹی کی پیالیاں رکھی ہیں۔ اونچا لمبا، ادھیر دھیر، دبل پتلا گاما گنگنیاں والا ہر روز صبح کو چھ بڑی میں سودا سجا کر حقہ ہاتھ میں لیے گھر سے نکلتا اور اتنا کہہ کر گلی گلی سودا بیچنے چل پڑتا۔

”چل اونے گامیابل دی دے بٹھے لگن نوں۔“

اُس کا لب اس ہمیشہ یہ ہوتا۔ سر پر بغیر کلاہ کے پگڑی، لمبی قمیص، دھوتی، پاؤں میں جڑی

اور تسے والے باوامی بوٹ۔ ہم بڑے شوق سے اس کی چھاڑی کے اگے بیٹھ جاتے۔ وہ مٹی کی پیالی میں اُبل ہوئی گنگنیاں ڈالتا۔ اس میں بارہ مسالے ملاتا۔ کھٹا انڈیتا اور پھر ٹین کی پتلی سی چچی رکھ کر پیالی تھما دیتا۔ گرمیوں سردیوں صبح کے وقت ہر روز گلی میں اس کی یہ صدا گونجا کرتی۔

گنگنیاں دیکھاؤ جی گنگنیاں بھی کھاؤ۔

گائے کا ایک بھائی فیروز اپنے گھر پر قالینوں کا رفو کیا کرتا۔ کام کا منہ پڑا تو اس نے اپنے مکان میں ایک کھڈی لنگالی اور کھیس بن کر بیٹھ لگا۔ وہ کام بھی نہ چل سکا تو فیروز نے نعت خوانی شروع کر دی۔ اب ہر عید میلاد اور جمعے کو گلی والی مسجد میں اس کی کانپتی ہوئی آواز لڑا کرتی۔

عید کی صبح کو گائے کی بچ بچ نرالی ہوتی۔ لال صافہ باندھ رکھا ہے۔ تھکے کی تے پر گیند سے کاار پڑا ہے۔ چھاڑی میں جگہ جگہ گلاب اور گیندے کے پھول سج رہے ہیں۔ بچوں کو سودا دے رہا ہے۔ سر کھجانے فرصت نہیں۔ برکت پساری نے دکان کے تخت بچھا کر منیاری سجا رکھی ہے۔ کھٹی مٹھی گولیاں ہیں۔ باوام کی گولیاں ہیں۔ دل بہا رہی ہیں۔ کاپج کے ڈنک ہیں جن کے اندر سرخ پانی بھرا ہے اور شیشے کی تختی سی مچھلی تیر رہی ہے۔ لٹری کی پڑیاں ہیں۔ ایک پیسے کی چاہ ہے جو کسی پڑیا لے لو۔ اگر خوش قسمت ہیں تو ایک آنے کی چیز نکل آئے گی۔ نہیں تو وہی دھیلے والی سیٹی یا انچور کی پڑیا۔ کو کونٹ کے بسکٹ ہیں اور انڈے کی خطائیاں ہیں۔

گو سینڈو نے اپنے مکان کے آگے تخت پر ڈانس رگ رکھا ہے۔ ایک آنہ دے کر بھنری انگلی سے گھاؤ۔ سوئی کسی نمبر پر رکے تو اتنے پیسوں کا کوئی کھلونا۔ کوئی اندی پن، کوئی نقلی گھڑی یا زنجیری والی سیٹی لے لو، اگر صفر نمبر پر رکے تو کیل ختم آنہ بھنم۔ گو سینڈو نے چھ مین میں سے کوئی پُرزہ نکال رکھا تھا۔ سوئی ہمیشہ صفر پر ہی رکتی۔ حاجی احمد شاہ سامنے مسجد کے رونٹ پر بیٹھا سڑیاں کھاتے ہوئے سینڈو کو سرزنش کر رہا ہے۔

”گلو! یہ جو آ ہے۔ اس سے باز آ جا۔“

اس کے جواب میں گو سینڈو صرف ہنس دیتا ہے۔ کیا مجال جو حاجی صاحب کے سامنے گستاخی سے پیش آئے۔ دراصل وہ زمانہ ہی بڑے ادب آداب کا تھا۔ گولیاں کھیتے بچے بڑوں کو دیکھ کر ادھر ادھر جاگ جاتے۔ اب تو سینہ تان کر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں، بلکہ بزرگوں کو بھی گولیاں کھینے کی دعوت دیتے

ہیں۔

عید کی نماز پڑھنے میں گھر والوں کے ساتھ رام باغ والی عید گاہ میں جاتا۔ عید گاہ کی مسجد کا صحن جلد ہی بھر جاتا۔ لوگ مسجد کی چار دیواری کے باہر والی گراؤنڈ میں اپنی اپنی دریاں اور قالین کے ٹکڑے بچھا کر نماز پڑھتے۔ اعلیٰ اس کے درختوں کے نیچے چوتروں پر ادھر ادھر ٹکڑے کھڑے ہو جاتے۔ لاؤڈ سپیکر والے گانے دنوں رواج نہیں تھا۔ مسجد کے اندر سے اللہ اکبر کی آواز آتی تو چوتروں پر کھڑے ٹکڑے کے بعد دیگرے اسی آواز کو دہراتے چلے جاتے۔ نماز کے بعد عید گاہ سے باہر نکلتے تو گرز مار، نقلی کنگے، فقیر اور فقیریاں چمٹ جاتیں۔ خیراتی اداروں کے کارکن چند مانگ رہے ہوتے۔ غبارے اور بھنیریاں بک رہی ہوتیں۔ ہر طرف بے بجائے خوش و خرم چکے پتے بچیاں اپنے بزرگوں کی انگلیاں تھامے، ہنستی مسکراتیں، بلجے بجاتیں، غبارے پھلاتے نظر آتیں۔ عید گاہ سے واپسی پر گلی محلوں میں عید کی رونقیں اپنا رنگیں آنچل پھیلادیتیں۔ میں منے چڑھ کر کرتے جوتے نئی قمیص، نئے کوٹ اور نئی جرابیں پہنے کوٹ کی جیب میں ریشمی رومل سجائے اپنے دوستوں کے ساتھ گلی میں گھر کرنے نکل کھڑا ہوتا۔ جس محلے میں جاؤ عید کی رنگینیاں بکھری ہوئی ہیں۔ گھروں میں عورتیں پہلے بچوں کو تیار کرتی اور سب سے آخر میں خود تیار ہوتیں۔ گھر میں ہر آنے جانے والوں کو سڑیاں، شپ، دیگ، پلاؤ اور ساگ مچھلی سے تواضع ہوتی۔ ریکھ اور بندر کا تماشا دکھانے والوں نے محلے محلے سجا جھار کھی ہوتی۔ ڈگ ڈگ بج رہی ہے بندر ناچ رہا ہے۔ بچے تالیاں پیٹ رہے ہیں۔ بڑے بوڑھے بھی بندر کی مٹھکے خیر حرکتوں پر ہنس رہے ہیں۔

عید کے روز سینا گھروں کو بھی رنگ برنگ جھنڈیوں سے خوب سجایا جاتا۔ ہر سینا گھر میں عید کی خوشی میں چار شو ہوتے۔ پہلا شو صبح دس بجے شروع ہو جاتا، امرت ناکیر، ریا لٹو، رائل ناکیر، نشاٹ سینا اور پرل ناکیر میں لوگوں کا ہجوم ہوتا۔ سینا گھروں کے باہر تینو فتاتیں لگی ہوئیں اور مٹھائی، پان سگریٹ کی دکانیں بھی ہوتیں۔ دوپہر کو ہم کمپنی باغ میں سیر کو نکل جاتے۔ گھاس کے تھتوں میں پھول کھلے ہوتے۔ حوض میں سرخ مچھلیاں تیر رہی ہوتیں۔ سیر کرنے والی ٹولیاں باجے بجاتیں، ہنسی مذاق کرتی لوشوں پر گھوم رہی ہوتیں۔ پردہ کلب کے باغ میں لڑکیاں جھولے جھول رہی ہوتیں۔ باغ میں اُن کے مسرور چہرے گونج رہے ہوتے۔ وہ پیٹنگ اوپر چڑھاتیں تو جھاریوں کی دیوار کے اوپر اُن کے ریشمی اڑتے آنچلوں کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی۔

گول بارغ میں سرکی اور کھیل تماشے دکھانے والوں نے ڈیرے جمار کھے ہوتے۔ پردے کی چار دیواری کے اندر شیخ پر عورتیں سُرخ پوڑ تھوپے ناچ رہی ہوتیں۔ زمین کھود کر دریاں بچھا دی گئی ہیں۔ اُن کے پیچھے بچے رکھے ہیں۔ باہر بانس کی چٹان پر مسخرہ چارلی چلن ایسا اعلیٰ بنائے اوجھل کو دریا ہے اور لوگوں کو تھمیر دیکھنے کی دعوت دے رہا ہے۔ ایک پل کے لیے سامنے کا پردہ اٹھا دیا جاتا۔ سامنے شیخ پر لمبے لمبے بالوں والی عورتیں ناچتی نظر آتیں۔ لوگوں کا اشتیاق دیکھ کر فوراً پردہ گر دیا جاتا۔ سرکی تمبوڑ کے اندر سے شیر کے گرجنے کی آواز آرہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی آدمی گھڑے میں منہ ڈال کر شیر کی بولی بول رہا ہے دھوتو والے گراموفون چنچ رہے ہیں۔

لال بازار میں سبکھوں نے بھی پھولوں کی دکانوں کو عید کے لیے سجا رکھا ہے۔ فالوورے والا سکھ دھلے دھلے کپڑے پہنے بیٹھا ہے۔ کٹوے چمک رہے ہیں۔ پتل کی طشتریوں میں رتن جو کے پھول پڑے ہیں۔ امرتسر میں رتن جو کا پھول عام طور پر مندروں اور گردواروں میں چڑھایا جاتا تھا۔ مسلمان گلاب اور گیندے کو پسند کرتے تھے۔ صبح صبح ہندو لالے دکان کھولتے تو اندر پتوں میں لپٹا ہوا رتن جو کا پتلا سا بار پھول والا پھینک گیا ہوتا۔ وہ سب سے پہلے رتن جو کا بار دکان میں لگی کرشن جی کی تصویر کو پہناتے اور پھر کاروبار کو شروع کرتے۔ مسلمانوں کے ہاں تہواروں عید میلاد کی محفلوں اور بیاہ شادیوں پر گیندے اور گلاب کے پھول استعمال کرنے کا رواج تھا۔

جوں جوں عید کا دن گزرتا جاتا، میں آداس ہونا شروع ہو جاتا۔ کاش! عید کا دن کبھی نہ گزرے! تیسرے پہر جب سائے لمبے ہو جاتے تو اس خیال سے دل کو حوصلہ ہوتا کہ چلو کل ٹرو کا میلہ دیکھیں گے۔ ٹرو کا میلہ امرتسر میں عید کا لازمی جزو تھا۔ ٹرو کے میلے کے بغیر آپ امرتسر کی عید کا تصور نہیں کر سکتے۔ امرتسر کی عید گزر جاتی، مگر اس کی خوشبو ٹرو کے میلے میں موجود رہتی۔ عید کی رات کو ہم ٹرو کے میلے کے خواب آنکھوں میں لے کر سو جاتے اور ٹرو کی صبح میلے کی خوشیاں اپنے دامن ہی سے کرطوں ہوتی۔

یہ میلہ امرتسر کے سکتری بارغ میں لگا کرتا۔ یہاں اونچے لمبے درخت ہوا میں جھوماکرتے۔ ایک جگہ نیم دائرے کی شکل میں لڑکی کی جالیوں سے جافری سی بنی تھی۔ اس جافری کو عشق بیچاں کی بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اندر دو چار میز پر رکھی تھیں۔ یہ سکتری بارغ کی لائبریری تھی۔

بارغ کے لاؤڈ سپیکر پر شام کو ریکارڈنگ ہوا کرتی۔ ”لگتی“ فلم اُن دنوں امرتسر میں بڑا ریش لے رہی تھی۔ میں اور میرا دوست شانتی سروپ اس بارغ میں بیٹھ کر کانن بالا کا یہ گیت بڑے وجد کے عالم میں سنا کرتے۔

سپنوں میں کوئی آتا ہے

کچھ چکے سے کہہ جاتا ہے

شانتی سروپ منہ سے ستار بجانے میں بڑا مابہر تھا۔ وہ شعر و ادب اور موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اور میرا بڑا پکا یار تھا۔ فسادات کے دنوں میں وہ ایک روز اچانک ہماری گلی میں آنکلا۔ ہر طرف قتل و خون کا بازار گرم تھا۔ میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”شانتی! تم کیوں آگئے ادھر؟“

”تمہاری غیریت دریافت کرنے آیا ہوں۔“

حالات کی سنگینی کا شانتی سروپ کو بھی احساس نہ تھا۔ میں اُسے بڑی مشکل سے اپنے محلے سے نکال کر باہر کو والی کی طرف لے گیا اور ملکہ کے بٹ کے پاس پہنچ کر گیا۔

”شانتی یار! تم نے تو کمال کر دیا۔ خدا کے لیے ابھی ادھر نہ آیا کرو۔“

شانتی اپنے مخصوص انداز میں سر کو جھٹک کر ہنس دیا۔

”یار حمید! کیا اب ہم اپنے دوستوں سے بھی نہیں مل سکتے؟“

اس کے بعد شانتی سروپ سر کو ایک طرف جھکائے ہوئے وہاں سے بارغ رامانند کی طرف نکل گیا۔ پھر اُس سے کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ سکتری بارغ کے ساتھ ہی ایک گراؤنڈ تھی۔ اس گراؤنڈ میں ٹرو کا میلہ لگتا تھا۔ ایک روز پہلے ہی دکانیں لگا دی جاتیں۔ قناتی تن جاتیں۔ میلے کے روز یہاں بڑا ہجوم ہوتا۔ بارغ کی بڑی روش پر دونوں طرف کھلونوں بیچنے والوں کی قطاریں لگی ہوتیں۔ فضا میں رنگ برنگے غبارے لہرا رہے ہوتے۔ لڑکی کے رنگدار پنکھڑوں کی چپیں چپیں گونج رہی ہوتی۔ قتلے تلے جارہے ہوتے لوگ قتلے خرید کر گھاس پر درسی بچھا کر وہیں اپنے بچوں کیساتھ بیٹھ جاتے اور کھانے پینے میں مشغول ہو جاتے۔ مٹھائی کی عارضی دکانوں پر لوگوں کا رش ہوتا۔ ایک طرف چند مچھلے نوجوان بینک بڑھا رہے ہیں، دوسری طرف ایک ٹولی تمکناریوں پر گیت گاتی

گوری ہے۔ شہر سے میلہ دیکھنے والوں سے لدے ہوئے تانگے آکر باغ کے باہر رکتے اور میلے کی رونق میں اضافہ ہوتا چلا جاتا۔

سورج ڈھلتے کے ساتھ ساتھ میلے کی رونقیں ماند پڑنے لگتی ہیں بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر تنگاریاں بجاتے مٹی کے کبوتر، کوتے اور طوطے اور ہلتے سر والا سفید ریش مٹی کا باوا تھلے گھر کو چل پڑتے۔ واپسی پر میلے سے قلمہ اور علوہ ضرور لاتے۔ میلے میں بڑا خاص قلمہ ملتا تھا۔ اس لیے کہ یہاں حوائی دیہاتوں سے نہیں آتے تھے، بلکہ شہر کے نامور اور مشہور حوائی اپنے کاریگروں سے میلے میں دکانیں کھولتے تھے۔ گلی میں آتے تو وہاں میلے سے واپس آنے والے بچے ایک دوسرے کو اپنے اپنے کھلونے شوق سے دکھا رہے ہوتے۔ جگہ جگہ تنگاریاں بچ رہی ہوتیں عنایتی حوائی کی دکان پر تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی۔ لوگ قلمے اور منٹھائیوں سے ٹوکریاں بھر بھر کر اپنے گھروں اور رشتے داروں کے گھروں کو لے جا رہے ہیں۔ جسے دیکھو چہرے پر خوشی کی چمک ہے۔ ہونٹ حلوے کے گمی سے تر ہیں۔ آنکھوں میں سزمہ لگا ہے۔ بالوں میں تیل چمک رہا ہے۔ لوکیوں کی مانگ میں میٹھل بھری ہے جو بجلی اور گیس کی روشنی میں دمک رہی ہے جتنا کہ عطر کی گرم خوشبو ہر سمت اڑ رہی ہے۔ ہاتھوں میں گیندے کے کیسری پھولوں کے گجرے ہیں۔ ہتھیلیوں میں مہندی لگی ہے مہندی میں امرتسر کے باغوں کی مہک ہے۔ گیندے، گلاب اور دوسری کی مہک ہے اور عید کا سورج، میلے کا سورج غروب ہو رہا ہے۔ اندھیرے کی چادر پھیل رہی ہے ہجر کی دیوار کھڑی ہو رہی ہے۔ ہجرت کا سفر شروع ہو رہا ہے، قطرہ سمندر سے، کرن سورج سے خوشبو پھول سے اور گوشت ناخن سے جدا ہو رہا ہے۔

اتنے برسوں بعد آج امرتسر کی عید کو یاد کرتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی عمر رسیدہ بیوہ اپنے جہیز کا پرانا صندوق کھولے اپنے سہاگ کا خستہ حال عروسی جوڑا دیکھ رہی ہو۔ کہاں چلے گئے؟ کہاں چلے گئے وہ جتنا کی خوشبوؤں میں بے ہوئے ریشمی رمال، ریشم کی ڈوری میں پروئے ہوئے سچے موتی اور پھولوں بھری بیج پر سونے ہوئے چمکتے، دھکتے، روشن اور پرمست دن۔ میرے امرتسر! میرے یروٹلم! میرے قریبہ اتیرے معبدوں کی ترتیبی ویران ہو گئیں۔ تیری سرخ فصیلیوں کے برج کھنڈر بن گئے تیرے المراؤں کے شیشین خون سے بھر گئے اوتیرے جالی مادہ مریں جہروں کے سینے چھلنی ہو گئے

امرتسر کی ایک درگاہ

دروازہ مہان سنگھ سے باہر نکلیں تو سیدھی سڑک آرٹ سکول کے پہلو سے گزرتی دائیں جانب بڑی شاہ کے ٹیکے کو اور بائیں طرف پاتھی گراؤنڈ کو پیچھے چھوڑتی سامنے تحصیل پورے کی طرف نکل جاتی ہے۔ تحصیل پورے کی آبادی ختم ہوتے ہی دو طرفہ لوکاٹ کے گہری سبز چھاؤں والے باغوں کے بیچوں بیچ ایک تنگ سا کچہ راستہ جالندھر ریلوے لائن کی طرف نکل جاتا ہے۔ اس کچے راستے پر کھٹے کے پودوں نے چھت بنا رکھی تھی۔ مارچ اپریل کے دنوں میں جب کھٹے کے جھاڑوں میں سفید پھول کھلتے تو سارا راستہ مہک جاتا۔ میں صبح کی سیر کو جاتے یہاں سے لمبے لمبے سانس لیتا، اہستہ اہستہ گزرا کرتا تھا۔ اور سفید پھولوں کو — لیکن یہ میں کہاں نکل آیا؟ کھٹے کے سفید پھولوں کی خوشبو مجھے ایک پل میں کہاں سے کہاں لے کر نکل گئی۔ میں واپس دروازہ مہان سنگھ میں آتا ہوں۔

دروازہ مہان سنگھ ہمارے محلے کا دروازہ تھا۔ اُن دنوں مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا تھا کہ یہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہ بھید ہندو مسلم فسادات کے بعد کھلا۔ اس دروازے سے باہر نکل کر آپ دائیں طرف سڑک گھوم جائیے۔ ایک طرف ٹیٹم کے سایہ دار درختوں کی قطار دور تک چلی گئی ہے اور دوسری طرف گلاب، ڈیڈیا اور چنبیلی کے پھولوں سے مہکتا باغ سڑک کے ساتھ ساتھ دروازہ گمی منڈی تک چلا گیا ہے۔ اس باغ میں یو کلپش کے نو عمر چہرے درخت ہوا کرتے تھے۔ جن کی لمبوتری تینوں دلی ٹہنیاں گرمیوں کی صبح کی ٹھنڈی ہوائیں جھوما کرتی تھیں۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی خون آلود، دھواں دھواں، دہشت زدہ دوپہر کو جب ہم افراقی کے عالم میں دروازہ مہان سنگھ سے نکل کر شریف پورہ کیمپ کی طرف بھاگے تو گورداسپور ریلوے لائن کے بادلوں میں آگ کی سرخ زبانیں لپک رہی تھیں اور اس باغ کے نو عمر یو کلپش کے

درختوں کی لمبی تازک ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ساکت و جامد تھیں۔ جیسے وہ پتھر ہو گئی ہوں۔

قیام پاکستان کے پانچ سال بعد جب میں امرتسر گیا تو ان درختوں نے مجھے دُور سے آتا دیکھ کر اپنی شاخیں ہلا ہلا کر مجھے اپنی طرف بلایا۔ مجھے اپنی بے زبانی میں خاموش آوازیں دیں۔ اپنی ہونقی خوشبو کی آوازیں میرا تھام لے لے کر پکارا۔ اور جب میں اُن کے پاس گیا تو وہ چُپ ہو گئے۔ میں نے ایک درخت کے تنے پر ہاتھ رکھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ درخت کی ایک ٹہنی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا۔ میرا بھی دل دھڑک رہا تھا۔ ہم دونوں کے دل ایک ہی تال پر دھڑک رہے تھے۔ یہ محبت کی تال تھی۔ ہمہ گیر، ہمہ اوست، ہمہ ساز، ہمہ تن گوش کبھی نہ بھلائی جانوالی، کبھی نہ یاد آنے والی محبت کی تال۔ کبھی نہ چڑھنے والی کبھی نہ اترنے والی شراب کا نشہ کبھی نہ طلوع ہونے والے، کبھی نہ غروب ہونے والے سورج کی روشنی! میں اور درخت کتنی ہی دیر باتیں کرتے رہے۔ اُس نے کہا۔

”تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے؟“

میں نے کہا۔

”سبھی چلے گئے تھے۔ تم نے دیکھا نہیں؟ امرتسر تو مسلمانوں کے لئے جہنم بنا دیا گیا تھا اور مسلمان جہنم میں نہیں رہا کرتا۔ لاہور کے چیرنگ کلاس اور سمن آباد میں کچھ یو کیٹس کے درخت ہیں۔ میں اُن سے تمہارا حال پوچھ لیا کرتا ہوں۔ ویسے بھی مسجد میں جب سمن آباد کی مسجدیں اذان کی صداؤں سے گونجتی ہیں اور میں نیم روشن صحن میں ٹٹلتے تاروں بھرے آسمان تلے اگر گہرے سانس لیتا ہوں تو مجھے تمہاری خوشبو آتا کرتی ہے۔ تمہارے پتوں کی سرگوشیاں سنائی دیا کرتی ہیں۔“

یو کیٹس کی ٹہنیاں خوشی سے لہراتے لگیں اور۔۔۔۔۔

معاف کیجئے گا۔ میں پھر اپنے موضوع سے ہٹ گیا۔ میری اور درخت کی باتیں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ یہ ہٹ گیا۔ میری اور درخت کی باتیں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ یہ سلسلہ تو موت کے بعد بھی جاری رہے گا۔ ہاں۔۔۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ جہاں یہ باغ ختم ہوتا ہے وہاں اکالی سکھوں یعنی نہنگوں کا ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جسے بڑج پھولا سنگھ کہتے ہیں۔ سکندر حیات کی وزارت میں سکھوں

نے اپنے گرد ورسے کے پاس اس کی تعمیر شروع کی تو امرتسر کے مسلمانوں نے حکومت پنجاب سے شدید احتجاج کیا۔ جسے ہوئے۔ سرسکندر کے پاس مسلمانوں کے وفد گئے۔ لیکن کچھ نہ بنا اور قلعے کی تعمیر شروع رہی۔ قلعہ بن گیا۔ اس قلعے میں سکھوں نے اسلحہ جمع کر رکھا تھا۔ ہم اپریل ۱۹۴۷ء کو سکھوں نے اسی قلعے کے سوراخوں سے گئی منڈی اور جہان سنگھ دروازے کے مسلمانوں پر اندھا دھند فائرنگ کی۔ ہمارے محلے کا جوان جید اہمال والا انہی سکھوں کی گولی لگنے سے شہید ہوا۔

اس قلعے کے سامنے ایک چھوٹی سی پختہ سڑک نیچے کو اترتی ہے۔ کوٹنے پر ایک مسجد ہے کنواں اور اکھاڑہ ہے۔ ذرا اُگے جا کر پہلی آجاتی ہے اور پھر قبرستان شروع ہو جاتا ہے۔ جس درگاہ کے بارے میں، میں لکھنے والا ہوں وہ اسی قبرستان میں واقع تھی۔ ہم سب نے ایسی بہت سی درگاہیں دیکھی ہوں گی جو صدیوں سے آباد ہیں اور جن کی رونقوں اور جگمگاہٹوں میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن امرتسر کے قبرستان والی یہ پہلی درگاہ تھی جو میری آنکھوں کے سامنے عالم وجود میں آئی۔ برقی قمقموں سے بے نقہ نور بنی، اس کی فضا میں بیدم وارثی کے عارفانہ کام سے گونجیں، دہاں دودھ کی تہریں بہیں اور میری آنکھوں کے سامنے وہ اُجڑ گئی۔ لوگ اس کے برقی قمقموں اور ٹوٹتیاں اتار کر لے گئے اور دودھ کی نہروں میں مکڑیوں نے جاے بن لئے۔ یہ درگاہ امرتسر کی ہماری کشمیری برادری کے ایک قریبی عزیز خواجہ صاحب نے اپنے نانا کی قبر پر بنائی تھی۔ میں اُن دنوں ایم اے او ہائی سکول میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ خواجہ صاحب کے پاس اچانک کہیں سے بہت سی دولت آگئی۔ انہوں نے فوراً قبرستان میں اپنے نانا کی قبر پر (جیسا کہ والدہ مرحومہ اور خالہ جان بھی بتایا کرتی تھیں) ایک عظیم الشان درگاہ کی بنیاد رکھ دی۔ درگاہ کی تعمیر شروع ہو گئی۔ دُور دراز سے کاریگر معماروں کی خدمات حاصل کیں۔ میرے خالہ زاد بھائی رشید لال نے دہاں بجلی کی ساری فٹنگ خود کی۔ میں آج بھی چشم تصور میں اُسے بیچ کس دانتوں میں دبائے میٹر بھی پر جھک کر تاروں کو ایک دوسرے سے جوڑتا دیکھ رہا ہوں۔ درگاہ کے گنبد کے اندر جو روشنیاں لگیں وہ سبز انگوروں کے گچھوں کی شکل میں لٹک رہی تھیں اگر وہ دلی اور لکھنؤ سے نہایت قیمتی اور حسین جھاڑ فانوس منگوا کر اندر لٹکائے گئے۔ گنبد کے اندر تین قبروں کے تعویذ تھے۔ ایک خواجہ صاحب کے نانا کی قبر کا تعویذ تھا۔ دوسرا غالباً اُن کی نانی صاحبہ کی قبر کا تعویذ تھا

اور میرا تعویذ اُن کی اپنی قبر کا تھا جو تعویذ کے نیچے تہہ خانے میں کھلی پڑی تھی۔ انہوں نے وصیت کر رکھی تھی کہ مرنے کے بعد انہیں وہیں تہہ خانے میں دفن کیا جائے۔ ایک دفعہ میں تہہ خانے میں اُتر گیا۔ چھوٹا سا لحد نما تہہ خانہ تھا۔ چھت اور دیواروں پر سینٹ کیا ہوا تھا۔ جگہ جگہ چمکتی بریکٹوں والے دو دھیا غبارہ نماب لب لگے تھے۔ وہاں مرنے کے بعد خواجہ صاحب کی قبر تعمیر ہونی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ امرتسر کا یہ قبرستان بڑا خوبصورت تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ لاہور میں مسلمانوں کے ننگے قبرستانوں پر گر میوں میں چمکتی دھوپ پڑتی ہے اور سردیوں میں گہرا کرتا ہے۔ جب کہ لاہور ہی میں عیسائیوں کے قبرستانوں میں سایہ دار درختوں کے جھنڈ ہیں اور قبروں کے کتبے پھولوں سے ڈھکے رہتے ہیں۔ امرتسر کا ہمارے محلے کے باہر والا قبرستان لاہور کے گورا قبرستان سے بھی زیادہ شاداب اور پُر سکون تھا۔ دراصل یہ قبرستان آم، لوکاٹ اور امرود کے باغوں کے بیچ میں اُگ رہا تھا۔ یہاں کوئی قبر ایسی نہ تھی جس پر کسی نہ کسی درخت کا سایہ نہ ہو۔ اور پہلو میں گلاب یا گیند کے پھول نہ کھلے ہوں۔ ہم رات کو بھی قبرستان میں بے دھڑک چلے جاتے۔ یہیں کبھی کسی قسم کا خوف یا دہشت محسوس نہ ہوتی۔ بلکہ یوں لگتا کہ واقعی ان قبروں کے اندر بڑے ہی نیک لوگ سو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے بچے ہوتے ہوئے بھی کبھی کسی چھوٹی سے چھوٹی قبر پر بھی پاؤں نہ رکھا تھا۔ یہاں پھلدار باغوں میں ندی کے مٹیا لے ٹھنڈے پانی کے چھوٹے چھوٹے نالے بہتے تھے۔ برسات میں ان نالوں میں درختوں سے ٹپکے ہوئے آم اور امرود بہا کرتے جنہیں ہم میں کسی پیا پر بیٹھ کر مزے لے لے کر کھاتے۔ برسات میں گھنگھور گھٹائیں برستیں اور ہم یہاں امرود کے درختوں پر چڑھ کر دھڑ دھڑ پاؤں پھسائے امرود توڑ توڑ کر نیکر کی جیبیں بھر کرتے۔

عید کی صبح کو منہ اندھیرے لوگ قبرستان جا کر فاتحہ اور قرآن خوانی کرتے میں بھی اپنے چھوٹے آرٹسٹ بھائی کے ساتھ ضرور جاتا۔ ہم لوگ گھی منڈی داے دروازے سے نکل کر کونے والی مسجد کے پاس آتے تو ہمیں نیچے گلاب کے پھولوں کی خوشبو محسوس ہوتی۔ سڑک کنارے گلاب کے پھول نیچنے والے بیٹھے ہوتے۔ بڑی بڑی چنگری سرخ گلابوں اور اُن کی پتیوں سے بھری ہوتی۔ دو پیسے میں وہ ڈھیر سارے پھول جھولی یا رومال میں ڈال دیتے۔ ہم بھی دو پیسے کے پھول لے کر رومال میں باندھ لیتے اور گرم کشمیری شالوں میں دیکے ٹھٹھرتی سردی میں قبرستان

میں داخل ہو جاتے۔ اُن دنوں بڑی سخت سردی پڑا کرتی تھی۔ ہمارے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے اور بات کرتے وقت منہ سے بھاپ نکلا کرتی۔ اوپر نیلے آسمان پر طلوع آفتاب سے پہلے کی روشنی میں ٹمٹماتے تارے زرد ہو رہے تھے۔ چھوٹی سی سڑک کی دونوں جانب خانہ بدوش قسم کے فقیر جھولیاں پھیل گئی تھیں۔ ان کے پیچھے امرودوں اور اناروں کے باغوں میں گھپ اندھیرا چھایا ہوتا۔ اب ادھر ادھر سے دھیمی اثر انگیز آواز میں قرآن شریف کی تلاوت کی آوازیں سنائی دینے لگتی۔ لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی قبروں پر مٹی کے دیئے اور موم بتیاں جلا رہے ہوتے پھول اور چاول بکھیر رہے ہوتے۔ کہیں کہیں اُن کے اداں چہرے چرخوں کی پھڑپھڑاتی روشنی میں ابھرتے اور پھر غائب ہو جاتے۔ مٹی جون کی تپتی سندان دوپہروں میں یہاں سے گزرتے ہوئے گلاب کے پھولوں اور کیکر کے پیلے پھولوں کی گرم خوشبو آیا کرتی۔ ذرا پرے ایک نہر بہتی تھی ادھر سے جو بھاتی اُس میں بھنگ کی جھاڑیوں کی مرطوب بو ہوتی۔

اس قبرستان کا جو حصہ جالندھر کی طرف جاتی جی ٹی روڈ کو لگتا تھا ادھر یہ درگاہ تھی۔ اس درگاہ پر پہلا عرس ہوا تو امرتسر کے گلی کوچوں کی دیواروں پر قد آدم اشتہار چسپاں ہو گئے۔ ان اشتہاروں پر بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا تھا۔ "امرتسر میں دودھ کی نہر بنی ہے" اس کے بعد درگاہ کے بائیں میں تفصیل درج تھی اور اس بات کا اعلان تھا کہ عرس شریف تین روز تک جاری رہے گا۔ پہلے روز کی محفل جماعت کی صدارت حضرت سیدم وارثی فرمائی گئے۔ دکانداروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ میلہ شروع ہونے سے پہلے وہاں آکر اپنی اپنی دکانیں سجالیں۔ ایسا نہ ہو بعد میں پچھتا نا پڑے۔ قوالوں میں تابا قوال اینڈ پارٹی کے علاوہ محمد علی فریدی قوال اینڈ پارٹی کا نام بھی درج تھا۔ میرے خالوجان مرحوم میرا اشتہار جھولے میں ڈال کر ہمارے گھر لائے اور سب کو پورے کا پورا پڑھ کر سنایا۔ پھر

میں اس درگاہ کے عرس کے خلاف ہوں۔ یہ سب جھوٹ کا کھیل ہے۔

خالوجان ساتھ پینتھ برس کے دیوتا مت بھاری بھر کم اونچے بلے بزرگ تھے۔ لمبی داڑھی کھلتا گندمی رنگ۔ لمبا کھدر کا کرتہ کھدر کی دھوتی۔ لال چمڑے کی جوتی۔ ہاتھ میں موٹا عصا۔ بازار بکروانا کی روٹاں والی مسجد کے پیش امام تھے۔ تحریک خلافت میں میری والدہ سمیت اپنے سب

گھر بار والوں کو لے کر کابل چلے گئے جہاں سے انتہائی کسی پرسی کے عالم میں واپس امرتسر کے۔ کابل میں مہاجر مسلمانوں کی حالت ناز کا نقشہ بڑے موثر انداز میں کھینچا کرتے۔ انہیں ایک بات کی بڑی خوشی تھی کہ انہیں کابل میں شہنشاہ بابر کے مزار کی زیارت نصیب ہوئی۔ بابر کے سنگِ مزار پر لکھی ہوئی فارسی رباعی بڑے جوش و خروش سے پڑھ کر سنایا کرتے۔ کشمیری بزرگوں کی طرح ڈٹ کر کھاتے۔ میلوں پیدل چلتے۔ جمعے کے جمعے ہر عزیز اور رشتے دار کے گھر خیریت معلوم کرتے جاتے۔ ڈیوڑھی میں ذرا کھنکار کر گھر کے کسی حرد کا نام لے کر پکارتے۔ جن دنوں میں فلمینگ روڈ پر رہا کرتا تھا خالوجان کی پاٹ دار آواز پر جمعے کی صبح کو مکان کی ڈیوڑھی میں گونجتی۔

• بابو عبدالحمید — ۱ •

خالوجان کی سب سے بڑی خصوصیت میرے نزدیک یہ تھی کہ اُن میں ظرافت کی جس بڑی تیز تھی۔ بڑے لطیفے سناتے۔ بات کو خوب مزہ لگا کر پیش کرتے۔ اسی بات پر خوب کھل کھلا کر بچوں کی طرح ہنستے۔ ایک روز میں خالو کے ہاں گیا ہوا تھا۔ ہم نو عمر لڑکوں کو ایک جگہ اکٹھے دیکھ کر ہمارے پاس آئے اور عصا دیوار سے لگا کر تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”دو بھئی آج تمہیں عبدالرحمان جن کا قصہ سناتا ہوں۔“

وہ مجھے خود بھی کبھی کبھی جن لگتے تھے۔ چھ فٹ سے نکلتا قد۔ بھاری جسم۔ رعب دار آواز اور قدیم یونانی فلاسفوں ایسا بھرپور چہرہ۔ لیکن اُس روز انہوں نے ہمیں جس جن کے بارے میں سنایا وہ اُن کی مسجد کے حجرے میں رہتا تھا۔ کہنے لگے۔

”دو بھئی دوستو! کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک روز میں نے اُن بچوں کو جو میرے پاس قرآن شریف پڑھنے آتے ہیں کہا کہ میرا بدن دابو۔ میں پہلو بدل کر لیٹ گیا اور سارے بچے میرے بدن پر ملکی ملکی مارنے لگے۔ مجھے کچھ ایسا مزہ آیا کہ سو گیا۔ آنکھ کھلی تو سارے بچے جاچکے تھے صرف عبدالرحمان ناجی لڑکا میری پنڈلیوں پر ٹکیاں مار رہا تھا۔ حجرے میں کافی پرے طاق میں دیا جل رہا تھا۔ میں نے عبدالرحمان سے کہا کہ بیٹا دیا گل کرو اور تم بھی جا کر آرام کرو عبدالرحمان نے وہیں بیٹھے بیٹھے پھونک مار کر دیا بجا دیا۔ پس پھر کیا تھا۔ میں وہیں اٹھ کر فوراً عبدالرحمان کی کلائی پکڑ لی اور کہا۔ بچہ بتا تو کون ہے؟ عبدالرحمان گھبرا گیا۔ جب میں نے کلائی نہ چھوڑی تو

بوللا۔ میں عبدالرحمان جن ہوں اور کابل سے یہاں آپ کے پاس قرآن شریف پڑھنے آیا ہوں۔ لو بھی دوستو! اب وہ جن میرا بار ہے اور مجھے کبھی کبھی کابل کے قندھاری اتار لاکر کھلاتا ہے۔ پس چٹکی بجاتا ہے اور سرخ قندھاری اتار اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔۔۔۔۔ درگاہ کے بارے میں بھی دوستو! اب وہ جن میرا بار ہے اور مجھے کبھی کبھی کابل کے قندھاری اتار لاکر کھلاتا ہے۔ بھی خالوجان نے میرے والد صاحب کو کھلے لفظوں میں کہہ دیا۔

”مجھے عبدالرحمان جن نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ عبدالعزیز! خواجہ نے وہاں درگاہ کی عمارت تعمیر کر کے اچھا کام نہیں کیا۔ عمارت کے نیچے کئی نیک آدمیوں کی قبریں آگئی ہیں۔ یہی شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔“

لیکن درگاہ کے پہلے عرس میں خالوجان پیش پیش تھے۔ درگاہ کے پچھوڑے اپنی نگرانی میں زروے بریانی کی دیگیں دم کر رہے تھے۔ مہنتی نائی کو کام کرتے ہوئے بار بار ٹوکتے۔

”زروے میں سنگترے کے ترخ ڈال دیئے؟“

”مہنتی! نجولے کی آگ تیز لگتی ہے مجھے۔“

”بریانی تیار ہو گئی ہو تو ایک بُر کی چکھانا مجھے۔۔۔۔۔“

پہلے عرس پر درگاہ کے اندر باہر بڑی رونق تھی۔ شہر سے زیادہ تر لوگ دودھ کی نہروں کاٹن کرائے تھے۔ دودھ کی نہر درگاہ میں ایسے چلائی گئی تھی کہ سیمنٹ کے پختہ ایک لمبوترے ٹینک کو کچے دودھ کی لسی سے بھر دیا گیا۔ تانبے کا ایک پائپ گنبد کے گرد گرد چاروں طرف لگا تھا جس میں ٹوٹیاں تھیں۔ لوگ ٹوٹیاں کھول کر گلاس، پیالے اور ڈول بھر بھر کر دودھ کی لسی پیتے اور حیران ہوتے کہ واقعی خواجہ صاحب نے دودھ کی نہریں چلا دیں۔ درگاہ کے سامنے سروس کے کٹے ہوئے کھیتوں میں بموقعاتیں لگا کر لوگوں نے دکانیں کھول رکھی تھیں۔ قتلے تلے جا رہے تھے۔ جھیرے لگے تھے۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل گرج رہی تھی۔ درگاہ رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجی تھی۔ شہر کے علاوہ دیہات سے بھی عورتیں بچے بوڑھے اور جوان بھاری تعداد میں عرس میں شرکت کو آئے تھے۔ گنبد کی ممر میں جالیوں سے لگی عورتیں، بچے بوڑھے اور جوان دعا مانگ رہے تھے۔ فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ جالیوں میں اقبیاں باندھ کر منتیں مانگ رہے تھے۔ میں نے

ایک جالی کی ٹھنڈی آنکھ میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ تینوں قبروں پر پھولوں کے ڈھیر لگے تھے اس قبر پر بھی جس کی جلد میں ابھی خواجہ صاحب دفن نہیں ہوئے تھے۔ لوگ اُن کی غالی قبر پر بھی فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

ہماری امرتسر کی ساری کشمیری برادری، سارے رشتہ دار عرس پر جمع تھے۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے کسی نے بھی درگاہ کے تقدس کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ مقبرے میں کون دفن ہے۔ چنانچہ اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کو مقبرے کی جالیوں کے پاس کھڑے ہو کر دعا مانگتے نہیں دیکھا۔ ان بھنڈا را کھانے میں وہ سب سے آگے تھے۔ پلاؤ سے لبالب بھرے ہوئے قابوں پر وہ چن چن کر قورے کی بوتلیاں رکھوا رہے تھے۔ پھولدار قناتوں کے پاس دریوں پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے وہ جن بھوتوں کی طرح خود بھی کھا رہے تھے اور اپنے بال بچوں کو بھی مار مار کر کھلا رہے تھے۔ رات کو گیس کے مہنڈوں کی تیز روشنی میں قوالی شروع ہوئی تو ہمارے ایک رشتے دار کو حال آگیا۔ وہ لوگوں کو ٹکریں مارنے لگا۔ وہ کسی کے قابوں میں ہی نہ آتا تھا۔ بڑی مشکل سے چھ آدمیوں نے پکڑ کر اسے رسیوں سے باندھا اور گھر چھوڑ کر آئے۔ اگلی صبح اُس کی رسیاں کھولی گئیں تو وہ پھر حال کھیلنے لگا۔

قوالی کی انہی محفلوں میں، میں نے پہلی بار مشہور شاعر حضرت بیدم وارثی کو دیکھا۔ پڑ سکون دلا چہرہ۔ مصحی ملائم چمک والی آنکھیں۔ زور رنگ کی چادر اوڑھے اگلی قطار میں خاموش بیٹھے تھے قوال اُن ہی کا عارفانہ کلام گا رہے تھے۔ محمد علی فریدی قوال اُن دنوں جو بن پر تھے۔ درگاہ کے کونے کونے میں اُن کی پُرسوز آواز گونج رہی تھی۔ میں اپنے خاندان کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ تنبوڑ کے نیچے اُس حصے میں بیٹھا تھا جو عورتوں کے لئے مخصوص تھا۔ درمی کے نیچے تازہ بنا ہوا اینٹوں کا فرش ٹھنڈا ٹھنڈا تھا۔ قوالی میں میرا الکل جی نہ لگا۔ میں اپنے پھوپھی زاد بھائی کے ساتھ مقبرے کے گنبد کے پاس آگیا۔ یہاں دالان کے کونوں کھدروں میں لوگ کھیل اوڑھے سو رہے تھے۔ گنبد کے اندر جھاڑ فالوں روشن تھے۔ بے شمار اگر بتیاں سنگ رہی تھیں جن کی بھاری خوشبو سے بہن بو جھل ہو رہا تھا۔ درگاہ کے اپنے چڑیا گھر سے موروں کے کوسٹے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت مقبرے کی جالی سے منہ لگائے آنکھیں بند کئے کچھ برا بھلا رہی تھی۔

اُس کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دالان کے مغربی حصے میں سجادہ نشین نائب سجادہ نشین متولی، خزانچی اور سیکرٹری سجادہ نشین کے کمرے تھے جن کے باہر اردو میں اُن کے ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں گھومتے گھومتے ادھر کو نکل گئے ہم نے جالیوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ خواجہ صاحب گاؤں کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ بلب کی روشنی میں بڑی بڑی مونچھوں والا اُن کا سرخ و سپید بارعب چہرہ چمک رہا تھا۔ کچھ لوگ بڑے ادب سے اُن کے سامنے بیٹھے اُن کی باتیں سن رہے تھے۔ ساتھ دلے کمرے کی جالیوں سے اندر جھانکا تو ایک پھولی ہوئی توند والا موٹا تازہ آدمی گرم کشمیری شال کی بگل مارے قالین پر اکیلا آلتی پالتی مارے بیٹھا زردہ اڑا رہا تھا۔ ہم یہاں سے نکل کر درگاہ کے پھولدارے چڑیا گھر کی طرف آگئے۔ دس بارہ مرے زمین کے گرد باڑھ لگا کر اندر مختلف خانوں میں موڑ تیر لڑے، کبوتر اور دو تین ہرن چھوڑ دیئے گئے تھے۔ یہاں بھی اوپر وسط میں ایک بڑا سا بلب روشن تھا۔ روشنی میں جانور کچھ بے چین سی دکھائی دے رہے تھے۔ ہمیں جنگل کے پاس آنا دیکھ کر ہرن آہستہ آہستہ چلتے ہمارے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ اُن کی بڑی بڑی چمکتی آنکھیں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ ہم بڑی دیر تک اُن سے کھیلتے رہے۔ قوالی کی آواز یہاں بھی آرہی تھی۔ اچانک پیچھے آہٹ سی ہوئی ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ ہمارے پیچھے امرود کے جھکے ہوئے درختوں کے گہرے سایوں میں قبریں ہی قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ڈر گئے۔ اور وہاں سے بھاگ کر دالان کی رونق اور روشنیوں میں آگئے۔

رات، بجے کے بعد محفل سماع ختم ہوئی۔ خالوجان اپنا عصا لے کر ہمارے خاندان کی عورتوں اور بچوں کی ٹولی پیچھے لگائے گھر کی طرف چل پڑے۔ سارا رستہ قبرستان میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ مجھے بڑا ڈر آ رہا تھا۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ لگا چل رہا تھا۔ اور دل کو اس خیال سے طاقت دے رہا تھا کہ خالوجان ساتھ ہیں اور جی بھوت چڑھیں اُن کی مطیع ہیں۔ درختوں پر اندھیرا اور سکوت چھایا ہوا تھا۔ کسی وقت کوئی آواز نہ آئے گا اور فضا اور زیادہ ڈراؤنی ہو جاتی۔ عورتیں اونچی آواز میں باتیں کر کے اپنے خوف کو دور کر رہی تھیں۔ مجھے ترنگے خالوجان موٹا عصا زمین پر بار بار مارتے، بار بار کھٹکارتے کوئی بیس قدم آگے آگے چل رہے تھے۔ کسی وقت بلند آواز سے وہ کلمہ شریف کا ورد کرنا شروع کر دیتے۔ خدا خدا کر کے قبرستان کا رستہ ختم ہوا ہم دروازہ گھی منڈی سے نکل کر بازار بکرواناں میں آگئے۔ اگلے روز خالوجان نے ایک من گھڑت کہانی مشہور کر دی۔ کہنے لگے۔

”رات اگر میں تم لوگوں کے ساتھ نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔ تم لوگوں کو قبرستان سے لے کر گزر رہا تھا کہ کھانی کے پاس پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چڑیل پل پر بیٹھی ہے۔ اس کے بال کھلے ہیں۔ ہاتھ پیرا لٹے ہیں۔ دانت باہر کو نکلے ہوئے ہیں۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی ہیں۔ مجھے دیکھ کر جھٹ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اسلام علیکم پیر جی!“

یہاں پہنچ کر خالو جان باقاعدہ اٹھ کر چڑیل کی نقل اتارتے۔ ہاتھ اٹھا کر سر جھکا کر چہرے پر لجاجت بھری مسکراہٹ لاکر چڑیل کے سلام کرنے کا انداز بتاتے۔

”میں نے عصا اٹھا کر چڑیل سے کہا۔ او نامراد! تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے! تجھے خبر نہیں کہ پیچھے میرے بچے آرہے ہیں! چل دفع ہو جا میری آنکھوں سے۔ اٹھ! بھاگ! — اور چڑیل ہی ہی ہی ہی ہی سلام پیر جی! کہتی اُٹنے پاؤں بھاگ کر امرودوں کے درختوں میں غائب ہو گئی۔“

رشتے دار عورتوں نے سنا تو انہیں قبرستان والی رات یاد کر کے پسینے اُگئے۔ مجھ پر یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد میں دوپہر کے وقت بھی قبرستان جاتے گھبرانے لگا۔

عرس کے علاوہ بھی ہم دن میں اکثر کھیلنے اور چنگ اڑانے درگاہ پر جایا کرتے تھے۔ باغوں میں گھس کر کچے کے امرود توڑتے۔ کھیتوں میں جا کر مولیاں اکھاڑتے اور انہیں درگاہ کے حوض پر لاکر دھوتے اور تنک مرچ لگا کر کھاتے۔ میرے دادا جان سردیوں کی دوپہر میں عام طور پر درگاہ پر ہی گزارتے۔ وہ مقبرے کے پاس فرش پر درسی بچھا کر بیٹھ جاتے روٹی کے بھورے کر کے چڑیلوں کو ڈالتے۔ پانی سے لہالب بھرا ہوا کٹورا پاس رکھ لیتے۔ چڑیاں وہاں آکر بڑی آزادی سے دانہ دُکھا چیتیں اور کٹورے پر بیٹھ کر چونچ ڈبا ڈبا کر مزے سے پانی پیتیں۔ وہ دادا جان سے ذرا بھی نہ گھبراتیں۔ دادا جان بھی اُن سے بڑا پیار کرتے تھے۔ انہیں پانی پینا دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہوتے۔ کسی وقت اُن سے باتیں کرتے گئے۔ ہم دونوں بھائی گڈی اور ڈھلے کراتے تو وہ انہیں سہرا کرتے۔ گڈی میں ڈور ڈالتے۔ جب ہماری گڈی یا پتنگ سرسوں کے کھیتوں کے اوپر نیلے آسمان کی ٹھنڈی ہواؤں میں لہرانے لگتی تو دادا جان ماتھے پر ہاتھ کا چھجا بنا کر اُسے دیکھتے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے۔

”شاباش! ڈھیل مت دینا۔ ہوا تیز ہے۔ ڈور کس کر رکھنا۔ میرا خیال ہے انہیں طرف کتنی کھاتی ہے۔۔۔۔۔۔“

درگاہ پر دو یا تین عرس ہی ہوئے تھے کہ اُس کا زوال شروع ہو گیا۔ ایک روز میں سکول سے بستے لے کر گھر میں داخل ہوا تو خالو جان میری والدہ کے ساتھ رانڈاری میں باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے بستہ ایک طرف پھینکا چنگیر میں سے روٹی نکالی ہانڈی میں سے ایک آلو ایک بوٹی نکال کر اُس پر رکھی اور وہیں کھڑے کھڑے کھانے لگا۔ خالو جان اور والدہ محترمہ کی باتوں سے معلوم ہوا کہ درگاہ شریف والے خواجہ صاحب اپنے ایک ساتھی کے ساتھ امرتسر سے اچانک غائب ہو گئے ہیں۔ میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی، مگر چونکہ والدہ فکر مند تھیں اس لئے میں بھی فکر مند ہو گیا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ خواجہ صاحب کے ساتھ ضرور کوئی افسوسناک حادثہ ہوا ہے۔ اس کا ثبوت مجھے بہت جلد مل گیا، کیونکہ درگاہ اُجڑنا شروع ہو گئی۔ چوکیداروں کو تنخواہ نہ ملی تو وہ درگاہ چھوڑ کر چلے گئے۔ خواجہ صاحب کے بڑے لڑکے خود پریشان تھے وہ درگاہ کی حفاظت پوری توجہ سے نہ کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ حوض کی ٹوٹیاں اور دودھ کی نہروں والے تانبے کے پائپ اکھاڑ کر لے گئے۔ رشید لالہ اگر مقبرے میں سے جھاڑ فانوس اتار کر خواجہ صاحب کے گھر نہ پہنچائے تو لوگ وہ بھی اتار کر لے جاتے۔ سبکو نشین، نائب سجادہ نشین، خزانچی اور متولی کے کمروں سے جالی دار دروازے بھی راتوں رات چوری ہو گئے چڑیا گھر کے کبوتر، طوطے اڑ گئے۔ موروں کو قبرستان کے جنگلی بٹے کھا گئے۔ کیونکہ اب رات کو اُن کی چوکیداری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ خواجہ صاحب کا بڑا لڑکا ایک روز دونوں بہن کھول کر گھر لے گیا۔ ”ورنہ اُن کا بچنا بھی محال تھا۔ خواجہ صاحب کی درگاہ اور اُن کے خاندان پر زوال آ گیا۔ میں کبھی کبھی اُن کے گھر جاتا تو وہاں والدین میں سناٹا مچا یا ہوتا۔ دو منزلہ بڑا اونچا لمبا جالی دار دروازوں اور نیم روشن ٹھنڈے کمروں پرانے دکھڑے صوفوں اور مہریوں قد آدم آئینوں اور پرانی طرز کی روغنی تصویروں والا گھر تھا۔ کبھی وہاں کشمیری عورتوں اور لڑکیوں کی مسرور کھانسی گونجا کرتی تھیں اور اب وہاں خاموشی طاری ہوتی۔“

ایک روز دوپہر کو میں ڈور چنگ لے کر درگاہ پر گیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ سامنے کھیتوں میں پہلی نیلی سرسوں بھولی ہوئی تھی۔ درگاہ کے مومن میں دیران مقبرے کے پاس درسی کا ٹکڑا بچھائے دادا جان اُسی طرح بیٹھے چڑیلوں کو روٹی کے بھورے ڈال رہے تھے۔ چڑیاں شور مچاتی ان کے کندھوں، سر اور زانوں پر آکر بیٹھ رہی تھیں۔ اُن کے ہاتھ سے بھورے چھین کر لے جا رہی تھیں۔ اور دادا جان ہنس ہنس کر اُن کے توتلی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ سامنے کی طرف سجادہ نشین اور نائب سجادہ نشین کے ابھڑے ہوئے ٹھنڈے سرخ کمروں کے باہر دھوپ میں خواجہ صاحب کا بڑا لڑکا چنگیر میں تنور کی روٹی رکھے بیٹھا تھا۔ ایک

ہاتھ میں مونی تھی۔ وہ خشک مولیٰ سے تور کی روٹی کے ٹکڑے توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔ اس بات کو جانے کتنے بڑے ہیبت گئے ہیں۔ لیکن یہ عبرت انگیز منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ وہ نائب سجادہ نشین تھا جو عرس کے موقعوں پر اپنے ہاتھ سے پلاؤ اور بریانی کے ٹشٹ بھر بھر کر رشتے داروں کے گھر پہنچا یا کرتا تھا۔ اُس کا چہرہ بھرا بھرا گول مٹول ہوتا تھا۔ اب وہ چہرہ اتر گیا تھا۔ رخساروں کی بڑیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ وہ عمر میں مجھ سے خاصا بڑا تھا۔ میں ڈورا اور پتنگ ہاتھ میں لئے ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ میری موجودگی سے بے نیاز بڑی مشکل سے روٹی کے خشک ٹوٹے نگل رہا تھا۔ ایک چڑیا چوں چوں کرتی میرے سر پر سے اٹنی ہوئی۔ دادا جان کے کندھے پر جاکر بیٹھ گئی۔ دادا جان کی یہ عادت تھی کہ جب چڑیا اُن کے کندھے یا سر پر آگ بیٹھتی تو وہ ساکت ہو جاتے اور زیادہ نہیں ہلا جلا کرتے تھے۔ میں نے دیکھا دادا جان بہت بنے بیٹھے ہیں۔ اور بوجھ لکھوں سے چڑیا کو دیکھ دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہے ہیں۔

آج پچیس برس بعد مجھے اُس چڑیا کی یاد آئی ہے۔ کیا وہ گندمی چوچے اور بھولے بھالے چہرے والی معصوم چڑیا زندہ ہوگی؟ وہ تو مجھے بھول گئی ہوگی، لیکن میں نے اُسے نہیں بھلایا۔ شاید وہ بھی مجھے نہیں بھولی ہوگی۔ پرندے کبھی محبت کرنے والوں کو نہیں بھولتے۔ وہ انہیں زندگی میں بھی یاد رکھتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی اُن کا انتظار کرتے ہیں۔ کسی حیرت انگیز بارغ میں۔ اُس بارغ کے حسین ترین درختوں میں۔ شفاف پانی والی نہروں کے کنارے۔ ان دیکھے سفید پھولوں کی دادیوں میں اور۔۔۔ تم اسٹڈ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! درگاہ کے عرس، اُس کی رونقیں، اُس کی روشنیاں بچھ گئیں۔ گرمیوں کی پتی دوپہروں کو اُس کے صحن میں گھبریاں دوڑتی تھیں اور اُس کے سجادہ نشینوں کے تاریک دیوان خانوں میں لٹکتے جانوں والی چتروں کے نیچے منگ چرس، بھنگ پی کر رہتے۔ وقت اس درگاہ کے ایوانوں میں زوال کے جالے بنتا گزرتا چلا گیا۔

پاکستان بن گیا۔ ہم لوگ ہر ترس کو بھڑکتے شعلوں کے پیر و کر کے اپنے نئے شہر، نئے وطن میں آگئے۔ چھ یا شاید پانچ برس بعد یوم اقبال کے موقع پر جاتہ صحر میں پاکستانی فانی کشن کی جانب سے ایک زبردست شاعرہ ہوا جس میں لاہور کے معروف شعرا کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ لوگ میرے دوست تھے پاسپورٹ میرے پاس موجود تھا۔ میں بھی اُن کے ساتھ جالندھر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ دل میں یہ خیال تھا کہ چلو اسی یہاں نے امرتسر کے کمپنی بارغ، ریا لٹو سینما، مینگو پارک اور دروازہ مہان سنگھ کے باہر والے بارغ کے یو کپش کے درخت سے ملنا ہوا جائے گی۔ جاتی دفعہ ہم لاہور سے سیدھا جالندھر چلے گئے۔ واپسی پر جالندھر سے امرتسر آتے ہوئے بس

تحصیل پورے کے پاس پہنچی تو میں وہیں اتر گیا۔ جانے کس شاعر نے کہا۔

”اے حمید! تمہیں راستہ معلوم ہے ناں؟“

میں سڑک پر کھڑا کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ قیوم نظر کی آواز آئی۔

”یہ اُس کا اپنا شہر ہے۔ وہ راستے کیسے بھول سکتا ہے!“

میں جلتے کتنی دیر سگریٹ پر سگریٹ پیتا، دیران، اور اجنبی امرتسر کے بازاروں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ مہان سنگھ دروازے والے یو کپش کے درخت سے ملا۔ اس تاریخی ملاقات کا حال میں اس مضمون کے شروع میں لکھ چکا ہوں۔ تیسرے پہر میں برنج پھولا سنگھ کے قریب سے ہو کر قبرستان کی سڑک پر اتر گیا۔ قبروں پر پل پھیر دیا گیا تھا۔ جہاں کل قبروں پر اگر تیاں سلگتی تھیں۔ چراغ جلتے تھے، آج وہاں کئی کے کھیت تھے اور بعض جگہوں پر نئے مکانوں کی بنیادیں کھڑی تھیں۔ لوکاٹ اور امرود کے بارغ اُجڑ گئے تھے، کیونکہ امرتسر میں باغبانی مسلمانوں کے پاس تھی۔ میں نے کسی ہندو اور کسی سکھ کو باغبانی کرتے نہ دیکھا تھا۔ اب میں درگاہ کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ میں اُس کھائی کے پاس سے گزرا جہاں خالو جان مرحوم کے بیان کے مطابق انہیں اُلٹے ہاتھ پاؤں والی چڑیل ملی تھی۔ اس کھائی کا پل آدھا ڈھکے گیا تھا۔ اُن ندی نالوں کا نام نشان تک باقی نہ تھا جو تاشپاتی اور امرود کے باغوں کی آبیاری کیا کرتے تھے۔ اسی قبرستان میں ایک عورت کی قبر تھی جس پر سنگ مرمر کی بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ یہ خوبصورت قبر مرمر کے خاوند نے بڑی محبت سے بنوائی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ محبت کرنے والے خاوند نے سنگ مرمر پر اپنی بیوی کی یاد میں بڑے ہی درد انگیز شعر کندہ کرائے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُجڑے ہوئے قبرستان میں یہ سنگ مرمر کی بارہ دری والی قبر جوں کی توں موجود تھی۔ اب میں درگاہ کی طرف چل پڑا۔ اب میں درگاہ کے سامنے تھا، لیکن وہاں درگاہ نہیں تھی۔ نہ والان۔ نہ چہترہ۔ نہ کمرے نہ سجادہ نشینوں کے دیوان خانے اور نہ مقبرہ۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے گیند کی آدمی دیوار تھی جس پر تھاپیاں نیچے سے اوپر تک لگی ہوئی تھیں۔ جہاں سجادہ نشین کا کمرہ تھا وہاں ایک گائے بندھی تھی۔ جہاں نائب سجادہ نشین کا کمرہ تھا وہاں ایک جٹا دھاری سادھو بیٹھا، انگ بھجھوتہ رماٹے چرس کے سوٹے لگا رہا تھا۔ اور جہاں کبھی دودھ کی نہریں بہا کرتی تھیں وہاں آگ اور تھوہر کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد مجھ سے کچھ نہ دیکھا گیا۔

ہاں۔۔۔ پلٹے ہوئے میں نے ایک نظر اُس طرف دیکھا جہاں دادا جان دری پر آلتی پالتی مارے

بیٹھے چڑیوں کو بھروسے ڈالا کرتے تھے۔ چڑیوں کو پانی پلایا کرتے تھے۔ اور جیب کوئی چڑیا اُن کے کندھے پر بیٹھ جاتی تو اُس سے باتیں کیا کرتے تھے۔ وہاں کوئی چڑیا نہیں تھی۔ کوئی داوا جان نہیں تھے، لیکن ایک بڑی ہی پیاری آنکھوں والی گھری، شیشم کے پتوں پر بیٹھی، سورج کی تابناک روشنی میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

الوداع! میری پیاری گھری! میری پیاری چڑیو! میری پیاری بہنو!

امرتسر اور سیب کا درخت

میں بی آر بی نہر کے کنارے گنجان ٹاہلیوں کے سائے میں کھڑا ہوں۔ میری بائیں جانب ڈھلان پر اینٹوں کا وہ چبوترہ ہے جہاں میجر عزیز بھٹی ٹینک کا گولہ لگنے سے شہید ہوا تھا۔ میں اس نہر پر پہلی بار آیا ہوں۔ آج سے انیس بیس برس پہلے میں نے پاکستان ٹائمز میں اس نہر کی ایک تصویر دیکھی تھی جس میں لاہور کے طلباء، دیہات کے لوگ اور شہری کدالیں اور بچاؤ کے چلاتے اس نہر کی کھدائی کر رہے تھے۔ ٹی ماؤس میں بیٹھے ہوئے دوستوں نے اس نہر پر معمولی سا تبصرہ کیا اور پھر ڈورس ڈسے کی سحر انگیز آواز اور ولیم فاکرز کے تازہ ترین ناول پر باتیں شروع ہو گئیں۔ دوسری دفعہ میں نے اس نہر کو اُس وقت دیکھا جب میں پاسپورٹ جیب میں رکھے امرتسر جاتے ہوئے اس کے پل پر سے گزر رہا تھا۔ چوڑی چمکی لہالب، سست رفتاری سے بہتی ہوئی ایک پر وقار نہر۔ میں اس سے بڑا متاثر ہوا اور مجھے امرتسر کی بڑی نہر یاد آگئی۔ ام کے گنجان درختوں کی دورویہ قطاروں کے بیچ میں سے گزرتی ٹھنڈے پہاڑی چشموں کے پانی سے بھری ہوئی نہر۔ جہاں پر مٹی جوں کی چھلقاتی دوپٹوں میں نہانے جایا کرتے تھے۔ ویسے بھی امرتسر نہروں سے بھرا پڑا تھا اور ہمارا بچپن نہروں میں چھلا لگیں لگاتے گزرا تھا۔ بڑی تہریں، چھوٹی تہریں اور پھر اُن سے نکلے ہوئے نالے جو آکھچے، ناخ اور لوکاٹ کے ٹھنڈی چھاؤں والے باغوں میں سے ہو کر گزرتے تھے۔ میں امرتسر کی بڑی نہر یاد کرتا ہی آر بی کے پل سے گزر گیا اور بی آر بی کو بھول گیا تھا۔ میرا دل امرتسر کی یاد سے لبریز تھا۔ وطن سے ہجرت کرنے کے بعد پہلی بار امرتسر جا رہا تھا۔ امرتسر جو کبھی میرا وطن تھا۔ جس کے گل کوچوں کی خاک میں ابھی تک میرے پاؤں کے نشان تھے اور جس کی خاموش فضاؤں میں کھنڈر بنی مسجدوں کی آوازوں کی آوازیں موج خواب تھیں۔ جس کے مکانوں کی نیم تاریک دیوڑھیوں میں پرانی یادوں کے سائے

لہذا رہے تھے۔ جس کے باغوں کے درخت اپنی شاخیں ہلاتے ہوئے آج بھی ہماری یاد میں بے قرار ہیں اور ہمیں اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ امرتسر۔ جہاں کبھی سورج ہمارے ساتھ طلوع ہوتا تھا۔ سچے گلاب کے پھول بھی کپنی باغ میں داخل ہوتے دیکھ کر کھل اٹھا کرتے تھے کہ ہم چھلانگیں لگا کر انہیں پکڑ لیں۔ میری بس واگہ چیک پوسٹ کی طرف آگے نکل گئی اور بی آر بی پیچھے رہ گئی۔ امرتسر سے واپسی پر میں ایک بار پھر بی آر بی کے پل پر سے گزرا اور بس کی کھڑکی میں سے سگریٹ سگاتے میں نے یونہی ایک سرسری نظر سے نہر کے چوڑے پاٹ کو دیکھا۔ جس طرح ریل میں بیٹھا مسافر اُس چھوٹے سے شیش کی عمارت کو دیکھتا ہے جہاں ریل رُکے بغیر تیزی سے نکل جاتی ہے، لیکن آج بی آر بی نہر ایک زندہ پُر نور اور برگزیدہ ہستی کی طرح میرے سامنے سے گزر رہی رہی ہے اور کھڑی بھی ہے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں ایک عظیم ماں کے حضور میں کھڑا ہوں جس کی موجوں نے مامتا بھری بانہیں پھیلا کر اپنے بیشتر بچوں کی خون آلود مقدس لاشوں کو اپنے سینے سے لگایا ہے۔ ماں کی آنکھیں اُداس ہیں، مگر چہرے پر ایک جلال ہے، پُر شکوہ عظمت ہے۔ گویا ایک روشن ترین سورج ہے جو رات کو طلوع ہو رہا ہے۔ میں بی آر بی نہر کے کنارے، عظیم ماں کے حضور میں سر جھکاٹے کھڑا ہوں اور — اور نہر کی طرف سے آنیوالی ٹھنڈی ہوا میں ماں کے پیار کا لمس محسوس کر رہا ہوں ہر طرف گہری خاموشی ہے اور اس خاموشی میں نہر کا پانی ایک دھیمی سی سرسراہٹ کے ساتھ بہتا چلا جا رہا ہے۔ یوں لگتا ہے گویا پُر جلال نورانی چہرے والی ماں مجھ سے خاموشی کی زبان میں باتیں کر رہی ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو اپنے اُم میرے کنارے چپ چاپ کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟ کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا تم نے اُس روز مجھے دیکھا تھا جب بھارتی ٹینکوں اور توپوں کے گولے آگ برساتے میرے اوپر سے گزر رہے تھے۔ جب میرے بچے اپنی ماں کے ناموس کو بچانے کے لیے حملہ آور دشمن کے ٹینکوں سے ٹکرا گئے تھے۔ ماں! میں نے اپنے بچوں، پاک فوج کے غازیوں کے جگمگاتے نورانی چہرے دیکھے ہیں۔ میں نے دشمن کے آگ و آہن کے طوفان میں چھلانگیں لگاتے ہوئے اُن کے اللہ اکبر اور یا علیؑ کے نعرے سنے ہیں۔ میں نے موت کو اُن کے آگے بھاگتے دیکھا ہے اور آسمان سے اُن پر پھولوں کی بارش برستے دیکھی ہے۔ وہ ماں کے لعل تھے۔ بہنوں کے ہیرے موتی تھے۔ بیویوں کے سہاگ تھے اور اپنے بچوں کے پیارے ابو تھے۔ اُن کے سروں

کے سائے تھے، لیکن اس وقت وہ اللہ کے شیر تھے۔ کاش، تم نے دشمنوں کے جنگل میں اُن شیروں کی دل ہلا دینے والی دواڑیں سنی ہوتیں۔ وہ اللہ کے سپاہی تھے۔ کاش، تم نے اُن اللہ کے ہی سپاہیوں کو اللہ کے دین کی عزت، غیرت اور حرمت پر شہید ہوتے دیکھا ہوتا کہ بندہ مومن کا ماتھے اللہ کا ماتھہ کیسے بنتا ہے اور پھر اُس کی ضرب کا رکشا، غالب و کار آفریں کیسے ہوتی ہے، مگر تم تو محض نہر کو دیکھ رہے ہو۔ اُس روز اگر تم یہاں ہوتے تو مجھے بھی دیکھتے۔ اُس پاک جہیں مقدس ماں کو دیکھتے جس کی حرمت کے لیے پاک فوج کے نرو کی آگ میں بے خوف و خطر ہنستے مسکراتے۔ اللہ اکبر اور یا علیؑ کے فلک شکاف نعرے لگاتے گزر رہے تھے۔ اُس روز تم اس عالم فانی کا سب سے بڑا معجزہ دیکھتے۔ تم آگ کو گلزار میں بدلتے اور موت کو زندگی کا روپ دھارتے دیکھتے۔ تم دیکھتے کہ قرآن کے اوراق میں جب بندہ مومن کا خون گردش کرنے لگتا ہے تو دشت و جبل اُس کی لٹکارتے کسی طرح تھر تھرا کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑی عجیب گھڑی تھی۔ وہ بڑی عظیم گھڑی تھی تاریخ کے چودہ سو سال سمٹ کر میدان بدر اور میدان کربلا میں چمکتی تلواروں کے سایوں میں آگئے تھے ایک جانب وہی جبر و استبداد کی یلغار تھی اور دوسری جانب وہی ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن کی عظمت کی لٹکارت۔ ایک طرف شرار بولہبی کا جہنم تھا اور دوسری طرف چراغ مصطفویؐ کی قلم و استبداد کے اندھیروں کو بھاڑ دینے والی ضیا پاشیاں۔ کفار کی عبرت انگیز ہلاکت تھی اور بندہ مومن کی ایمان افروز شہادت مشین گنوں اور رائفوں پر جھے ہوئے ہاتھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والی تلوار اپنے چودہ سو سالہ نیام میں سے کوندے کی طرح لپک کر باہر نکل آئی تھی اور کفر و الحاد کی گھاٹوں کو پاش پاش کر رہی تھی۔ قرآن کی تلاوت کی باجبروت آوازیں تھیں اللہ اکبر اور یا علیؑ جبر کے نعرے تھے مجھے اپنے آپ پر نہر فرات کا گمان ہونے لگا تھا جس کے کنارے آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کے دین کا پرچم سر بلند کرنے کے لیے کفر کی طاقتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ یا اللہ مجھے معاف کر دینا۔ میں نہر فرات کی ریگ کے ایک ذرے کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میں نہر فرات نہیں تھی، مگر میں نے تیرے مومنوں کو تیرے نام کی عظمت کی خاطر پُر سکون، پُر جلال، پُر نور چہروں کے ساتھ شہید ہوتے ضرور دیکھا ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

لیکن میرے بیٹے اُس روز تم کہاں تھے؟

اور میں نے سوچا کہ میں چھ ستمبر کو کہاں تھا؛ چھ ستمبر کی صبح کا سورج میں تے کوہ مری کی پہاڑیوں میں طلوع ہوتے دیکھا تھا۔ میں سورج نکلنے سے پہلے ہی اپنے سنی بینک والے کالج سے نکل کر محکمہ ترقی آثار کے ذخیروں کی طرف آگیا تھا۔ اس محکمے نے پہاڑ کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ ہسپانوی، لاطینی اور فرانسیسی سیب کے درخت لگا رکھے ہیں۔ میں نے نیچے گڈنہ روڈ پر سے گزرتے ہوئے اکثر ان درختوں کو ڈھیلان کے ساتھ ساتھ دیکھا تھا۔ شاخوں میں لال لال سیب دھوپ میں چمکتے نظر آیا کرتے تھے اور مجھے بے اختیار گالزوروی کا ناول "سیب کا درخت" یاد آجاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی نرم شرمیلی آواز اور پُرسکون باجیا آنکھوں والی میگن کا خیال بھی، جس نے ایشرسٹ سے محبت کی۔ ایشرسٹ اور میگن چٹے کے پاس سیب کے درخت کے نیچے چاندنی راتوں میں ملا کرتے تھے۔ میگن کے تھے منے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے اور ایشرسٹ انہیں چوم کر گرم کیا کرتا اور پھر ایشرسٹ اُسے چھوڑ کر شہر چلا گیا۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ میگن اُسے نہ بھلا سکی۔ وہ چاندنی راتوں میں سیب کے درخت سے جا کر کھڑی ہو جاتی اور چٹے کے پانی میں چاند کو طلوع ہوتے دیکھتی رہتی اور پھر ایک روز گاؤں والوں کو اسی سیب کے درخت کے نیچے میگن کی لاش ملی۔ وہ چٹے کے سرو پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کے سہری ریشمی گیلے بال کافی زدہ پتھروں میں الجھے ہوئے تھے۔

گڈنہ روڈ پر سے گزرتے ہوئے میں جب بھی اوپر ڈھلان کی طرف نگاہیں اٹھا کر سیب کے درختوں کو دیکھتا تو مجھے یوں لگتا جیسے بھولے بھالے چہرے والی پاک دل میگن سیب کے درخت کے ساتھ لگی اُداس نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔

چھ ستمبر کی صبح کے لیے میں نے پنڈی جانے والی گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس میں سیٹ بک کر دار کھی تھی۔ میں ستمبر میں مری ضرور جاتا ہوں۔ یہی وہ دن ہوتا ہے جب مری کے خوشبودار میٹھے سیب چلتے ہیں۔ ٹائر سُرخ ہو جاتے ہیں ٹکوں میں بے دھڑک پانی آجاتا ہے اور مری کی سڑکیں زرد رو عبرت انگیز چہروں والے لوگوں سے خالی ہو جاتی ہیں۔

یہ چھ ستمبر کی صبح تھی۔

پو پھٹنے والی تھی۔ موسم سرد تھا۔ میں جانے سے پہلے سیب کے درختوں سے ضرور ملنا

چاہتا تھا، چنانچہ میں نے پُل اور سپینا اور کمرے کے دروازے سے نکل کر برآمدے میں سے گزرتا چیرٹھ کے درختوں میں گھری ہوئی پہاڑی پگ ڈنڈی پر چل پڑا۔ مکنی کے کھیتوں کے گرد باڑھ لگی تھی اور مکنی کے بند بھٹوں پر سے اوس کی بوندیں گھاس پر گر رہی تھیں۔ مشرق کی جانب کچھ دیر بعد طلوع ہونے والے سورج کی ہلکی ہلکی چٹکیاں نمودار ہونے لگی تھیں۔ آسمان پر ستارے چاندی کے پھولوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ایک بے حد روشن سہری بڑا ستارہ چیرٹھ کے جھنڈ کے بالکل اوپر دمک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ درختوں کے اوپر چمک کر نیچے کچھ دیکھ رہا ہے۔

اُس وقت بھارت کی فوجوں نے پاکستان کی سرحد پر پانچ گنا بڑی طاقت کے ساتھ حملہ کر دیا تھا اور اُس کی بکتر بند گاڑیاں بہتے دیہاتیوں پر گولیاں چلاتی پاکستان کے سرحدی گاؤں میں گھسی آئی تھیں۔

ذخیرے والے سیب کے درختوں میں اندھیرا تھا۔ اس ذخیرے کی طرف سے شبنم اُلوو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے جن میں سیب کی ہلکی ہلکی خوشبو بھی تھی۔

میں اُس درخت کے نیچے اکر کھڑا ہو گیا جہاں میں نے سڑک پر سے گزرتے ہوئے اکثر جوہورت میگن کو دیکھا تھا۔ یہ درخت دوسرے درختوں سے پھیلاؤ میں بڑا تھا اور اُس کی گھنی شاخیں سُرخ سُرخ سیبوں سے لدی تھیں۔ تنے پر انگریزی میں لکھی ہوئی ایک تختی لگی تھی جو اندھیرے میں پڑھی نہیں جا رہی تھی۔ میں نے میگن کو یاد کر کے آنکھیں بند کر لیں اور گہرا سانس لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں میٹھے سیب کی مرطوب خوشبو پی رہا ہوں۔ مجھے اپنے اوپر سیب کے درخت کا گمان ہونے لگا اور پھر میں نے اپنے تھے پر میگن کے پاکیزہ جسم کا گرم لمس محسوس کیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں مجھے یقین تھا اگر میں چند لمحوں اور آنکھیں نہ کھولتا تو میرے جسم سے ہری ہری شاخیں پھوٹ پڑتی اور سیبوں کے گلابی شگونے کھل اُٹھتے۔ میں نے درخت کے تنے پر محبت سے ہاتھ رکھا۔ میگن نے اپنے ننھے منے ٹھنڈے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھام لیا اور میں نے اُس کی ہتھیلی چوم کر گوشی میں کہا۔

"الوداع میگن!"

اُس وقت پاک فوج کے جیالے سپاہی وطن پاک کی حفاظت کے لیے دشمن کی اُگ لگتی

توپوں اور ٹینکوں کے آگے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔

والداع میگن امیر سے پیارے سیب کے درخت! میرے سرخ سرخ سیبوں کے لرے ہوئے درخت تو نے میرے وطن کی مٹی سے منحاصل کی ہے۔ میرے وطن کے سورج سے رنگ لیا ہے اور میرے وطن کی راتوں سے شبیم کی شیرینی لی ہے۔ تو سدا پھلا پھولا رہے۔ اگلی بہار تک کے لیے والداع! میں پھر آؤں گا۔ جب تیری ٹہنیاں گلابی شکوفوں سے لدی ہوں گی اور سیاہ بھنورے اپنا میٹھا لاک لاپ رہے ہوں گے۔

مشرق کی جانب سورج کی اولین سنہری روشنی نمودار ہو رہی تھی اور پھر ایک بے حد روشن کرن شعاع نور بن کر آسمان پر پھیل گئی اور سینی بینک کے درختوں، مکئی کے لہلہاتے پودوں کے ہرے ڈنٹھل اور ڈھلاؤں پر آگی ہوئی گھاس اور گھاس میں بکھے ہوئے بنفشہ کے پھول تصویر بن کر سامنے آ گئے۔ میں پہاڑ کی شفاف، سبزے اور پھولوں کی جھک سے لبریز پاکیزہ ہوا میں سانس لیتا واپس اپنے کاٹچ کی طرف چل پڑا۔ صبح ہو چکی تھی اور مری کے پہاڑی کاٹچ سفید دھوپ میں چمک رہے تھے کہ میں بس کے انتظار میں سینی بینک پوسٹ آفس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں بس آگئی اور میں پنڈی کی طرف روانہ ہو گیا۔

اُس وقت لاہور توپوں اور بموں کے دھماکوں سے ہل رہا تھا، لیکن مری کے قرب وجوار میں مکئی کے کھیت صبح کی دھوپ میں لہلہا رہے تھے۔ یہاں کسی کو ابھی تک کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی اس سے پہلے آزاد کشمیر کی مجاہد فورس کی فتوحات کی خبریں لوگوں تک پہنچ چکی تھیں۔ لیکن بھارت لاہور پر حملہ کر دے گا، یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس راولپنڈی کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ بس بولے بولے گرم ہوتا شروع ہو گئی۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی شاندار بھول کے ایئر کنڈیشننگ کے بیٹھے ہوں کہ اُس کا ایئر کنڈیشنر خراب ہو کر بند ہو جائے اور کمرے کی ٹھنڈی فضا آہستہ آہستہ گرم ہونا شروع ہو گئی ہو۔ کہنی بارغ اور ٹریٹ سے نیچے اتر کر بس میدانوں میں آئی تو گرنی اپنے پودے جو بن پرانگنی۔ میں نے اپنے بیگ کے اندر پرانے کپڑوں میں ماتہ ڈال تو وہ ابھی تک ٹھنڈے تھے۔

بس راولپنڈی پہنچ گئی۔ یہاں بھی ابھی تک کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔ میں اپنے دوست کی تلاش

میں دو گلی ٹی ہاؤس پہنچا۔ ہم نے چلے پی۔ مری اور لاہور کی باتیں کیں اور پھر ریوے سٹیشن پر آ گئے میں دوپہر کو پنڈی سے لاہور جانے والی ریل کار میں سیٹ بک کرانا چاہتا تھا۔ یہاں اگر معلوم ہوا کہ لاہور سے ابھی تک وہ ریل کار بھی نہیں آئی جسے صبح آنا تھا۔ بنگلہ کرک نے بتایا کہ دھونگل شریف کے سٹیشن پر بھارت کے ہوائی جہاز نے ریل گاڑی پر بم گرایا ہے جس کی وجہ سے گاڑیوں کی آمد و رفت رُک گئی ہے۔

اب ہمیں کچھ تشویش ہوئی۔ جس وقت ہم واپس صدر پہنچے تو سارے راولپنڈی شہر میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے اور صدر پاکستان ابھی چٹلچوں میں قوم سے خطاب کرنے والے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے فلمی گانے بند کر دیئے گئے تھے اور ملی ترانے بجائے جارہے تھے۔ ہم چوک میں ایک پنڈی کی دکان کے آگے کھڑے ہو گئے لوگوں کا بے پناہ ہجوم جگہ جگہ ریڈیو کے گرد جمع تھا۔ پھر صدر پاکستان نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے کے بعد قوم کو بتایا کہ بھارت نے رات کے اندھیرے میں بزدلوں کی طرح پاکستان پر حملہ کر دیا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ اس نے کس قوم کو لٹکا رہا ہے۔ ہم کلمۂ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے دشمن کی یلغار کے آگے سیسہ پلائی دیوار بن کر بڑھیں گے اور اُس وقت تک بڑھتے چلے جائیں گے جب تک کہ دشمن کی توپوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا نہیں کر دیتے۔

صدر پاکستان کی تقریر کے بعد پنڈی کی فضا الشداکیر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ میں نے دیکھا کہ پنڈی کے لوگوں کے حوصلے بہت بلند تھے۔ ہر شخص کے چہرے پر جوش اور دشمن کو ملامت کر دینے کا عزم تھا۔ اب میرا لاہور پہنچنا بڑا ضروری ہو گیا تھا۔ ریڈیو پاکستان کو میری ضرورت تھی۔ لاہور کو میری ضرورت تھی۔ وطن پاک کو میری ضرورت تھی۔ بڑی مشکل سے مجھے لاہور جانے والی ایک بس میں سیٹ مل گئی۔ بس ساڑھے پانچ بجے پنڈی سے روانہ ہوئی۔ پانچ بجے کی خبروں میں شکیل احمد نے گرجدار آواز میں بتایا تھا کہ حملہ آور دشمن کا لاہور پر حملہ پا کر دیا گیا ہے اور وہ لاشیں چھوڑ کر پیچھے ہٹے پر غبور ہو گیا ہے۔ میرا دل ایک عجیب پُر جوش جذبے سے لبریز ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۷ میں مسلمانوں نے قائد اعظم کی قیادت میں اپنے لیے ایک علیحدہ وطن پاکستان حاصل کیا تھا۔ برسوں کے سینے پر اُس وقت سے سانپ لوٹ رہا تھا۔ سترہ سال کے بعد اس نے

اپنے زعم میں پاکستان کے وجود کو ختم کرنے کے لیے حملہ کر دیا تھا اور پاکستانی قوم کی آزمائش کا وقت آگیا تھا۔

”خدا ہمیں اس آزمائش میں سرخ رو کرے۔ آمین!“

میرے دل سے بے اختیار دعا نکل گئی۔ پھر مجھے یقین ہو گیا کہ ہم انشا اللہ اس آزمائش میں پورے اتریں گے ہم نے پاکستان لاکھوں جانوں کی قربانی سے حاصل کیا ہے ہمارے بچے ہوئے شہروں کے گلی کوچوں اور مکانات کی دہلیزوں اور کھیتوں اور میدانوں میں ابھی تک ہمارے عزیزوں بھائیوں اور ماؤں بہنوں کا خون جما ہوا ہے ہمارے کانوں میں ابھی تک ہندو سکھوں کی تلواروں سے شہید ہوتے ہوئے معصوم بچوں کی چیخوں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ ہم ابھی تک اپنے آباؤ اجداد کے مکانات سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ اور ان شعلوں میں ہمارے بچوں کی لاشیں جل رہی ہیں۔ ہم نے اپنے بچے قربان کر کے پاکستان حاصل کیا ہے۔ ہم اپنی جانیں قربان کر دیں گے، مگر پاکستان پر حرف نہ آنے دیں گے۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اللہ کے نام پر، اس کے دین کی بقا کے نام پر بنا ہے۔ ہم اسلام اور اللہ کے دین کی حفاظت کریں گے۔ زندہ رہے تو غازی۔ مر گئے تو شہید۔

بس لاہور کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

گوجران سے آگے نکلے تو اندھیرا بڑھنے لگا۔ شام غروب ہو گئی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہر طرف بلیک آؤٹ تھا۔ گوجران سے کوئی سات میل آگے آئے ہوں گے پولیس نے بس روک لی اور راولپنڈی جانے کو کہا، کیونکہ پوری جی ٹی روڈ پر نہ صرف بلیک آؤٹ تھا بلکہ کرفیو بھی لگا تھا۔ مسافروں کے چہرے لٹک گئے۔ ایک کاروباری آدمی اپنی بیوی کیساتھ سفر کر رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ لاٹ پور روڈ کی طرف سے لاہور چلے، پٹرول کا سارا خرچہ وہ خود ادا کرے گا، مگر ڈرائیور رھانہ نہ ہوا۔ بس والی گوجران کے آؤٹے پر اکر کھڑی ہو گئی ڈرائیور نے گوجران تک کے پیسے کاٹ کر باقی پیسے سواروں کو واپس کر دیئے۔ میں نے سوچا کہ گوجران ریلوے اسٹیشن سے کوئی ٹرین پکڑ کر لاہور پہنچ جاؤں گا، چنانچہ میں ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ کہیں کسی جگہ بھی کوئی لائٹن یا بجلی کا بلب نہیں چل

رہا تھا۔ ایک پراسرار، خفیف سی دہشت چاروں طرف اندھیرے میں منڈلا رہی تھی۔ لوگوں کے حوصلے بلند تھے، لیکن بہر حال دشمن نے ملک پر حملہ کر دیا تھا۔ قوم پر امتحان کا وقت آن پڑا تھا۔ شہادت کا وقت آگیا تھا۔ میں شہادت دیتا ہوں، کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔

بنگلہ لڑکے اوٹ میں ننھی سی موم بتی جلا کر کھڑکی میں بیٹھا۔ اس نے مجھے لاہور کا ٹکٹ دیا۔ کوئی گاڑی کب لاہور کو جا رہی تھی؟ کچھ خبر نہ تھی۔ میں پلیٹ فارم پر اکر ٹھہرنے لگا۔ تمام بچے رُکے ہوئے تھے۔ آسمان پر تارے چمکنے لگے تھے جی کی دھیمی روشنی میں ریلوے لائن دور تک اندھیرے کے غار میں گم ہوتی نظر آرہی تھی۔ ایک مٹری ایکسپریس آئی اور بغیر رُکے لاہور کی طرف تیزی سے نکل گئی۔ اب اندھیرے میں کچھ کچھ دکھائی دینے لگا تھا۔ لوگ ٹولیوں کی صورت میں ادھر ادھر بیٹھے جنگ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ٹی ٹال پر میں نے چائے کے ساتھ دو سلائیس کھائے اور سگریٹ سلا کر ٹھہرنے لگا۔ رات کے گیارہ بج گئے۔ میں تھک گیا اور ایک کھبے کے ساتھ لگ کر پلیٹ فارم پر جا بیٹھا مجھے نیند آنے لگی اور میں پلیٹ فارم ہی پر نیم دراز ہو گیا۔ مجھے، ۱۹۴۷ کے وہ دن یاد آگئے جب ہم ہاجرین کرامتسر سے لاہور آئے تھے اور میں نے ایک رات وزیر آباد کے ریلوے پلیٹ فارم پر سو کر گزاری تھی۔ میرا حوصلہ اُس وقت بھی بلند تھا۔ مجھے اپنی بہادری پر کامل یقین تھا اور اپنی فوج کی شجاعت سے بھی میں بے خبر نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ برصغیر کی مسلمان قوم ایک جبری اور بہادر قوم ہے، کیونکہ وہ سوائے خدا کے اور کسی سے نہ ڈرتی ہے اور نہ محبت کرتی ہے۔ میں نے اپنی بہادر فوج کے جوانوں کو براہِ العالمین اور طبروق کے فرنٹ پر بہادری کے جوہر دکھاتے دیکھا تھا اور آج تو وہ دشمن کے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کا عزم ہے کرواہے فرنٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آج تو قوم کا بچہ بچہ سپاہی تھا اور محاذ پر جا کر اپنی آن پر مرٹنا چاہتا تھا۔

پونے بارہ بجے کے قریب راولپنڈی کی جانب سے ایک ٹرین آئی۔ میں اس میں سوار ہو گیا۔ ڈبے میں کافی رش اور اندھیرا تھا۔ گاڑی تھوڑی دیر رُکنے کے بعد لاہور کی طرف روانہ ہو گئی۔ چند بنگالی سپاہی بھی ہمارے ڈبے میں سوار تھے۔ وہ ہنس ہنس کر ایک دوسرے

سے بنگلہ میں باتیں کر رہے تھے۔ پھر ایک بنگالی جوان نے اونچی آواز میں نعت پڑھنی شروع کر دی نعت کا بھیدیوں کھلا کہ وہ ہر بار گاتے گاتے شعر کے آخر میں صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ضرور کرتا۔ جہلم پہنچتے پہنچتے ہماری گاڑی کئی بار رکی اور فوجی گاڑیوں کو راستہ دینا پڑا۔ اب دن نکل گیا تھا اور ہر طرف روشنی پھیل گئی تھی۔ میں نے بنگالی جوانوں کو دیکھا۔ وہ نوجوان لڑکے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہنس ہنس کر لطیفہ بازی کر رہے تھے۔ اب جو میں نے جی روڈ کی طرف نگاہ کی، کاروں، ٹیکسی کاروں، سکوتروں اور لیسوں کا ایک ہجوم پنڈی پشاور کی طرف زرواں تھا۔ میں سمجھ گیا لاہور کے سرمایہ دار اپنی کوٹھیاں اور عالی شان بیڈ روم چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔

گاڑی دھونگل سٹیشن پر سے گزری ہم نے وہ جگہ دیکھی جہاں بھارت کے ہوائی جہاز نے مسافر گاڑی پر بم گرایا تھا۔ اور جس میں مس طوسی شہید ہو گئی تھی۔ وہاں لائن ٹیڑھی ہو گئی تھی اور زمین میں سیاہ گڑھا پڑ گیا تھا۔ گوجر توالہ کے قریب میں نے دیکھا کہ ایک مسافر گاڑی لاہور سے چلی آ رہی ہے جس میں اس قدر رش ہے کہ اس کی چھت پر بھی لوگ سوار ہیں۔ یہ سرحد کے ان دیہات کے لوگ تھے جنہیں بھارتی حملہ آوروں نے تباہ کر دیا تھا۔ گاڑی ہمارے قریب سے گزری تو میں نے ڈبوں میں ایک دوسری کے اوپر بیٹھی ہوئی دیہاتی عورتوں کے پسینے بھرے زرد چہرے دیکھے اور گرمی اور حبس کے مارے روتے بچوں کو دیکھا۔ مجھے وہ مہاجرین ٹرینیں یاد آ گئیں جو ۱۹۴۷ء میں امرتسر جالندھر لدھیانہ روہتنگ اور جھسا سے لاہور آیا کرتی تھیں۔ جن پر راستے میں سکھ اور ہندو غنڈے حملہ کر دیتے تھے اور لاہور سٹیشن پر عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور نہتے جوانوں کی خون میں نہائی ہوئی کٹی پھٹی لاشیں ڈبوں میں سے نکالی جاتی تھیں۔

مجھے آج بھی وہ منظر یاد ہے۔ میں لاہور سٹیشن کے اندر پلیٹ فارم نمبر چار اور پانچ کے پل پر کھڑے نیچے دیکھ رہا تھا۔ فیروز پور سے مسلمان مہاجرین کی ایک گاڑی ابھی ابھی آکر رکی تھی اور اس میں سے مسلم لیگ کے رضا کار عورتوں اور بچوں کی لاشیں باہر نکال رہے تھے۔ میں نے ایک مسلمان عورت کو دیکھا جس کی ایک ٹانگ اور ایک بازو تلواریں سے کاٹ دیا گیا تھا۔ وہ نیم جان تھی اور بار بار اپنا زرد لٹاٹھا اٹھا کر ڈبے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد خون میں تریہ ڈبے میں سے اُس کے شیر خوار بچے کی لاش بھی باہر نکالی گئی اس معصوم بچے کی لاش کا حال میں

بیان نہیں کر سکتا۔ یہ دگداز، دل خراش منظر جب بھی آنکھوں کے سامنے آتا ہے میرا یہ عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے کہ پاکستان کے لیے ہم نے جو بے بہا قربانیاں دی تھیں، وہ ہرگز ہرگز ماینگاں نہیں جائیں گی۔

لاہور سٹیشن میں گاڑی داخل ہوئی تو وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ باڈرائیو کے دیہات سے آئے ہوئے بے سرو سامان لوگ پلیٹ فارموں پر جگہ جگہ ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ ڈبوں میں مسافر بٹھائیں بھرے ہوئے تھے۔ گاڑیوں کی چھتوں پر بھی تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اب میرے دل میں سن سنالیس کی تلخ یادیں تازہ ہو گئیں۔ وہی مناظر اپنی تمام اندوہناکیوں کے ساتھ ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے۔ لاہور کے انہی پلیٹ فارموں پر میں نے مشرقی پنجاب کے دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے مہاجرین کو خستہ حالی اور بے سرو سامانی کے عالم میں پڑے دیکھا تھا۔ پھر زبردست بارشوں اور سیلابوں کے بعد بیماریاں پھوٹ پڑی تھیں۔ میں نے پلیٹ فارم نمبر ایک پر مسلمان مہاجرین کو دم توڑتے دیکھا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک جگہ زمین پر پڑا ہوا کسان دم توڑ رہا تھا اور ایک ڈاکٹر اور پولیس والا جھک کر اس کا نام اور گاؤں کا نام پوچھ رہے تھے۔ اس کا گاؤں۔۔۔ ہوشیار پور، گورداسپور، پٹھانکوٹ یا جموں کی کسی پرسکون ندی کے کنارے ام اور نیم کی گھنی چھاؤں میں گھرا ہوا اس کا پیارا گاؤں۔۔۔ جہاں وہ کھیل کود کر جوان ہوا، جہاں اس نے شادی کی، بچوں کا باپ بنا اور پھر اسی گاؤں میں اپنے بچوں، ماں باپ اور بہن بھائیوں کی لاشیں چھوڑ کر دم توڑنے کے لیے لاہور کے ٹھنڈے سنگین پلیٹ فارم پر آ گیا۔

میں جلدی جلدی لاہور ریلوے سٹیشن سے باہر آ گیا۔ اب مجھے دھماکوں کی دھیمی دھیمی گرج سنائی دے رہی تھی جو داگہ کی جانب سے آرہی تھی۔ لاہور سٹیشن کے باہر پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ لوگ پریشان ہیں۔ میں نے کچھ لوگوں کو سامان اٹھائے بدحواسی کے عالم میں سٹیشن کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ لاہور چھوڑ رہے تھے۔ میں بڑا حیران ہوا۔ میں نے ایک واقف کار سے پوچھا۔

”کیوں بھئی، لاہور چھوڑ چلے؟“

وہ قذافہنا اور بولا:

”نہیں یار، بچوں کو پشاور چھوڑنے جا رہا ہوں۔“

میں نے رکشا کیا اور اسے فیمنگ روڈ چلنے کو کہاں۔ رکشے والے نے تین روپے مانگے۔ میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ رکشا پٹرول لینے کے لئے پٹرول پمپ کی طرف مڑا۔ وہاں رکشوں اور ٹیکسیوں کی قطار لگی تھی۔ اب محسوس ہوا کہ جنگ شروع ہو چکی ہے۔ کوئی آواز گھنٹے بعد ہماری باری آئی۔ میکوڈ روڈ پر لوگ تاگلوں اور ٹیکسیوں پر سامان لادے ریوے سٹیشن کی طرف چلے جا رہے تھے۔ فیمنگ روڈ پر بڑی ہماہمی اور پرجوش ماحول تھا۔ رضا کار روڑیاں پہنے پھر رہے تھے۔ ہمارے محلے میں جتنے داروں کے ناموں کا اندراج کیا جا رہا تھا۔ وارڈن پوشیں وجود میں آ چکی تھیں۔ کوئی دس منٹ گھر میں گزارنے کے بعد میں سیدھا ریڈیو پاکستان کی طرف چلی پڑا۔

اب شام ہو رہی تھی۔ مغرب ہوتے سورج کی لالی نے ایبٹ روڈ پر شیشم کے درختوں کو لالہ زار بنادیا تھا۔ اب توپوں کے دھماکے زیادہ سنائی دیتے تھے ریڈیو سٹیشن کے گیٹ پر فوج کا پڑھا تھا۔ ایمپرس روڈ سے دو فوجی ٹرک گزرے لوگوں نے اپنے بہادر جوانوں کو دیکھ کر اللہ اکبر اور یا علی اور پاک فوج زندہ باد کے پرجوش نعرے لگائے۔ میں نے فوجی نو جوانوں کو دیکھا۔ ان کے چہرے گردا گرد تھے۔ لیکن آنکھیں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں حملہ آور دشمن کو نیست و نابود کر دینے کا آہنی عزم متا رہا تھا۔ ریڈیو سٹیشن میں ہر شخص پرجوش پرجوش تھا۔ دلوں میں ایک نیا ولولہ جاگ اٹھا تھا۔ شہر کے تمام شاعر، ادیب، آرٹسٹ، فنکار، گلوکار، موسیقار اور علماء کرام جمع ہو گئے تھے۔ ولولہ انگیز تقریریں ریکارڈ ہو رہی تھیں۔ پرجوش جنگی ترانے لکھے جا رہے تھے ان کی دھنیں بنائی جا رہی تھیں۔ ان دھنوں کو ریکارڈ کیا جا رہا تھا۔ صادق علی مانڈوا ایک سٹوڈیو سے دوسرے سٹوڈیو کی طرف جاتے جاتے ترانے کی طرز بنالیتا اور ایک گھنٹے بعد ریڈیو سے جنگی ترانے کی آواز گونج اٹھتی۔

پاک فوج کو سلام
سیالکوٹ تو زندہ رہے گا۔
گجری داتا کی۔

اسے ہوا کے راہیوا
رودھا میرا شہر۔

زندہ ہے لاہور۔

سٹوڈیو نمبر ۳ میں ملکہ ترقم نور جہاں بیٹھی ترانہ ریکارڈ کر رہی ہے۔
رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو۔

مجھے یاد ہے۔ ایبٹ پٹر ہٹاں تے متیں دکھ رہے۔ کیہ لہجہ دی ایسی وچ بازار کڑے۔ ریکارڈ کرواتے وقت میڈم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ یہ ترانہ انہوں نے میجر عزیز بھٹی کی شہادت کے اگلے روز ریکارڈ کر دیا تھا۔ سٹوڈیو میں ملکہ ترقم کے ساتھ ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو تھے اور پھر جب دشمن نے قصور پر حملہ کیا اور اسے محیم کرن سے بھی ہاتھ دھونے پڑے تو ملکہ ترقم نے اسی روز ریڈیو پاکستان لاہور کے سٹوڈیو میں یہ ترانہ ریکارڈ کرایا۔

نی میرا سوہنا شہر قصورنی
ایدیاں دھماں دور دورنی
ایہ شہر اے شاہ عنایت دا
ایتھے جتھے شاہ دا ڈیرا اے
ایتھے رات توں دن دا چاٹن لے
ایتھے رہندانت سویرا اے
نی میرا سوہنا شہر.....

ناصر کاظمی انبالے سے ہجرت کر کے جب پہلے پہل لاہور آیا تو آج سے بائیس برس پہلے ہماری پاک ٹی ماؤں میں ملاقات ہوئی۔ وہ انبالے کی پرہاتوں کی باتیں کرتا رہا۔ انہوں نے جھنڈا، سادن کی لمبی جھڑیاں، کوئل کی پکار، سبزے کے فرش، انہوں میں پڑے جھوٹے سترہ برس بعد بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو وہ ارضی پاک کے تحفظ کے جذبے سے بھرپور اٹھا۔ اب انبالہ نہیں، سرگودھا اس کا شہر تھا۔ اس کے قلم نے لکھا ہے
زندہ دلوں کا گہوارہ

سرگودھا میرا شہر

جنگ کے دوران میں ریڈیو پاکستان پر جتنے بھی فنکار، گلوکار، علمائے کرام اور شعرا

آئے، انہوں نے ایک پیسہ بھی معاوضے کے طور پر قبول نہ کیا، چنانچہ ریڈیو پاکستان کی تاریخیں یہ پہلا موقع تھا کہ سٹوڈیو میں گلوکار جنگی ترانہ گارہے یا کوئی عالم دین تقریر کر رہا ہے اور ڈیوٹی روم میں اس کے نام کا کوئی چیک نہیں جانا ہوا۔ جن کے چیک بعض دفتری تقاضوں کے تحت بنتے بھی تھے وہ انہیں وصول کرنے کی بجائے دارفنا میں دے دیتے تھے۔

سات ستمبر کو میں نے لاہور میں ایک نئی قوم ابھرتے دیکھی۔ ایک ایسی قوم جس کا دل زندہ نگاہ بیدار اور یقین محکم تھا۔ چھ ستمبر کی شام والی افرا تفری اور بے نظمی مفقود ہو چکی تھی۔ اب کسی بھی پٹرول پمپ پر کوئی قطار نہیں لگی تھی۔ آپ جہاں سے جتنا چاہیں پٹرول لے سکتے تھے۔ راشن ڈپوؤں پر کھانے پینے کی ہر شے داخلہ مقدار میں موجود تھی۔ ملک میں چوری، ڈکیتی، قتل و غارتگری اور اغوا کی وارداتوں کا وجود تک باقی نہ رہا تھا۔ کہیں بھی کسی بھی جگہ لڑائی مار کٹائی یا فائرنگ کا واقعہ نہیں ہو رہا تھا۔ اخباروں میں جرائم کی ایک بھی خبر نہیں آ رہی تھی۔ ریڈیو سٹیشن پر دن میں ہزاروں فون آتے تھے۔ لوگ پوچھتے تھے کہ ہم ملک اور قوم کی کس طرح خدمت کر سکتے ہیں۔ ہمیں بتایا جائے۔ لوگ فوجی ٹرکوں کو سڑکوں پر سے گزرتا دیکھ کر جوش میں آجاتے۔ وہ حلق بھاڑ بھاڑ کر اللہ کے نعرے لگاتے۔ باغبانپورہ سے پاکستان مرٹل تک لوگوں کا تانتا بندھا تھا۔ وہ نماز پر اپنے فوجی جوانوں کے چہروں پر جلال تھا۔ سورج طلوع ہو رہا ہے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول کے نام پر کفار سے جہاد کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر جنگ بدر کی یاد تازہ کر دی تھی۔ ان غازیان صف شکن، خدا کے شہیدوں، اللہ کے سپاہیوں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متوالوں نے دشمن کو ہر محاذ پر کس طرح ذلت آمیز شکست دی۔ کس کس طرح جوانمردی اور بلند ہمتی سے کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے خود شہید ہو گئے، لیکن دشمن کو ارض پاک پر ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ اس کے بارے میں آپ بہت کچھ پڑھ چکے ہیں اور دنیا کا ہر ملک پاک فوج کی بہادری اور شجاعت کا معترف ہے۔ میں ان سنہری کارناموں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ ہو سکتا ہے میں انہیں بیان کرتے ہوئے فوجی نقطہ نگاہ سے ان کارناموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکوں۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ ہماری پاک فوج کے جیالوں نے سترہ دن کی جنگ میں یہ ثابت کر دکھایا کہ اسلام زندہ ہے۔ مسلمان زندہ ہے اور اللہ کے اس آخری دین کا جب بھی احیاء

ہو تو اس عظیم نشاۃ الثانیہ کا مرکز پاکستان ہوگا۔

جنگ ستمبر کے دو تین سال بعد بھارت سے آئے ہوئے کچھ بہندہ دار سکھادیہوں سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے جنگ ستمبر کی باتیں شروع کر دیں اور کہا کہ یہ ایک سیاسی جنگ تھی جو بعض خیر ملکی طاقتوں کے ایما پر شروع ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے بین الاقوامی انسانیت اور ادب کی انسانیت پرستی کا تذکرہ شروع کر دیا۔ میں نے ان سے کہا۔

اے میرے دوستو، پہلی بات تو یہ ہے کہ بین الاقوامی انسانیت کا نام ہی اسلام ہے اور جب بھارت کی سرکار نے مقبوضہ کشمیر کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر پاکستان پر حملہ کیا۔ تو اس نے بین الاقوامی انسانیت ہی پر حملہ کیا تھا۔ ہماری غیرت کو لگا رہا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر بین الاقوامی انسانیت پرستی کا لحاظ رکھتے ہوئے بھارتی حملہ آوروں کی یلغار کا مقابلہ نہ کرتا اور وہ لاہور پر قابض ہو جاتے تو کیا وہ محض اس بنا پر مجھے معاف کر دیتے کہ میں بین الاقوامی انسانیت کا پرستار ہوں اور یہ کہ راجندر سنگھ بیدی میرا دوست ہے اور الہ آباد کے امپریل ہوٹل والا افسانہ نگار بلونت سنگھ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ جب کسی ملک کی فوج فاتح بن کر کسی ملک میں داخل ہوتی ہے تو وہاں کے افضل ترین انسان کو ذلیل ترین انسان بنادیتی ہے اور یہ بین الاقوامی انسانیت کے خلاف ہے، اسلام کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ اسلام ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ غیرت حقیقت اور خود داری کی تعلیم دیتا ہے۔

غیرت ہے بڑی چیز جہاں تنگ و دو میں

پہنائی ہے درویش کو تاج سردارا

میں جب بھارتی حملہ آوروں کے مقابلے میں سیہ پلائی دیوار بن کر ڈٹ گیا تھا تو میں نے بین الاقوامی انسانیت ہی کی اخلاقی اقدار کو پامال ہونے سے بچانے کی کوشش کی تھی میں تمہارے ناگ پور، کلکتہ، دلی، جھانسی، مدارس اور لکھنؤ سے پیار کرتا ہوں اور وہاں کے رہنے والوں سے دشمنی نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ اسلام مجھے امن اور محبت کا درس دیتا ہے، لیکن اگر تمہارے شہروں کے رہنے والے مشین گنیں، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں لے کر میرے امن پسند شہروں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے حملہ کر دیں گے تو یاد رکھو تمہارے ناگ پور، لکھنؤ، کلکتہ اور جھانسی کا سینہ

چھلنی کرنے کے لیے سب سے پہلا گولہ میرے ٹینک میں سے نکلے گا۔ بھارتی ادیب خاموش ہو گئے وہ جواب کیا دیتے۔ وہ میری بات سمجھ بھی نہ سکے تھے۔ حیرانی مجھے اُس وقت ہوئی جب خود ہمارے پاکستان کے دو ایک افسانہ نگاروں نے چائے کی پیالی پر گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

”چھوڑو یار، جنگ ستمبر تو محض ایک سنٹ تھا۔ ہم ادیب ہیں۔ ہمیں تو ساری انسانی برادری سے پیار کرنا چاہیے۔ ہمیں تو ساری انسانی برادری سے پیار کرنا چاہیے۔ ہمیں جنگ سے نفرت کرنی چاہیے۔ میں نے ایک ادیب سے پوچھا۔

”میرے افسانہ نگار، ڈرامہ نگار دوست، تم انسانی برادری سے پیار کرتے ہو اور جنگ سے نفرت۔۔۔ مجھے بتاؤ تم اپنی جوان بیٹی کے ساتھ ایک سڑک پر سے گزر رہے ہو اور چند غزنو تمہاری بیٹی کو اٹھا کر ٹیکسی میں ڈال کر فرار ہو جاتے ہیں تو کیا تم انہیں کچھ نہ کہو گے؟ کیا تم اپنی بیٹی کی پیچ و پکار سنتے رہو گے اور انسانی برادری سے محبت اور جنگ سے نفرت کا پرچار کرتے رہو گے معاف کرنا اگر تم ایسا کرو گے تو تم جانور سے بھی ارنل ہو گے، کیونکہ یہ بے غیرتی ایک جانور بھی گوارا نہیں کرتا۔“

میرا افسانہ نگار دوست قہقہہ لگا کر ہنس دیا اور بولا:

”تم جذباتی ہو رہے ہو۔ پھر کبھی بات کریں گے؟“

اس نے پھر کبھی مجھ سے بات نہیں کی۔ وہ مجھ سے بات کر بھی نہیں سکتا۔ وہ نہ کفر سے باخبر ہے نہ اسلام سے وہ اچھا مسلمان کیا بنے گا وہ ایک برا کافر بھی نہیں

”زمانے کی قسم انسان گھائے میں ہے۔۔۔“

ہاں۔۔۔ مگر جن کو خدا توفیق دے۔ حکمت کی، ایمان کی سلامتی کی، تم اپنے رب کی کن کن

نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

بی آر بی نہر پر شام کے سائے گہرے ہو رہے ہیں میجر عزیز بھی شہید کی شہادت گاہ پر کوئی اگر بتیاں سنا گیا تھا وہ مجھ گئی ہیں۔ اگر بتیاں بچھ جاتی ہیں، لیکن اُن کی خوشبو باقی رہ جاتی ہے۔ شہادت گاہیں مٹ جاتی ہیں، مگر شہید زندہ رہتے ہیں۔ بی آر بی نہر کا پر سکون پانی بڑی سبک دھاری

سے بہا چلا جا رہا ہے۔ کنارے کے درختوں کا عکس پانی میں گہرا سبز ہو گیا ہے۔ سورج مغرب افق میں غروب ہو رہا ہے نہر کے پانی میں ایک بھی لہر نہیں اٹھ رہی۔ اپنے شہیدوں کی یاد کو سینے سے لگائے وہ ابدی سکون کے ساتھ بہا چلا جا رہا ہے۔ میں میجر عزیز بھی شہید کی شہادت گاہ کی بجھی ہوئی اگر بتیوں اور سوکھے ہوئے پھولوں کو دیکھتا ہوں اور مجھے سیب کے شگوفوں کا خیال آ رہا ہے۔

دور کسی گاؤں کی مسجد سے شام کی اذان کی صدا بلند ہو رہی ہے۔

”میں گواہی دیتا ہوں کوئی نہیں معبود سوائے اللہ کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اُس کے رسول ہیں۔“

اور میں شہید ہوں۔

امرتسر کی ایک ہولناک ات

یہ واقعہ نے کامریڈ موہن سنگھ بکلی نے سنایا۔

کامریڈ بکلی آل انڈیا سوشلسٹ پارٹی کی امرتسر شاخ کا ممبر تھا۔ پارٹی کا دفتر مال بازار میں سندھو اور شکار پور ہوٹل کے سامنے مسجد خیر الدین کے پہلو میں تھا۔ نیچے گراموفون ریکارڈوں کی دکان تھی جہاں سے دن بھر کسی کما جھریا، کبھی اختر کی بائی فیض آبادی، کبھی پیارو قوال اور کبھی سگی، کانن اور چنگ کے گیتوں کی آواز آیا کرتی۔ اسی دکان کی بغل سے تنگ سیرٹھیاں اور پارٹی کے دفتر کو جاتی تھیں۔ سوشلسٹ پارٹی کے دفتر میں ہی امرتسر تانگہ ڈرائیور یونین کا دفتر بھی تھا جس کا سکریٹری کامریڈ چین اور جنرل سکریٹری ظہیر کا شمیری تھا۔ تانے قد اور گھٹے ہوئے بدن والا کامریڈ چین کو جوانوں کے چندے کی شراب پی کر شام کو پارٹی کے دفتر میں اگر خوب اودھم مچاتا، کامریڈ اللہ رکھا ساجد جناح کیپ اور گھر کی پھلی شلوار قمیض میں بڑا خفص معلوم ہوتا۔ وہ پنجابی کا شاعر بھی تھا۔ کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتا۔ ایک روز میں اور احمد راہی دفتر کی باکونی میں کرسیاں ڈالے بیٹھے مال بازار کی رونق دیکھ رہے تھے کہ کامریڈ ساجد ہمارے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ بازار میں ہندو سکھ لڑکیاں بڑی تعداد میں گزر رہی تھیں۔ غالباً اُس روز کوئی تہوار تھا۔ کامریڈ ساجد پہلے تو ان لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

”کامریڈ ایک شعر ہو گیا ہے اردو میں۔ عزم کیا ہے کہ۔“

ہے بات کیا جو بھڑ ہے اتنی لگی ہوئی

کچھ دیکھ رہا ہے آج یہ مال بازار میں۔“

ظہیر کا شمیری نے پارٹی دفتر کے اوپر والے کمرے پر قبضہ جہاں رکھا تھا۔ چادوں طرف کتابوں کے ڈھیر پڑے رہتے۔ در کی پر ایک صندوق رکھی تھی۔ کونے والی میز پر سیاہ پتھر

کا ایک چورس ٹکڑا پڑا تھا جس پر ٹیگور کے نقوش ابھرے ہوئے تھے۔ کامریڈ ساجد، کامریڈ بکلی، کامریڈ شریف متین۔ کامریڈ چین اور کامریڈ کنول۔ یہ لوگ سوشلسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ ظہیر کا شمیری خانساں یونین اور تانگہ ڈرائیور یونین کے لئے کام کرتا۔ میں اور احمد راہی کبھی کبھی اس دفتر میں جا کر گپ بازی میں وقت گزارا کرتے۔

مجلس احرار کا ان دنوں امرتسر میں بڑا اندر تھا۔ مسجد خیر الدین اور انجن پارک کی فضا میں سید عطا اللہ بخاری اور شیخ حسام الدین کی جوشیلی بھڑکسی تقریروں سے گونجا کرتی تھیں۔ اس جماعت میں بڑے خفص کارکن بھی تھے مگر حکومت الہیہ کے پروگرام کی تفصیلات کو یہ واضح صورت میں امرتسر کے مسلمانوں کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔ میرے خیال میں اس جماعت کا سارا جوش شعلہ فشاں تقریروں ہنگامہ خیز جلسوں، پُر ہجوم جلسوں اور فلک شکن نعروں میں صرف ہوتا تھا۔ جو کچھ بھی تھا امرتسر کی سیاسی فضا کو پُر جوش، گرم اور بیدار رکھنے میں مجلس احرار بھی بڑا کام کر رہی تھی۔ اس فوج کو بعد میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی نیلی پوش تحریک نے بھی خوب گرمایا اور جب مسلم لیگ پاکستان کا مہم لے کر سامنے آئی تو امرتسر کے مسلمانوں کو پہلی بار اندھیرے کے سمندر میں دود۔ روشنی کا ایک منار ٹٹھانا دکھائی دیا۔ پاکستان کے قیام کا پروگرام ایک بڑا واضح اور مثبت پروگرام تھا۔ اس پروگرام کی قیادت ایک پُر عزم، بے لوث اور مردانہ کے ہاتھ میں تھی جس نے برہمنی سامراج کے مکرو فریب کے پردے کو چاک کر کے اسلام کا پرچم بلند کیا تھا۔ پنجاب کے مسلمانوں اور خاص طور پر امرتسر کے مسلمان سیاسی طور پر ۱۹۵۶ء سے لے کر اُس وقت تک سیاسی بے یقینی کے اندھیروں میں بھٹکتے رہے تھے۔ ہندوؤں کی تہذیب، کلچر اور مذہب الگ تھا۔ اُن کے ساتھ مل کر وہ رہیں سکتے تھے۔ اُن سے الگ ہو کر رہنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ امرتسر میں ہر خرم اور عید میلاد پر ہندو مسلم فساد ہو جاتا تھا۔ پٹ رنگوں کا تعزینہ گورو بازار میں سے ہو کر گزرتے تھے۔ جو کہ ہندو سکھوں کا گڑھ تھا۔ غیر مسلم اُس تعزینے پر پتھر پھینک کر بھاگ جاتے۔ ایک بار خرم پر کرموں ڈیوڑھی کے ہندو علوانی نے کھوتا ہوا گلی مسلمانوں پر پھینک دیا۔ جس کا بدلہ اُسی وقت ہندو علوانی کی دکان کو تندر آتش کر کے لے لیا گیا۔ امرتسر کا مسلمان بیاد دلیر اور نڈر تھا۔ ہندو سکھ ہمیشہ اُس سے دُوب کر رہتے تھے۔ پھر بھی غیر مسلم اپنی فرقہ وارانہ شرارتوں سے

چھوٹے بھائی مقصود کے ساتھ جلسہ سننے گیا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ جب راجہ غنصفر علی خان تقریر کے بعد تالیوں کے شور میں شیخ سے نیچے اتر رہے تھے تو ایک لگی کارکن نے نعرہ لگایا۔

”راجہ غن علی خان — زندہ باد“

اور میں نے اپنے بھائی کو بتایا کہ یہ لفظ اصل میں غنصفر ہے۔
وقت گزرتا گیا۔ جنگ شروع ہو کر ختم ہو گئی اور شہر میں سیاسی ہنگامے زیادہ تیز ہو گئے گول بارغ، انجمن پارک، مسجد خیر الدین، سکری بارغ اور مسجد جان محمد میں ہر جمعے کو جلسے ہونے لگے۔ شاید انہی دنوں لندن سے کینٹ مشن آیا۔ شملہ کانفرنس ہوئی۔ پاکستان کی منزل قریب آرہی تھی اور امرتسری مسلمانوں میں جوش و خروش بڑھ رہا تھا۔ عورتوں کے جوش پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے لگتا شروع ہو گئے۔ پولیس ان پر آنسو گیس پھینکنے لگی۔ امرتسری کوئی دکان، کوئی ہوٹل، کوئی بیٹھک ایسی نہ تھی جہاں پاکستان اور قائد اعظم کے بارے میں بات نہ ہوتی ہو۔ مارکیٹ حکم سنگھ میں صوفی غلام محمد ترک کا ترک ہوٹل اور کامریڈ ہوٹل امرتسری شاعر ادیبوں اور دانشوروں کے ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس تھے۔ یہاں صبح و شام گرم بجشیں ہوتیں سوشلسٹ پارٹی کے دفتر میں بھی پاکستان زندہ باد کے نعروں کی گونج پہنچ چکی تھی۔ ایک روز مجھے کامریڈ موہن سنگھ بھلی نے کہا۔

”یار تم لوگ تو معلوم ہوتا ہے پاکستان بنا لو گے۔ لیکن ہمارا کیا بنے گا؟“

ہم لوگ ہندوؤں کے ساتھ کیسے گزارا کریں گے؟“

میں نے کہا۔

”بہر حال اسلام کے مقابلے میں تم لوگ ہندو مذہب کے بہت قریب ہو۔“

تمہارا گزارہ ہو جائے گا۔“

اس پر کامریڈ موہن سنگھ بھلی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا اور اس کے بالوں بھرے ادھیر عمر کے پچھلے سے چہرے پر لگی عینک کے شیشے ماند پڑ گئے تھے۔ کامریڈ بھلی بڑا مخلص سکھ تھا۔ اسے مذہب اسلام سے دلچسپی تھی، نہ ہندو وازم سے اور نہ سیکھ مت سے۔

مگر کڑا کرپان وہ ضرور پہنتا تھا اور کیسی بھی اس نے رکھے ہوئے تھے۔ یہ حقیقت اس زمانے میں ہی میرے تجربے میں آچکی تھی کہ ہندو اور سکھ کمیونسٹ ہو کر، دہریہ ہو کر بھی اپنے مذہبی شعائر پر کسی نہ کسی طور قائم رہتے تھے۔ ہمارے محلے کے رام گڑھیا لائی سکول میں ہمارا حساب کھاسٹر ہونا سکھ تھا۔ اور دہریہ تھا۔ یعنی اس نے ڈاڑھی مونچھ اور بال صاف کر رکھے تھے پھر بھی وہ صبح کے وقت شبہ گیر تن بڑے ادب سے ہاتھ باندھ کر سنا اور ہر بات میں گورو نانک اور گورو ارجن کے کسی قول کا حوالہ ضرور دیتا۔ اور اندر ہی اندر وہ دین اسلام کا کٹر دشمن بھی تھا۔

لیکن کامریڈ موہن سنگھ بھلی بڑا مرنجیاں مرنج سکھ تھا۔ جب امرتسری ۱۹۴۷ء کے بعد ہندو مسلم فسادات کی آگ زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھی پھر بھی کامریڈ بھلی کرفیو کھلنے کے بعد پارٹی کے دفتر کا ایک چکر ضرور لگاتا۔ پارٹی کا دفتر مسلم اکثریت کے محلوں میں گھرا ہوا تھا۔ ہم نے اسے کئی بار سمجھایا کہ وہ یوں کھلے بندوں نہ آیا کرے مگر اس نے ہر بار مسکرا یہی کہا۔
”کامریڈ! مجھے مار کر کوئی کیا لے گا۔“

مگر لاہور اسمبلی ہال کی سیرٹھیوں پر ماسٹر تارا سنگھ نے ننگی تلوار لہرا کر اعلان کر دیا تھا کہ سکھ پاکستان کبھی نہیں بننے دیں گے اور مسلمان ہر وقت پر پاکستان بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اور امرتسری کے گلی کوچے پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے بھر رہے تھے۔ چنانچہ ایک روز کامریڈ موہن سنگھ بھلی پر حملہ ہو گیا۔ کامریڈ بھلی نے بڑی مشکل سے جان بچا کر پارٹی کے دفتر میں آکر پناہ لی۔ اس کے بعد اس نے ہال بازار میں دفتر کی طرف آنا بند کر دیا۔ موہن سنگھ بھلی محلہ بے والا کھوہ میں تاروں والے باغ کے سامنے ایک گلی میں رہتا تھا۔ یہ محلہ ہندو اکثریت کا محلہ تھا۔ اس سے آگے جا کر چوک لوہگرہ آتا تھا جہاں دروازہ لوہگرہ کے اس پاس دو چار محلے مسلمانوں کے تھے۔

جو واقعہ مجھے کامریڈ موہن سنگھ بھلی نے بتایا اس کا تعلق اگست ۱۹۴۷ء کے اواخر سے ہے۔ یہ بڑے آگ اور خون لتھڑے ہوئے دن تھے۔ کٹر مذہبیل سنگھ چوک گول ہٹی سے لے کر پچم والے بازار تک اور وہاں سے لے کر مسجد قاصداں تک سارے کا سارا جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ ادھر بازار رام گڑھیاں، کٹر مذہبیل سنگھ، بازار سرے رام داس، بازار بھنگیاں، محلہ

ابو اہیاں اور ہندو اکثریت میں گھیرے ہوئے اسی قسم کے دوسرے محلوں میں مسلمانوں کے گھروں کو نذرِ آتش کیا جا رہا تھا۔ قلعہ گورداسپور اور امرتسر ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے تھے۔ ہندوستان نے مکانات پر ترنگے لہرا دیئے تھے۔ وہ فوج کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خالی مکانات کو ٹوٹ کر آگ لگا رہے تھے۔ ہندو محلوں سے مسلمان محلوں پر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ امرتسر کے گھہ کوہوں، بازاروں، پارکوں، باغوں اور نالوں میں پڑی ہوئی لاشوں کو گدے اور کتے نوچ رہے تھے۔ مسلمان اپنا سب کچھ لٹوا کر مہاجر کیمپوں میں دم بخود بیٹھے شہر کی چار دیواری سے لٹختے سیاہ دھوئیں اور سرخ شعلوں کو تنگ رہے تھے۔ شریف پورہ کی مسلم آبادی کو مہاجر کیمپ قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کے باہر ہماری مشہور بلوچ رجمنٹ مشین گنیں لئے بیٹھی تھی۔ اُسے جی ٹی روڈ عبور کر کے شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ شہر میں گورکھا، ڈوگرہ اور سکھ رجمنٹوں کا راج تھا۔ سوائے ہمارے محلے کٹرہ جہان سنگھ کے امرتسر کی ساری زخم خوردہ مسلم آبادی کیمپوں میں کوچ کر گئی تھی۔ کٹرہ مہاں سنگھ کے مسلمان سمٹ سٹا کر ہماری گلی کوچہ ڈبگراں میں آگئے تھے اور ہم اُن لڑکوں کا انتظار کر رہے تھے جو ہمیں اُس گلی سے اٹھا کر شریف پورے کے کیمپ میں پہنچانے والے تھے۔ کرفیو کے کھلتے اور لگنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سوائے ہمارے محلے کے سارا امرتسر ہندو فوج کی تحویل میں تھا۔ اتنے بڑے شہر میں رہنے والی مسلم اکثریت کے مکانات کو ٹوٹ لوٹ کر آگ لگا کر ہندو سیکھ تک چکے تھے۔ ہماری گلی کے منہ پر لوہے کا مضبوط دروازہ چڑھا دیا گیا تھا۔ پتی گلی، کیسری باغ، محلہ بکرواناں، چوڑا کھوہ، پیلا ہسپتال اور کوچہ انگریزاں کے سارے مسلمان گھرانے ہماری گلی میں پناہ لے چکے تھے۔ یہ لوگ تنگے سر، تنگے پاؤں اپنے مکانات سے بھاگتے تھے۔ ہندو فوج نے دستی بموں اور سٹین گنوں سے ان کے گھروں پر حملہ کر دیا تھا۔ ان میں سے کسی کا سارا خاندان سامنے قتل کر دیا گیا تھا۔ تو کسی کے جوان بچے کے سینے میں گولی مار دی گئی تھی۔ کوئی بچہ اپنی ماں کو پکار رہا تھا تو کوئی اپنے شہید ہو چکے باپ کو رو کر آوازیں دے رہا تھا۔ پاکستان ٹائمز کے مشہور آرٹسٹ اور پاکستان کے نامور باکسر محمود بٹ کا بڑا بھائی حامد بٹ میرا کلاس فیلو تھا۔ اونچا لمبا جوان خوبصورت اور ہلکی کا بہترین کھلاڑی۔ اُس کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔ جب ہندو فوجیوں نے اُن کے محلے پر حملہ کیا تو اُس نے ایک پل کے لئے

کھڑکی کی چٹا اٹھا کر باہر دیکھا۔ بھری ٹاٹ بھری کی ایک گولی اُس کی گردن پر آکر لگی اور وہ وہیں شہید ہو گیا۔ اُس ہنگام قیامت میں غم نصیب گھروا لے حامد کی لاش بھی اپنے ساتھ نہ لاسکے۔ حامد بٹ اگر زندہ رہتا تو آج ہماری قومی ہلکی ٹیم کے اہم ستونوں میں سے ہوتا۔

پیر احمد شاہ کشمیری کڑیل جوان تھا۔ سرخ و سپید رنگت۔ چہرے پر شرعی ڈاڑھی مونچھے۔ پانچ وقت کا نمازی۔ پرہیزگار۔ نیک سیرت۔ اور خوب صورت۔ ہماری گلی سے یہ پتہ کرنے لگا کہ کوچہ رنگریزاں کے سارے مسلمان آگئے ہیں یا نہیں۔ دربار کی پنساری کی دکان کے سامنے چوک میں ہندو تختانیدار بہتر نے اُسے گولی مار کر شہید کر دیا۔ اُس کی لاش بھی وہیں پڑی رہی۔ یہ آنکھیں کس کس مسلمان کی شہادت پر اٹک رہی ہیں؟ یہ سینہ کس کس کے ماتم میں خوں چکپاں ہو؟ ہزاروں ماؤں کے محل مشرقی پنجاب کے شہروں میں بے گور و کفن رہ گئے۔ جن بھائیوں کو اُن کی بیٹیوں نے سہرے باندھنے تھے انہیں کفن بھی نصیب نہ ہو سکے۔ بے شک ہم نے پاکستان اپنے پیاروں کا خون دے کر حاصل کیا ہے اور اپنی جانیں دے کر بھی اس کی حفاظت کریں گے۔

امرتسر آگ اور خون میں نہا رہا تھا۔ فائروں کی آوازیں گونج رہی تھیں فضا میں جلی ہوئی لاشوں اور جلے ہوئے مکانات کی بو تھی۔ ویران سڑکوں پر راتوں کو کتے روتے رہتے۔ ہر طرف خوف اور دہشت کا دور دورہ تھا کہ کامریڈ موہن سنگھ بجلی مجھ سے ملنے میرے محلے میں آیا۔ میں گلی کے کونے والے مکان میں کھڑکی کے ساتھ لگا پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے آہنی جھگے میں سے نیچے جھانک کر دیکھا کہ کامریڈ بجلی ایک پولیس جیپ سے نیچے اُترا اور گلی کے آہنی دروازے کو آہستہ آہستہ کھٹکھٹانے لگا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میٹالی پھسکی دھواں آلود دھوپ لگی ہوئی تھی۔ میں نے بجلی کو دیکھ کر اوپر سے آواز دی۔

”کامریڈ بجلی! کس لئے آئے ہو؟“

مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ شاید وہ ہندو سکھ پولیس کو ساتھ لے کر ہمارے محلے پر حملہ کرانے آیا ہے۔ میں نے سوچا اگر ایسی بات ہوئی تو میں اوپر ہی سے ہندوق کا فائر کر کے اُسے ڈھیر کر دوں گا۔ میری آواز پر کامریڈ بجلی نے چہرہ اوپر اٹھا کر ہاتھ سے عینک درست کی اور بولا۔

”کامریڈ! نیچے آؤ۔ مجھے ہمیں ایک امانت دینی ہے۔“

میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”کونسی امانت؟ کس کی امانت کامریڈ بھلی؟“

”بھلی بولا۔“

”تم نیچے آؤ۔ میں تمہیں سب کچھ بتانے دیتا ہوں۔“

میں نے کہا۔

”مجھے تمہارے ارادے ٹھیک معلوم نہیں ہوتے۔ تم فوج کو لے کر ہمارے محلے میں کیوں گئے“

”ہو؟“

اتنا سن کر کامریڈ بھلی نے پولیس سے کہا کہ وہ جیپ لے کر کوتوالی چلے جائیں وہ اپنے آپ وہاں پہنچ جائے گا۔ جیپ وہاں سے چلی گئی۔ اب بھلی محلے میں اکیلے رہ گیا۔ سامنے دوکانیں ٹوٹی پڑی تھیں اور ان کا سامان باہر کھرا ہوا تھا۔ ذرا دور چوک میں ایک بیل کی پھولی ہوئی لاش مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ بھلی اوپر منہ کر کے کہنے لگا۔

”کامریڈ! میں اب بالکل نہبتا اور اکیلا ہوں۔ اب تو نیچے آ جاؤ یا مجھے اپنے پاس اور پر بلاؤ واکورو کی قسم! مجھے ایک ضروری امانت تمہیں دینی ہے۔“

اب میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس مکان میں اکیلا ہی بندوق لئے پہرہ دے رہا تھا۔ پہرہ کیا تھا بس اتنی ہی ڈیوٹی پر تھا کہ اگر ہندو فوجی حملہ کرنے آتا دیکھوں تو فوراً اطلاع کر دوں تاکہ لگی کے مسلمان وہاں سے بھاگ کر شریف پورے والے کیمپ میں پہنچ جائیں۔ اس مکان کا ایک دروازہ بازار میں بھی کھلتا تھا اور بھلی بازار میں کھڑا تھا۔ خلا جانے کیوں مجھے کامریڈ بھلی کی بات پر اعتبار آ گیا پھر بھی میں نے محلے کے مسلمانوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال کر گوارا نہ کیا۔ میں نے چوبارے کے اوپر والے دروازے کو بند کر کے تالا لگا دیا اور سیڑھیاں اتر کر بازار والے دروازے پر آکر رک گیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازے کی کڑی کھول دی۔ بندوق میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کا رخ اگرچہ براہ راست بھلی کی طرف نہیں تھا لیکن وہ میرے نشانے کی زد سے باہر بھی نہیں تھا۔

”کونسی امانت ہے کامریڈ بھلی؟“

”مومن سنگھ بھلی کا چہرہ اتر ہوا تھا اور ڈاڑھی کے بالوں میں ہلکی ہلکی پڑی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ جیسے اُسے بندوق کا ذرہ برابر بھی خوف نہ ہو۔ میرے پاس آکر بولا۔“

”کامریڈ! یہاں سیڑھیوں میں بیٹھ کر ہی مجھ سے دو چار باتیں سن لو اور پھر اپنی امانت لے لو۔ واکورو کی کرپا ہے کہ تم مل گئے ورنہ یہ بوجھ جانے کتنی دیر مجھ پر رہتا۔“

ہم دونوں سیڑھیوں میں بیٹھ گئے۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں کوئی چیز رومال میں لپیٹی ہوئی تھی جسے اُس نے اپنی صدری کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ رنگ اُس کا بھی اٹرا ہوا تھا۔ میں نے سیڑھیوں کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ سلاخ دار روشندان میں سے مٹیائی متا زدہ دھوپ کی ہلکی روشنی اور نہال سنگھ کی جلی ہوئی دکان میں سے گندے بیروزے کی یواندر آرہی تھی۔ مومن سنگھ بھلی نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں جلدی جلدی جو دردناک واقعہ مجھے سنایا اُسے میں آج آپ کو اپنی زبانی سناتا ہوں۔

جس روز کامریڈ مومن سنگھ بھلی پولیس کی جیپ میں بیٹھ کر مجھ سے ملنے آیا یہ اُس سے ایک روز پہلے کا ذکر ہے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں مومن سنگھ بھلی والا کھوہ میں رہتا تھا جو کہ ہندو اکثریت کا محلہ تھا اور ۱۵ اگست کے بعد تو ان علاقوں میں کسی مسلمان کے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان علاقوں سے مسلمانوں کی ساری آبادی دائم گنج اور ریگوبرج کی جانب سے نکل کر مہاجر کیمپوں یا ریفریجی ٹرینوں میں بیٹھ کر پاکستان کی طرف کوچ کر چکی تھی ان مسلمانوں کے چھوڑے ہوئے دیران غلوں میں ہندو سیکھ لوٹ مار میں مصروف تھے۔ وہ مکانوں کو لوٹ لوٹ کر آگ لگا رہے تھے۔ امرتسر کا مشہور پنجابی شاعر اور ادبی محفلوں کی جان جاں چاچا عیسیٰ اسی علاقے میں شہید ہوا۔ وہ ہندوؤں کی بنائی امن کمیٹی کے ارکان کے ساتھ امن کی بات چیت کرنے گیا کہ اُسے گولی مار دی گئی۔ ہم نے اُس کی لاش حاصل کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ ایک بھنگی نے ہمیں ترک ہوئی میں آکر بتایا کہ اُس نے اپنی آنکھوں سے چاچا عیسیٰ کو گولی کھا کر گرتے دیکھا ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حاب ان ویران و بہشت زدہ گلی کو چوں میں بند و سکھ غنڈے فوج اور پولیس کے ساتھ مل کر
دندناتے پھرتے تھے۔ کہیں جل بجھے مکان سُلگ رہے تھے اور کہیں تازہ لگن آگ کے شعلے
آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ مسجدوں کے منبر توڑ کر بندوؤں نے وہاں مورتیاں لا کر رکھ
دی تھیں اور دروازوں پر کھریا مٹی سے "اوم" لکھ دیا تھا۔ موہن سنگھ بھلی کے بیان کے مطابق
وہ شام کے وقت کرفیو لگنے سے کچھ دیر پہلے گول باغ کی طرف سے ہاتھی گیٹ کی جانب آ رہا
تھا کہ سینٹرا مندر کے پاس اُسے اُس علاقے کی نام نہاد امن کمیٹی کا چیرمین بھرام مل گیا۔ بھرام کبھی
کبھی پارٹی کے دفتر میں بھی آیا کرتا تھا۔ ہمیشہ جھک کر ملتا۔ بڑا انکسار دکھاتا۔ اُس روز
بھرام نے شراب پی رکھی تھی اور وہ موہن سنگھ بھلی کو زبردستی اپنے ساتھ سینٹرا مندر کے پچھواڑے
تالاب کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی کوٹھڑیوں میں سے ایک کو ٹھہری میں لے گیا۔ یہاں بھرام کے
چھ سات بندو دوست شراب پی رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ موہن سنگھ ان سب
کو جانتا تھا۔ اُس نے بہت کہا کہ اُسے گھر جانا ہے۔ کرفیو کا وقت پورا ہے لیکن کسی نے ایک
نہ سنی۔ بھرام نے شراب کا گلاس اٹھا کر کہا۔

"بھلی! کونسا کرفیو! کیا کرفیو! امرتسر میں اب ہمارا راج ہے۔ آج ہم تمہیں سورگ
کی سیر کرائیں گے۔" اور قبقرہ لگا کر وہ پورا گلاس چڑھا گیا۔ اب موہن سنگھ بھلی کو علم ہوا کہ ان
بندوؤں نے شہر کے اندر سے کسی مسلمان لڑکی کو اغوا کر کے ساتھ والی کوٹھڑی میں بند کر رکھا
ہے اور شراب ختم کرنے کے بعد اُسے اپنی بربریت اور وحشت کا نشانہ بنانے والے ہیں۔
موہن سنگھ بھلی کا کہنا ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ خدا جانے وہ کس شریف باپ کی بیٹی
تھی اور یہ لوگ اُسے اٹھا لائے تھے۔ موہن سنگھ نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اُس لڑکی کو
ان درندوں سے ضرور بچائے گا۔ مگر بھرام اور اُس کے غنڈے دوستوں کی آنکھیں شراب
پی کر خون ہو رہی تھیں۔ یہ بھوکے بھیڑیے کے جبرٹوں سے اس کا ترنوالہ جھپٹنے والی بات تھی۔
پھر بھی موہن سنگھ بھلی کہتا ہے کہ میں نے اُسکی بے کس و مجبور مسلمان بیٹی کی مدد کرنے کا فیصلہ
کر لیا اور اس مقصد کے حصول کے لئے خود بھی بھرام کے ساتھیوں کی ہاد ہوئی شریک ہو گیا
ایک ہندو غنڈہ بھوک کر اُسے پاؤں سے مل کر بولا۔

"میں مسلمانوں کو یوں ہی مسل دوں گا۔ بااٹا۔ بھرام اچلو اُس مُسلی (مسلمان عورت)
کے پاس چلو۔ سالی کو اب ہوش آگیا ہوگا۔
دوسرا بولا۔

"بھرتاجی! میری مانو۔ اس نے بے ہوشی کا بہانہ بنایا ہے۔"
بھرام اپنے گلاس میں شراب انڈھیلنے ہوئے جھکولے کھا رہا تھا۔
"بہت۔۔۔ چپ رہ رام مورتی!۔ ان مسلمانوں کی عورتوں کو ہم الٹا لٹکا دیں گے۔
کیا سمجھتا ہے۔"

"بل جی! وہ سالی بچے بند نہیں کہہ رہی تھی۔"
موہن سنگھ نے پوچھا۔
"کیا کہتی تھی وہ؟"

بھرام میز پر مکتا مارتے ہوئے چیخا۔

"کہتی تھی پاکستان زندہ باد۔ بہت۔ بہت۔۔۔ مزا چکھا دوں گا۔ مزا چکھا
دوں گا۔"

کامریڈ موہن سنگھ کہتا ہے کہ میں نے موقع غنیمت جان کر بھرام سے کہا۔
"یار بل! میں جا کر اس مسلمان عورت سے بات کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کس طرح
بچے بند نہیں کہتی۔ اور فکر نہ کرو۔ میں اُسے رامنہ بھی کر لوں گا۔"

موہن سنگھ نے آنکھ ماری جس پر بھرام قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ سارے ہندو غنڈوں
نے موہن سنگھ کی بات کو پسند کیا۔ رام مورتی بولا۔

"بل جی! موہن سیدوں کو بھیج دو۔ ہڈیاں آدمی ہے۔ اس کی بات وہ مُسلی مان جائے
گی۔"

چنانچہ موہن سنگھ بھلی ساتھ والی کوٹھڑی کا تال کھول کر اندر آ گیا۔ اندر رفاق میں مٹی کا دیا
جل رہا تھا۔ اندر گوبر کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کونے میں ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر ایک لڑکی پڑی تھی۔
دیسے کی دھیمی روشنی میں موہن سنگھ نے دیکھا کہ اُس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے

تھے۔ بال یوں کھلے تھے جیسے کسی نے زبردستی نوپے ہوں۔ وہ بمشکل اٹھارہ سترہ برس کی زرد سی دہلی پٹی لڑکی تھی۔ موہن سنگھ اُس مسلمان لڑکی کے قریب گیا تو اُس نے تڑپ کر گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ مسلمان لڑکی کی آنکھوں میں خونخوار چیتے کی چمک تھی۔ اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اُس نے گرج کر کہا۔

”خبردار جو مجھے ماتھ لگایا۔“

موہن سنگھ بکلی کہتا ہے کہ میں نے ماتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”بیٹی! میں تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آیا۔ بلکہ میں تمہیں ان دہندوں سے بچانا چاہتا ہوں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تیرے لئے کیا کروں۔ وہ لوگ شرابی بن رہے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔ اگر میں نے تمہیں یہاں سے بھاگوا دیا تو وہ میرے ساتھ تمہاری بھی تکاوتی کر دیں گے۔ اور پھر اگر تو یہاں سے بھاگ کر نکل بھی تو کسی دوسرے ہندو غنڈے یا ہندو سپاہی کے ماتھ آجلے گی۔ مسلمان لڑکی نے جب موہن سنگھ کے منہ سے بیٹی کا لفظ سنا تو اسے ذرا حوصلہ ہوا۔ ایک پل کے لئے اُس نے موہن سنگھ کو غور سے دیکھا اور پھر اچانک لگے میں سے ایک موٹا سا تعویذ نکال کر اُسے دیتی ہوئی بولی۔

”میری یہ امانت اپنے پاس رکھ لیں اور کسی بھی مسلمان کو دے دیں۔ میرا نام رضیہ بانو ہے۔ میں ام اے اوگرلڑائی سکول میں دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ ہندوؤں نے میرے دونوں بھائیوں اور ابا جان اور امی جان کو میرے سامنے شہید کر دیا اور مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے ان ہندوؤں سے جا کر کہہ دیں کہ ایک مسلمان گھرانے کی لڑکی کو اپنی عزت جان سے بھی زیادہ ہی عزیز ہوتی ہے۔“

بقول موہن سنگھ بکلی اُس مسلمان لڑکی نے اچانک موہن سنگھ کی طرف ماتھ بڑھایا اور موٹا تعویذ اُسے دے کر چشم زدن میں موہن سنگھ کی کرپان نیام سے کھینچی اور دیکھتے دیکھتے اُسے اپنے دل میں اتار لیا۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ مسلمان لڑکی ایک لمبی سی سسکی بھر کر چارپائی پر گر پڑی۔ موہن سنگھ ایک پل کے لئے تو ہتھکڑیاں باندھ گیا۔ لڑکی کے سینے سے خون جاری تھا اور وہ تڑپ رہی تھی۔ پھر اُس نے شور مچا دیا۔ ساتھ والی کوٹھڑی سے سارے

ہندو غنڈے سے لڑکھڑاتے گرتے پڑتے اندر آئے اُس وقت تک وہ مسلمان لڑکی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ موہن سنگھ نے کہا۔

”اِس نے میری کرپان سے خودکشی کر لی۔ میں اسے سمجھا رہا تھا کہ اِس نے میری کرپان کھینچ کر دل میں گھونپ لی۔“

ہندو غنڈوں نے وحشی ہو کر بھرپور ماریں اور ہرام نے کہا۔

”مرگئی ہے تو مرنے دو۔ ہم کوئی دوسری لڑکی اٹھا لائیں گے۔ رام مورتی! چلو۔“

چلو یارو۔ کوئی دوسری عورت اٹھا لاتے ہیں۔ مٹلی نہیں تو ہندو عورت ہی سہی لا لیا۔“

اور وہ سارے شرابی شور مچاتے، بھڑکیں مارتے کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔ موہن سنگھ اُس مسلمان لڑکی کی لاش کے پاس اکیلا رہ گیا۔ بقول موہن سنگھ اُس لڑکی کی لاش کے چہرے پر ایک عجیب سکون اور ندر تھا۔ دینے کی دھیمی روشنی میں خون آلود کپڑوں میں اُس کا سفید چہرہ ایسے لگ رہا تھا جیسے گلاب کے پھولوں میں موتیے کا سفید گجرا پڑا ہو۔ موہن سنگھ بکلی کتنی ہی دیر رضیہ بانو کی لاش کے پاس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”کامریڈ! ایک مسلمان لڑکی اتنی غیرت مند بھی ہو سکتی ہے۔ یہ مجھے اب معلوم ہوا تھا۔ سچ کہتا ہوں۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اُس کا دیا ہوا تعویذ میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں کتنی ہی دیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ شہر کی جانب سے کبھی کیسی گولی چلنے کی آواز آجاتی تھی۔ پھر میں نے اُس بہادر مسلمان بچی کی لاش کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور باہر لے آیا۔“

ستیلامنڈروالے تالاب کے عقب میں کچا میدان ہے جو ذرا دور فتح شاہ بخاری رو اور حضرت شکر شاہ کے مزار تک چلا گیا ہے۔ یہاں کہیں کہیں لکیروں کے جھنڈ ہیں۔ موہن سنگھ بکلی نے انہی لکیروں کے ایک جھنڈ میں زمین میں گڑھا کھودا اور رضیہ بانو کی لاش کو دفن کر دیا۔ موہن سنگھ بکلی کہنے لگا۔

”کامریڈ! مجھے مسلمانوں کی طرح فاتحہ پڑھنا نہیں آتا تھا۔ لیکن میں نے ماتھ اٹھا کر اپنے رب سے کہا تھا کہ اے سب کے پالنے والا اِس غیرت مند مسلمان بچی کی اتنا کوشاں تھی

میرے والے کیا اور خشک سی آواز میں بولا۔
میں سیر میوں میں دم بخود بیٹھا تھا۔ مومن سنگھ بھل نے رضیہ بانو کی امانت وہ تعویذ

”کامریڈ! یہ بچی جہاں دفن ہے وہاں میں اس کی قبر نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے
ہندو اسے ڈھادیں گے۔ میں وہاں مسلمانوں کے رواج کے مطابق جمہرات کو دیا بھی نہ
جلا سکوں گا۔ اس پر پھول بھی نہ ڈال سکوں گا۔ لیکن کامریڈ! یقین کر میں جب تک زندہ رہا،
ہر جمہرات کو وہاں اگرا اپنے انسودوں کے پھول اپن کرتا رہوں گا۔ اچھا اب میں جاتا ہوں میں
تے اس بچی کی امانت تجھے دے دی ہے اب میرے دل سے بوجھ اتر گیا ہے۔ اس نے
کہا تھا کہ کسی مسلمان کو یہ تعویذ دے دینا۔ شہر میں کوئی مسلمان نہیں رہا تھا۔ میں نے سنا کہ
تمہارے محلے میں مسلمان ابھی ہیں۔ چنانچہ میں تمہارے پاس آگیا۔ میں نے اپنا فرم پورا کر دیا۔
میں جاتا ہوں۔ کو تو الی میں سپاہی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

اس کے ساتھ کامریڈ بھلی نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر دبایا اور دروازہ
کھول کر باہر نکل گیا۔ میں حیرت زدہ سا ہو کر رضیہ بانو شہید کا تعویذ ہاتھوں میں لئے سیر میوں میں بیٹھا
رہا۔ کامریڈ بھل کی باتیں ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اچانک بازار میں قاتر کی آواز
آئی۔ میں چونکا جلدی سے دروازے کو اندر سے تالا لگایا اور چوہارے میں آگیا۔ جنگے میں سے
نیچے جھانک کر دیکھا تو ایک فوجی ٹرک چوک میں کھڑا تھا اور سکھ ہندو فوجی چھلانگیں لگا کر نیچے
کو درہے تھے۔ میں چشم زدن میں سیر میاں اتر کر گلی میں آگیا اور محلے والوں کو ہندو فوجیوں کی
آمد خبر سنائی۔ اتنے میں ایک زوردار دھماکہ ہوا اور گلی کا آہنی دروازہ ایک طرف سے
جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی گلی میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور لوگوں نے گلی کی دوسری جانب لال
عریلی کی طرف بھاگنا شروع کر دیا پیچھے ایک اور دھماکہ ہوا۔ اب آہنی گیٹ ایک طرف سے
اڑ چکا تھا اور ہندو سکھ غنڈے تلواریں اور بلیں لئے اچھلتے کودتے شور مچاتے گلی میں آگئے
تھے۔ لیکن اس وقت گلی میں سولے ادھر ادھر کبھیرے ہوئے گھریلو سامان کے سوا اور کچھ
نہیں تھا۔ گلی کے سارے مسلمان لال حوٹلی اور گوجروں کے ویڑے میں سے گزر کر ہاتھی گراؤنڈ

کے ساتھ والی دیوار سے ہوتے شریف پورے والے مہاجر کیمپ کے قریب پہنچ چکے تھے
اور کیمپ میں متعن بلوچ رجمنٹ کے جوان اُن کے عقب میں کور فائرنگ کر رہے تھے
شریف پورے پہنچ کر میں ایک تھڑے پر بیٹھ گیا اور جیب میں سے رضیہ بانو شہید کے
تعویذ کو نکال کر دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا بوڑھا تعویذ تھا۔ میں نے اس کا ہن کھولا تو اندر بلوچی
رنگ کا خستہ سا کاغذ نکلا جس پر قلم اور سیاہ روشنائی سے پوری سورہ فاتحہ لکھی ہوئی تھی
میں نے اس مقدس امانت کو اپنی آنکھوں کے ساتھ لگایا اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔
میری آنکھوں میں فتح شاہ بخاری کے میدان والے لیکروں کا وہ جھنڈ پھر گیا جہاں اسلام کی
انک غیور بیٹی دفن تھی اور جس کی کوئی قبر نہ تھی۔ جہاں کبھی کوئی دیا نہیں جلے گا۔ جہاں کبھی کوئی
پھول نہیں ڈالے گا۔ لیکن رضیہ بانو کبھی نہیں مر سکتی۔ اس نے اپنی لاکھوں بہنوں، بھائیوں
اور بیٹوں کے خون سے اس باجھروت قلعے کی بنیادیں استوار کی ہیں جس کی چوٹی پر پاکستان کا
پرچم لہرا رہا ہے۔ زندہ باد! رضیہ بانو!

امرتسر کے دانشور

امرتسر میں جو مسلمان آباد تھے۔ یہ شہر ان کی وجہ سے علم و دانش کا گہوارہ تھا۔ پتنگ بازی، شعر بازی، کرکٹ میچ، دنگل، مشاعرے، ادبی مذاکرے اور علمی مناظرے، سیاسی ہنگامے اور دینی گرم جوشی یہ ساری گھاگہبی اور رستاخیزی ان امرتسری مسلمانوں کے دم قدم سے تھی جو امرتسری تہذیب، امرتسری کچر اور امرتسری ثقافت کے نقیب تھے۔ امرتسری تہذیب پر زیادہ اثر کشمیری کچر کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں آباد امرتسری گھرانوں میں آج بھی سبز چائے کے تواسر وہ امرتسر نہ رہا۔ امرتسر شہر کی محفل سے شمع اٹھ گئی اور بزم میں اندھیرا چھا گیا۔ بیس پچیس سال کی مدت میں امرتسر کے ہندو سکھ بڑی مشکل سے ایک پھل نام کا ہندو لوگ گویا ہی پیدا کر سکے۔ جس کی آواز زنانہ بے سُر کی ہے اور جس کا گائائش کر سر پیٹے کو جی چاہتا ہے۔ مسلمانوں کی ہجرت کے بعد امرتسر بیوہ ہو گیا۔ روح پاکستان میں آگئی۔ اور مردہ جسم امرتسر کے کلپنی بارغ میں پڑا رہ گیا۔

جب اس شہر کا سہل سلامت تھا تو یہاں بڑے بڑے نابغہ روزگار رہا کرتے تھے۔ جن میں سے کچھ تو پاک تان چلے آئے۔ کچھ وہیں امرتسر کی خاک میں سما گئے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے کہ جنہیں امرتسر کی مٹی نصیب نہ ہوئی۔ میں یہاں صرف ان اصحاب کا ذکر کروں گا جن سے میں ملا۔ جن کو میں نے قریب سے دیکھا اور جن کی مجلس میں بیٹھنے کی مجھے سعادت ملی۔ یہ لوگ علم و ادب کے سمندر تھے۔ لیکن دریافت نہیں ہوئے تھے۔ اپنے عہد کے سورج تھے۔ لیکن صبح کو ایک کنوئیں سے طلوع ہوتے تھے اور شام کو دوسرے کنوئیں میں غروب ہو جاتے تھے۔

حکیم فیروز الدین طغرانی بھی امرتسر کے ایک مہر تاباں تھے۔ ان کے بارے میں علامہ اقبال نے ایک محفل میں کہا تھا کہ طغرانی ایک ایسا کنواں ہے جس پر رہٹ نہیں لگ سکا۔ غسوس کہ میں نہ تو مسلم

امرتسر کے اس عظیم شاعر سے شرف ملاقات حاصل کر سکا اور نہ امرتسر میں وہ مکان ہی دیکھ سکا جہاں طغرانی صاحب رہا کرتے تھے۔ صوفی تبسم صاحب ان کے شاگردوں میں سے تھے اور مجھے اکثر پاک تان میں ان کی باتیں اور فارسی اشعار سنایا کرتے تھے۔ انہوں نے بڑی محنت سے طغرانی کا فارسی دیوان بھی چھاپا۔ مگر خدا جلنے پھر وہ کہاں غائب ہو گیا۔ اصل میں طغرانی صاحب جس محلے میں رہتے تھے۔ وہ ہمارے محلے سے بہت دور تھا۔ امرتسر کا کافی ماؤس اور ٹی ماؤس ہمارے محلے میں تھا ایک کا نام ترک ہوٹل تھا اور دوسرا محققا کامریڈ ہوٹل۔ مال بازار کے ایک بھلی بازار میں مارکیٹ حاکم سنگھ تھی۔ یہ دونوں ہوٹل اس تنگ سی گلی میں آئے سائے تھے۔ ہوٹل کیا تھے بس چائے خانے تھے۔ انگلیٹھینوں پر نیلی پہلی چٹکیں تھیں اور اندر لمبی میزیں اور پرانی کرسیاں اور پنچ۔

کامریڈ ہوٹل میں ایک معمر بزرگ اکثر گاکر حکیم طغرانی کے اشعار سنایا کرتے ان کا رنگ کالا تھا۔ بے حد دبے پتے تھے اور گاتے گاتے ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے جنہیں وہ سفید پگڑی کے پتوں سے پونچھ لیتے اور پھر چائے کی پیالی پر جبک جاتے اور گرم ہو جاتے۔ ہماری عمر چھوٹی تھی۔ اتنا شور نہیں تھا کہ طغرانی کی شاعرانہ عظمت کا ادراک کر سکتے اور ان کی مجلس کی طرف کھپے چلے جاتے۔ حکیم صاحب کے بارے میں صوفی تبسم بہت کچھ لکھ سکتے تھے اور میں نے ایک دو بار انہیں گزارش بھی کی تھی لیکن صوفی صاحب بے حد معروف انسان تھے۔ اب میرے خیال میں اگر لاہور میں کوئی شخصیت طغرانی کے بارے میں کچھ لکھ سکتی ہے تو وہ عرشی صاحب ہیں۔ میں ان سے شرف ملاقات حاصل، نہیں کر سکا لیکن غائبانہ ان کے تبرع علمی کا مداح ہوں۔ اگر انہوں نے بھی طغرانی صاحب پر کچھ نہ لکھا تو پھر شاید امرتسر کا یہ عظیم شاعر، مہر تاباں حکیم فیروز الدین طغرانی گمانی کے کنوئیں میں اتر کر وقت کے پاتال میں گم ہو جائے۔

حکیم طغرانی کی روایت عرتی اور بیدل کی روایت تھی لیکن اب میں امرتسر کی ایک ایسی شخصیت کا ذکر کرنے والا ہوں۔ جنہوں نے انشا اللہ خان انشا کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کا نام غلام احمد تھا اور آغا غلش کشمیری کے نام سے علم و شعر کی دنیا میں جانے جاتے۔ سرخ و سپید رنگ، دیوانہ قدر، مہر ابھرا جسم، ہٹلر ٹائپ کی مونچھیں، آواز تیز تھی۔ چہرے پر ہر وقت طنز یہ سی مسکراہٹ رہتی پیچھے سے کوئی آواز دیتا تو مڑ کر نہیں دیکھتے تھے۔ ساتھ والے سے پوچھتے۔ کون ہے پیچھے؟

چال میں بڑا ضبط تھا۔ چلتے وقت کوئی فالتو حرکت نہیں کرتے تھے۔ کسی وقت لگتا کہ دبے پاؤں چل رہے ہیں۔ زیادہ سلام و علیق کے عادی نہیں تھے۔ ہاتھ ملانے سے گریز کرتے تھے کامریڈ ہوٹل کے کونے میں اگر بیٹھ جاتے اور ارد گرد بیٹھے ہوؤں سے بے نیاز باہر سے آنے جانے والوں کو ٹنگلی باندھ کر دیکھا کرتے۔ چہرے پر وہی طنزیہ مسکراہٹ ہوتی جو چہرے کی ایک مستقل حالت بن چکی تھی۔ کوئی بات کرتا تو اس کا جواب باہر نکلتے ہوئے ہی دیتے سوال کرنے والے کی طرف بہت کم دیکھنا گوارہ کرتے۔ آنکھوں میں ایک چمک تھی جو کسی وقت دھندلی ہو جاتی بھنوں اور پلکیں گنجان تھیں۔ سوال آپ نے کیا ہے تو وہ جلاب میری طرف دیکھ کر دیتے مٹی، جون کی دوپہر میں وہ کمپنی باغ کی بجائے امرودوں کے باغ کی سیر کرنے نکل جاتے اور امرود کی ٹہنی ہاتھ میں تھامے واپس آتے کپڑے بڑے صاف ستھرے پہنتے۔

بہت کم بات کرتے تھے لیکن اگر کسی نے کہہ دیا کہ غالب بڑا شاعر ہے تو جب تک اسے جھوٹا ثابت نہ کر لیتے۔ دم نہیں لیتے تھے۔ غالب ہی کے اشعار کی ایسی ایسی تشریح کرتے کہ محفل میں بیٹھا ہر شخص سوچ میں پڑ جاتا کہ غالب نے یہ کیا کہہ دیا؟

اس کے ساتھ ہی عروض، قافیہ، منق، ہندسہ نجوم، ہنیت، طب، فلسفہ، شعر اور معقولات و منقولات کا سمندر بہنے لگا، علم و حکمت کے پیچیدہ سے پیچیدہ نکتے پر غلش کا شمیری گھنٹوں بولتے چلتے جاتے۔ لمبی سے لمبی اور مشکل سے مشکل بحر کی تقطیع آغا غلش کا شمیری ایک سیکنڈ میں کر دیتے ساتھ ہی علم عروض پر خیالات کا دھارا بہہ نکلتا۔ بات عروض سے چل کر علم موسیقی کے بحر و غار میں پہنچ جاتی۔ پھر فلسفہ، اخلاق اور طب اکبر موضوع بحث بن جاتے۔ غلش صاحب بے حد اوق اور فطرتی اردو میں بولتے جا رہے ہیں۔ کیا مجال ہے کہ چہرے پر ٹھنک کے اظہار نمایاں ہوں یا آواز میں کمزوری پیدا ہو جائے۔ خیال سے خیال نکل رہا ہے دلیل سے دلیل روشن ہو رہی ہے۔ ایک موضوع دوسرے موضوع میں جذب ہوتا جا رہا ہے۔ غلش صاحب کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ بالکل گلتا رہا آنکھوں میں جذب کی کیفیت آگئی ہے۔ شمع آغا غلش کا شمیری کے سامنے ہے اور علم کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ آج یہ روشنی ہمارے درمیان نہیں ہے مگر شمع ضرور جل رہی ہے اور اس کی روشنی ہماری زمین سے اگے نکل گئی ہے۔ علم کی شمع کبھی نہیں بجتی۔ علم کا سفر سات آسمانوں میں بھی جاری رہتا ہے۔

صوفی ترک ہوٹل میں بارانِ ادب کی محفل بھی تھی۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ کریون اسے اور بالنگ شو کے مگرٹوں کی ڈبیاں کھلی تھیں۔ نقالی میں بنارس پان سبے ہوئے تھے۔ آغا غلش کا شمیری حسبِ عادت خاموش بیٹھے ال مجلس سے بے نیاز ہوٹل میں آنے جانے والوں کو ٹنگلی باندھ کر رہے تھے کہ چانک پنجابی کے ایک شاعر داخل ہوئے جو دھوپی کا دھندلا کرتے تھے۔ غلش صاحب نے شاعر کو دیکھا تو اچانک پنجابی کا یہ بند پڑھنا شروع کر دیا۔

تھو دھوہیاں دیا سبجان اللہ
ایدھرون ستھے اودھر گھنڈ پئے گئی
تن میر روپتے دے چاول ائے
بہنچ سیر کی ائے کھنڈ پئے گئی
عیسیٰ پھر کے کجا ورتا دن لگا
جدھر کھنڈ کی اودھر ڈنڈ پئے گئی

یہ شعر آغا صاحب نے اس وقت برجستہ کہے تھے اور تخلص امرتسر کے ایک مشہور و معروف پنجابی شاعر نادم عیسیٰ کا دے دیا تھا یعنی ظاہر یہ کیا کہ یہ اشعار چاچا عیسیٰ نے دھوپی برادری کے خلاف کہے ہیں تو اردو شاعر نے غلش صاحب سے پوچھا۔

دوستادھی! ہم نے چاچا عیسیٰ کو کب اپنی شادی میں بلایا تھا۔؟
غلش صاحب بولے۔ بلایا ہوگا تو اس نے شعر کہے۔

تھوڑی دیر میں چاچا عیسیٰ بھی تشریف لے آئے۔ پس پھر کیا تھا۔ دونوں شاعروں کی وہ آپس میں جنگ ہوئی بحر بڑی مشکل سے نہج بچاؤ کرایا گیا۔ اس دوران آغا صاحب کے چہرے پر وہی مکی سی طنزیہ ہنسی رہی۔ ایک بار بھی کھل کھلا کر نہیں ہنستے۔

آغا غلش کا شمیری کو برجستہ اور فی البدیہ شعر کہنے میں کمال حاصل تھا پس مطلع کہنے کی دیر ہوتی۔ اس کے بعد شعر پر شعر ہو رہا ہے۔ قافیہ پر قافیہ بنتا چلا آ رہا ہے۔ قافیہ ختم ہو جاتے تو فوراً بتانا شروع کر دیتے شعر کی زمین ختم ہو جاتی تو پانی میں اتر جاتے اور وہاں سے بھی شعر نکال لاتے۔ پچاس پچاس، سو سو شعر ایک نشست میں کہہ جاتے۔ مشکل گوئی پر اتر آتے تو ایسی ایسی دقیق ترکیبیں اور عربی کے مشکل الفاظ استعمال

کرتے کہ سامعین منہ دیکھتے رہ جاتے۔ بجو، بزل اور استہزائیہ ایسی لکھتے کہ قاطب موڑ لگاتے۔ بیچ بیچ میں ہندی اور سنسکرت کے ایسے ایسے لفظ آتے کہ معلوم ہوتا آسمان سے پتھر گر رہے ہیں۔ کبھی کبھی کشمیری اور ہونہی زبانوں کے لفظ بھی استعمال کر جاتے۔ ان کی بجوں کر سید انشا اور مصحفی کے معرکے یاد آ جاتے تھے۔

آغا خلیش کا کشمیری امر ترس کے تھے لیکن ہماری ہوش میں ان کا قیام زیادہ تر بمبئی سے اکثر امر ترس آتے اور مہینہ مہینہ بھر یہاں رہتے اور صوفی ترک اور کامریڈ ہوٹل میں صبح سے رات گئے تک علم و ادب کی غفل گرم رہا کرتی۔ اپنے رسالے میں وہ کسی نہ کسی علمی ادبی شخصیت سے چھڑ چھاڑ جاری رکھتے تھے۔ ایک بار سیاب اکبر آبادی سے ایسا زبردست معرکہ ہوا کہ رات شعر و شاعری سے نکل کر پتھر اور دھات کے زمانے تک جا پہنچی۔ ضبط قریشی مقیم راولپنڈی آغا صاحب کے ہونہار اور قابل قدر شاگردوں میں سے ہیں۔ ایک بار میں ان کے ساتھ آغا صاحب کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہ بیٹھک میں صوفے پر بیٹھے برف کے ساتھ کچھ کھا رہے ہیں برف توڑ کر پیالے میں رکھی تھی اور بائیں ہاتھ میں دو کچے تھے۔ ہمارے استفسار پر آغا صاحب نے صوفے کی ساخت، برودت صوفے کے اخراج، اور اس کے مزاج پر ایک زوردار لکچر دیا۔ ایک بار کیلا چھلکے سمیت کھا گئے۔ کہنے لگے۔

”میرا مزاج دھوی ہے جو طبی اعتبار سے تمام مزاجوں کا بادشاہ ہے۔“

آغا خلیش کا کشمیری خود بھی امر ترس کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ایک بار میں نے ان کے سر پر تاج بھی دیکھا۔ یہ تاج روایتی بادشاہوں کا تاج نہیں تھا بلکہ بارہ سنگے کا سر تھا۔ الیگزینڈرہ پارک میں ایم اے او کلب اور ہندو جم خانہ کے درمیان بڑے معرکے کے کرکٹ میچ ہوا کرتے تھے خلیش صاحب نے اپنے محلے حسین پورے میں نوجوانوں کا ایک گروہ بنا رکھا تھا جس کا نام بھرتہ تھا۔ ایک بار الیگزینڈرہ پارک میں ایم اے او کلب اور ہندو جم خانہ کے درمیان کرکٹ میچ ہوا۔ حیدر نے ساٹھ رنز بنائیں تو انرول میں آغا خلیش کا کشمیری کا بھرتہ نمودار ہوا۔ آغا صاحب نے بارہ سنگے کا سر اپنے سر پر رکھا ہوا تھا، نوجوانوں کا گروہ پیچھے پیچھے تھا اور انہوں نے ساری گراؤنڈ کا چکر لگایا۔ وہ گارہے تھے۔

حیدر نے جو بہٹ لگائی

گیند جا پیا رہیڑے

بیچ جتن گے کیڑے ؟

بہر جتے والیو دستو

اور پھر سب اونچی آواز میں کہتے۔ ایم اے او، ایم اے او، شب برات کے موقع پر یہ بھرتہ اصلاح معاشرہ کا جلوس بھی نکالا کرتا تھا۔ جلوس کے نوجوان آغا صاحب کی قیادت میں ٹیچ کورس کے حصہ انگ میں یہ شعر گاتے گلیوں کا چکر لگاتے۔

آتا شا باشی نہ تو جالا

دولا تا پانی ناتو گودا

د آتش باشی نہ تو چلا۔ دولت اپنی نہ تو گنوا

حسینی پورے میں پہلا ریڈیو آغا خلیش کا کشمیری کے گھر آیا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم لگی تو محلے کے لوگ ان کی بیٹھک کے اندر اور باہر بیٹھ کر برین ریڈیو سنا کرتے تھے۔ جنگ کے دنوں میں ہی آغا صاحب بمبئی چلے گئے اور ہفتہ وار ”مصور“ کی ادارت سنبھال لی جسے مرتے دم تک نبھایا۔ پاکستان بن گیا۔ ایک بار نسبت روڈ پر ملاقات ہوئی تھی۔ ان کے شاگرد رشید ضبط قریشی میرے ساتھ تھے۔ خلیش صاحب کے بالوں میں سفیدی آنے لگی تھی۔ اس کے بعد پھر ان سے ملنا نہ ہوا۔ لوگوں کی زبانی سنا کہ بمبئی میں کسی عورت کو دل دے بیٹھے شادی کا دن بھی مقرر ہو گیا۔ آغا صاحب نے دلہن کے لئے عروسی جوڑا بھی تیار کر دیا لیکن خدا جانے پھر کیا ہوا کہ لڑکی نے شادی سے انکار کر دیا۔ آغا صاحب نے غصے میں اگر دلہن کا عروسی جوڑا زیب تن کیا۔ سونے کے سارے زیور پہنے اور بمبئی کے بازاروں کا چکر لگانا شروع کر دیا غالباً ۱۹۴۱ء کے آخر یا ۱۹۴۲ء کے شروع میں کسی اخبار میں چھوٹی سی خبر چھپی کہ بمبئی کے ایک خیراتی ہسپتال میں آغا خلیش کا کشمیری کا انتقال ہو گیا۔ جنازے میں فلم انڈسٹری کے دس بارہ افراد نے شرکت کی اور انہیں غلٹی سے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ سید انشاء اللہ خان انشاء کی روایت نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا۔

عینی تادم لفظانی گنجوی زندہ ہوتے تو ضرور مرثیہ کہتے لیکن وہ تو اس سے بھی پہلے امر ترس میں اس کیٹی بناتے ہوئے ہندوؤں کے محلے میں شہید ہو گئے تھے ان پر کسی نے مرثیہ نہ کہا۔

کیا بارغ و بہار شخصیت تھی چاچا عیسے کی بھی پنجابی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ان کی نعمتیں تو آج بھی نعت خوانوں کو از بریں صوفی ترک کے ہوٹل میں سبزہ کلاہ سر پر رکھے کرسی پر پاؤں رکھے اکڑوں بیٹھے پان چباتے ہوئے فکر سخن کیا کرتے۔ عید میلاد کے جلوس میں ہر چوک میں کرسی پر کھڑے ہو جاتے اور اپنی تازہ کبی ہوئی نعت تحت اللفظ سناتے۔ امر ترس میں تحریک پاکستان نے زور کھڑا تو ہندو مسلم فساد شروع

ہو گئے چچا عیسیٰ نے ایک امن کمیٹی بنائی جس میں ہندو بھی شریک تھے چچا اس کمیٹی کے صدر تھے۔ ایک روز تاروں والے باغ یا شاید بچے والا کھوہ کی طرف امن کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے گئے اور پھر واپس نہ آ سکے۔ بعد میں ایک شخص نے ان کی لاش ہندوؤں کے محلے میں ایک دکان کے پھٹے کے نیچے سڑک پر پڑی ہوئی دیکھی تو آکر بتایا کہ چچا عیسیٰ شہید ہو گئے ہیں۔

بابو غلام محمد بٹ، صوفی ہوٹل اور کامریڈ ہوٹل کی محفلوں کی جان تھے، درمیانہ قد، بھاری بدن، سر کے بال سیدھے پیچھے کو جاتے ہوئے، اکلوتا ہوا گندمی رنگ پر جوش انداز میں بات کرتے اور دل کھول کر قہقہہ لگاتے، کوئی نہ کوئی منطق، فلسفہ، تنقید کی ادبی کتاب ہمیشہ بغل میں ہوتی، شعر و ادب، فلسفہ، تنقید، منطق و جوش توانی کے علوم پر گفتگوں بحث کرتے اور کبھی نہ ٹھکتے۔ ہال بازار کی بغلی گلی میں ان کا قالینوں کا ایک چھوٹا سا کافاز تھا چار پانچ کھڑیاں لگی تھیں۔ خود بہترین نقاش تھے اور ایسے ایسے پیچیدہ فن تیار کرتے کہ بڑے بڑے کاریگر دنگ رہ جاتے۔ ایک بار روسی ترکستان سے ایک قالین کا ٹکڑا آیا۔ جس پر روسی ادیب گورکی کی تصویر بنی تھی بابو غلام محمد نے اس تصویر کو غور سے دیکھا اور کہنے لگے۔

”میں قائد اعظم کی تصویر والا قالین بناؤں گا اور روسیوں کو بھیجوں گا، تن بنانا یہ

ہم سے سیکھیں۔“

اور پھر انہوں نے روسی قالین کے تن کی کچھ ایسی دقیق قسم کی غلطیاں نکالیں کہ جنہیں ہم تو نہ سمجھ سکے لیکن ان کا منشی سن سن کر سر ہلا رہا تھا۔ بٹ صاحب نے اس روز تن پر کام شروع کر دیا اور دو مہینوں میں قالین کا ٹکڑا تیار کر دیا جس پر قائد اعظم کی تصویر بنی ہوئی تھی پھر یہ قالین روسی ترکستان بھجوا دیا وہاں سے تعویضی خط آیا تو بابو غلام محمد جیب میں ڈال کر ترک ہوٹل آ گئے وہاں دوستوں کی محفل لگی تھی بٹ صاحب نے خط نکال کر میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔

قائد اعظم نے اپنا لوازمیوں سے بھی منوالیا۔ اسے پڑھو۔

سگریٹ بٹ صاحب ہمیشہ مٹھی میں دبا کر پیتے تھے۔ چائے کے رسیا تھے اور مطالعہ کرتے وقت چائے اور سگریٹ ساتھ ساتھ پیتے جلتے تھے شروع شروع میں بیگل کے جہلیاتی فلسفے سے بہت متاثر تھے۔ جہلیات کا لفظ ان میں کئی بار استعمال کرتے۔ ان کے کارخانے کے کشمیری کاریگروں کو مہینے کی سات تاریخ کو تنخواہ ملتی تھی اس روز سارے کاریگروں کو مہینے کی سات تاریخ کو تنخواہ

ملتی تھی اس روز سارے کاریگر جوا کھیلنے بیٹھ جاتے۔ جیتنے والے سینا دیکھنے چلے جاتے اور جو ہار جاتے وہ منہ لٹکائے بٹ صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک بارے ہوئے کاریگر نے اگر ان سے ایڈوانس مانگنے آجاتے ایک بار میں بٹ صاحب کے پاس ایڈوانس مانگا تو بابو غلام نے بند مٹھی میں سے سگریٹ کا زور دار کش کھینچ کر لیا۔

تم لوگوں کا جہلیاتی نظام برباد ہو گیا ہے۔“

سگریٹ کی راگ ہمیشہ چنگی مار کر گراتے، ایسا کرتے ہوئے سگریٹ والی بند مٹھی کو نصف دائرے میں گھماتے دوستوں میں دل کھول کر خرچ کرتے، چائے کی جس محفل میں بابو غلام محمد بٹ بیٹھے ہوتے وہاں چائے، پان اور سگریٹوں کا سلسلہ کبھی نہ ٹوٹتا، ان کے تبحر علمی کا تمام احباب کو بڑا احترام تھا۔ جذباتی بھی بہت تھے۔ بحث کے دوران کبھی کبھی غصے میں بھی آجاتے اور چہرہ سرخ ہو جاتا قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے، طبیعت میں خوداری تھی لاکھوں کا کاروبار چھوڑ کر آئے تھے لیکن یہاں کسی کا زیر باد ہونا گوارا نہ کیا۔ بخارا پتیس میں کچھ دیر کام کیا۔ پھر کراچی سے ایک ادبی ماہنامہ ”ادب“ کے نام سے نکالا۔ مجھے خط لکھ کر ایک مزاحیہ مضمون ”قبر سے ایک خط“ منگوا یا۔ یہ پرچہ بھی نہ چل سکا، جب کبھی لاہور آتے تو ان سے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی، پھر ایک روز سنا کہ بابو غلام محمد بٹ کراچی میں انتقال ہو گیا، یقین نہ آیا کہ وہ زندگی اور علم و حکمت سے بھرپور شخصیت کراچی کے قبرستان میں دفن ہو گئی ہے۔ جو شمعیں امرتسر کے دبستان میں روشن ہوئی تھیں وہ ایک ایک کر کے پاکستان میں اگر بجھتی چلی جا رہی ہیں، وہ گلاب جنہیں امرتسر کی ٹھنڈی کھوٹی کے پانی نے تروتازگی اور شادابی بخشی تھی یہاں اگر مرجھاتے چلے گئے، آج وہ پھول نظر نہیں آتے، کبھی کبھی تنہائی شب کے دیران جھونکوں کے ساتھ ان کی خوشبو آ جاتی ہے۔ یادوں کی اندھیری رات میں ایک جگنو سا چمک کر بجھ جاتا ہے، کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ پھولوں سے بھرا ہوا گلدان میز پر رکھ کر بیالیوں میں گولڈن چائے ڈالوں اور پھر کچھڑے ہوئے امرتسر کے ان تمام دانشوروں کو اپنے سامنے بٹھا کر چائے کی پیالی پیش کروں اور سگریٹ سگا کر کہوں۔

اے پیارے لوگو! تم دور کیوں ہو؟

میرے ساتھ دو آنے والی تھر ڈکاس میں بچہ پر بیٹھا ہوا ماسٹر نثار جھومنے لگا۔ باہر نکل کر اس نے کہا: "میں ذرا اپنے گانے کو پکا کروں پھر ہم دونوں لکھتے جا کر میڈن تھیٹر والوں کی فلم کمپنی میں کام شروع کر دیں گے۔"

ماسٹر نثار کو "لیلا جھون" "راجہ ہرچندر" "جلتی نشانی" "دوب بخت" "دھوپ چھاؤں" "اتاقہ اشرف" "حاکم طانی" اور نقش سیما کی فلموں کے کئی گیت زبانی مع طرزوں کے یاد تھے۔ اس نے یہ سارے گانے سارے گیت ایک کاپی میں نقل کر رکھے تھے جس کے باہر موٹے قلم سے لکھا تھا: "ماسٹر نثار امرتسری عرف شیر دل۔"

ماسٹر نثار ڈھولک بہت اچھی بجالیتا تھا۔ یہ فن اس نے کلیر شریف کے عرس پر ایک استاد سے سیکھا تھا۔ جو ایک بھیڑے کے پیچھے ڈھولک بجایا کرتا تھا۔ ڈھولک وہ اس انہماک سے بجاتا کہ اس کی زرد آنکھیں بند ہوتیں۔ پتل گردن پر تر بوزلیا سر جھول رہا ہوتا اور دبلد بدن یوں دائیں بائیں پیچ و خم کھا رہا ہوتا گویا کوئی اسے گدگدی کر رہا ہو، ساتھ ہی وہ گاتا بھی۔ اس کی آواز بہت برقی تھی، اسے راگ داری سے بھی کوئی واقفیت نہ تھی مگر وہ درو میں ڈوب کر گاتا تھا۔ جب وہ ناک سے سانس لیتا تو ایک سیٹی سی بج اٹھتی۔ ذرا کی ذرا اپنی آنکھیں کھول کر ماسٹر نثار چھت کی طرف دیکھتا اور آنکھیں بند کر کے گردن ایک طرف ڈھلکا کر مصرع اٹھاتا۔

راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا

وہ گانے میں غفلتوں کو بگاڑ دیا کرتا تھا۔ مثلاً مجھے اچھی طرح یاد ہے، بلکہ اس وقت بھی جب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں تو میرے کانوں میں اس کے گانوں کی آواز گونج رہی ہے وہ: راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا۔ میں "زمانہ کو ہمیشہ" زمانہ نا، کہا کرتا تھا۔

راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا

اس کے علاوہ اس کی عادت تھی کہ وہ گاتے ہوئے ہر شعر یا گیت کے آخری لفظ کے ساتھ "ہوم" ضرور لگا دیا کرتا تھا۔ اسے شاہو مودک کی فلم "آوارہ گرد راج کمار" کا یہ گانا بہت پسند تھا۔

بے کس ہوں مجبور ہوں میں جان سے لاچار ہوں

اس کو وہ یوں گایا کرتا۔

بے کس ہوں مجبور ہوں میں ہوم جان سے لاچار ہوں ہوم
کبھی کبھی وہ گانے کے شروع میں بھی ہوم لگا دیا کرتا تھا۔

ہوم آٹھ حاتم کیوں سویا نادان ہوم اللہ بندے رب کو پہچان ہوم
کبھی کبھی جب وہ ماسٹر نثار ایسا ایک مرتبہ سننے کی وجہ سے بڑا اداس ہوتا تو وہ پاسنگ شو مگر سٹ کا لمبا کش لے کر اور ناک سے سیٹی بج کر دعوان نکالتا اور ڈھولک گھٹنوں میں دبا کر اسے کہتے ہوئے کہتا: "میدے باؤ! کبھی اپنے بھی دن ضرور پھرے گے۔"

پھر ابستہ ابستہ ڈھولک بجانے اور گانے میں مگن رہتا۔ وہ دنیا کے جھنجھٹوں سے بے فکر ہو کر گرا ہوتا کہ باہر سے اس کے والد امام دین حجام کی آواز آتی: "اوسے تان سین دیا پترا۔ بس کرہٹی تے نہیں جاناں؟"

ماسٹر نثار فوراً ڈھولک سے ہاتھ کھینچ لیتا اور آنکھیں کھول کر بلند آواز میں جواب دیتا: "میاں جی۔"

وہ اپنے باپ کا بڑا ادب کرتا تھا جس طرح اس زمانے میں سب بچے اپنے ماں باپ کا ادب کیا کرتے تھے۔ حالانکہ اس زمانے کے باپ اپنے بچوں سے آج کل کے باپوں کی طرح لاڈ پیار نہیں کیا کرتے تھے الٹا مارا پیٹا کرتے تھے۔ ماسٹر نثار کا والد حجام تھا۔ بھرا بھرا گول چہرہ۔ سفید ڈارھی سر کے سفید بال۔ جن پر وہ ہندی لگا کر پیل کے پتے باندھا کرتا تھا۔ زیادہ جھنگ پینے کی وجہ سے اس کے چہرے کی رنگت سبز کی مال پھکی پڑ گئی تھی۔ میری حجامت بناتے وقت وہ بوسیت پر بیٹھا میرا سر اپنے گھٹنوں میں دبا لیتا اور مشین سے خشمخشی کرنے کے بعد سر پر جب آم کی گٹھلی پھرتا تو مجھے بوسیت پر تار بے چمکتے نظر آتے۔ ماسٹر نثار نے والد کا پیشہ اختیار کرنے کی بجائے ترکھانہ کام کو ترجیح دی تھی۔ چنانچہ وہ حاجی اللہ دتا ترکھان کی دکان پر کام سیکھا کرتا تھا یہ حاجی اللہ دتا ترکھان بھی ایک طرف بزرگ تھا۔ وہ فر بوزے کی بھانگ بھجوں اور چھلکے سمیت کھایا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں فر بوزے کی اصل اور مفید شے تو اس کے بیج اور چھلکا ہوتا ہے یہ گو دا تو قدرت نے یونہی ساتھ لگا رکھا ہے۔

کبھی کبھی میں حاجی صاحب کی دکان پر ماسٹر نثار کو ملنے جایا کرتا۔ دکان میں کئی موٹی لکڑیوں کی گلی گلی خوشبو پھیلی ہوتی اور ماسٹر نثار ایک طرف بور پیٹے پر تیشہ لیے بیٹھا لکڑیوں کے تختے چھیل رہا ہوتا۔ بازار میں سے گزرتے تھنڈ کی لکڑیوں سے لدے ہوئے گڈے گزرتے تو میں انکو بچا کر ایک ڈنڈا کھینچ لیتا۔ ماسٹر نثار اس کا بڑا خوبصورت گلی ڈنڈا گھڑ دیتا اور ہم گرمیوں کی شکر دوپہروں میں انجمن پارک یا لیگز نڈل گراؤنڈ میں جا کر گلی ڈنڈا کھیل کرتے۔

جمعے کے روز ہم ڈھلے ہوئے کپڑے پہن کر مسجد خیر الدین ہال بازار میں جا کر جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ میرا لباس عام طور پر سفید ٹاسے کی قمیض، کلکتے کی چارخانہ دار دھوتی اور سلیمپر پر مشتمل ہوتا لیکن ماسٹر نثار کی سچ دھج تنواری ہوتی تھی۔ وہ چاند خاں پنواڑی کے آیتنے کے سامنے کھڑے ہو کر دیر تک گنگھی سے تیل میں چمکے بال سنوارتا اور لٹھے کی کھڑکھڑ کرتی شلوار کے بل درست کرتا رہتا اور پھر یوں سنبھل سنبھل کر میرے ساتھ چلتا، گویا تنی ہوئی رسی پر چل رہا ہو۔ مسجد میں جا کر ہم حوض کے کنارے بیٹھ کر وضو کم کرتے اور حوض میں تیرتی سرخ مچھلیاں کو زیادہ دیکھا کرتے۔ انگریزی کا ایک لفظ وہ بہت بولا کرتا تھا۔ یہ لفظ تھا۔

ماسٹر نثار دو میں اس کو "نیورین" بولا کرتا تھا۔ ایک بار بے گوجر کی دکان میں ماسٹر نثار میرے ساتھ بیٹھا بے گوجر کو ہیر سنار ہاتھاکہ لگی میں سے ہلی مرانی کا گزر ہوا۔ وہ دکان کے سامنے رک گیا۔ کچھ دیر گردن جھکا کر ہیر سنار ہا۔ پھر سر اٹھا کر بولا "پترا راگ داری کا علیہ خراب نہ کرو۔ تم راگ داری کے لئے پیدا نہیں ہوئے۔ بس لوگوں کے سرمونڈا کرو۔"

جلی مردی اتنا کہہ کر چل دیا۔ بے گوجر کو اور مجھے اس کی یہ بات بڑی بُری لگی۔ بسا گوجر کھونچہ اٹھا کر ضلی مرانی کے پیچھے بھاگنے لگا تو ماسٹر نثار نے اس کا بازو تھام کر کہا "پہلوان! نیورین۔"

ماسٹر نثار کو تھیر میں پارٹ کرنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے اس نے ایک صندوقی میں نقلی مونچھیں، نقلی ڈاڑھی، سرنخی پاؤڈر، گتے کا شاہی تاج جس پر تارے لگے تھے اور مور کا پنکھ جڑا تھا۔ نقلی موتیوں کے مار وغیرہ جمع کر رکھے تھے۔ ہم دونوں کبھی کبھی اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں بچوں کو جمع کر کے ہیر رانجھے اور سوہنی ہنہنڈال کا ٹانگ کھیل کرتے تھے۔

لہنگے اور دوپٹے ہم اپنے اپنے گھروں سے چوری چھپے صندوق کھول کر نکال لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ شہر میں سنو کھ سر کی گراؤنڈ میں ایک تھیریکل کمپنی اتری جس نے شکشا کا کھیل کھیل۔ میں اور

ماسٹر نثار بڑے شوق سے یہ کھیل دیکھنے گئے۔ ٹکٹ کے لیے ہمارے پاس پیسے نہیں تھے چنانچہ ہم سوڑے کے ایک درخت پر چڑھ کر انڈر پنڈال میں کود گئے اور ایک طرف قاتلوں کے پاس دیک کر بیٹھے کھیل دیکھتے رہے۔ اگلے روز ہم نے وہی کھیل اپنی ڈیوڑھی میں کھیل لیا۔ صبح ہی سے ہم نے کاپیوں میں سے کاغذ بھاڑ کر اور قلم و دوات سے جلی حروف میں "شکشا" کے اشنہ مار لکھ کر مکانوں کی دیواروں پر چسپاں کر دیئے تھے۔ شام کو ہم نے ڈیوڑھی میں تخت پوش بچہ اکر شیج بنایا۔ بانس جوڑ کر گے پردہ گرا دیا۔ محلے کے بچے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ماسٹر نثار راجہ دھشتت بنا اور میں اس کا وزیر۔ ہم نے بیڑھیوں میں بیٹھ کر چہروں پر نقلی مونچھیں لگائیں۔ خوب سرنخی پاؤڈر تھوپا۔ ماسٹر نثار نے سر پر مور کے پنکھ والا گتے کا تاج رکھ لیا۔ میں نے اپنی بڑی بہن کا دوپٹہ سر پر پکڑی کی طرح باندھ لیا۔ ہمارے ایک دوست نے شیج پر آکر پردہ ہٹا دیا۔ اور شکشا کا کھیل شروع ہو گیا۔ ماسٹر نثار دھشتت کے روپ میں تیر مکان لئے جنگل میں کھڑا تھا اور میں وزیر بنا ہاتھ باندھ سر جھکائے ساتھ کھڑا اُسے کہہ رہا تھا "ہمارا ج! ہرن اسی جنگل میں گیا ہے۔"

ماسٹر نثار گردن کر بولا "مگر کہاں ہے ہرن؟ کہاں ہے ہرن؟ اگر ہرن نہ ملا تو ہم تیری گردن کاٹ کر رکھ دیں گے۔"

میں نے ایک طرح آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا، وہ رہا ہرن مہاراج! جس طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔ وہ ڈیوڑھی کا دروازہ تھا جس کا نصف پٹ کھلا تھا۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ ماسٹر نثار نے فوراً مکان کے ساتھ تیر جوڑ کر چلا دیا۔ تیر بچوں کے سروں کے اوپر سے کن سے ہو کر گزرا اور ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر سیدھا بے گوجر کو لگا جو شراب کے نشے میں دھت سامنے والے مکان کی دیوار کے پاس پیشاب کر رہا تھا۔ وہ چیخ مار کر گر پڑا۔ میں نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ میں نے ماسٹر نثار کو کا پتی ہوئی آواز میں کہا "ماسٹر تیر بے گوجر کے لگ گیا ہے بھاگ چلو۔"

ماسٹر نثار نے گردن اکڑائی اور مونچھوں پر ہاتھ پھر کر بولا "نیورین۔"

محلے میں ایک دم شور برپا ہو گیا۔ ڈیوڑھی میں بھگدڑ مچ گئی اور ہم دونوں بھاگ کر حاجی اللہ داتا رکھان کے گھر میں جا کر چھپ گئے جو اُس وقت تنور کی روٹی کے ساتھ خربوزے مع

بیج اور چھلکوں کے کھارنا تھا۔ اُس نے چونک کر کہا: "اُوئے کی فرود چا کے اُوئے ادا دئے۔"
 ماسٹر نشار نے کہا: "استاد جی، ہمیں بسا گوہر مارتا ہے۔"

"اُوئے کیوں مارتا ہے بسا؟"

"کہتا ہے مجھے کہنی باغ کی ٹھنڈی کھوئی سے پانی لادو۔ بھلا استاد جی شام کو ہم وہاں کیسے جاسکتے ہیں۔"

"بسا گوہر شودائی ہو گیا ہے۔ تم آرام سے بیٹھ جاؤ یہاں۔"

عید میلاد النبی کے جلوس میں ہم نے ایک ایک سبز جھنڈا اٹھام رکھا ہوتا۔ اور ہماری سیپی، کوشش ہوتی کہ جلوس ہمارے محلے سے ہو کر ضرور گزرے۔ اور پھر جلوس جب ہمارے محلے سے ہو کر گزرتا تو ہم بڑے فخر کے ساتھ کنکھیوں سے اپنی گلی کے بچوں کو دیکھتے جو دکانوں کے پھٹوں پر کھڑے رشک سے ہمیں تک رہے ہوتے۔ کترہ وہاں سنگھ سے سکتری باغ تک دھوپ میں جلوس کے ساتھ چلتے چلتے ہمارے چہرے سرخ ہو کر پسینے میں شرابور ہو جاتے لیکن ہمیں بھی تھکان یا گرمی کا احساس نہ ہوتا تھا۔

کہنی باغ میں ٹھنڈی کھوئی کے سامنے والی گراؤنڈ میں ایک بڑا گنجان درخت تھا جس کی پھلی ہوئی شاخیں زمین کو چھوتی تھیں۔ میں اور ماسٹر نشار گلی کے ٹوکوں کے ساتھ یہاں جھٹ براہمن کھیلا کرتے تھے۔ میں ٹارزن کی طرح ایک ٹہنی کو پکڑ کر چھلانگ لگاتا اور جھولتا ہوا زنانے کے ساتھ دوسری ٹہنی پر جا پہنچتا۔ ماسٹر نشار ٹہنیوں کے بیچ کسی دو شانے پر بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھ جاتا اور پھر راہ اندر کی طرح گردن اکڑا کر ایک دم پکارا اٹھتا۔ یہ آج میرا تخت کیوں بل رہا ہے؟ پھر خود ہی مصاحب بن کر ادب سے گردن جھکا کر کہتا: "حضور آپ کا شاہی تخت جنوں کی گردنوں پر رکھا ہے جو آپ کو سبز پری کے محل کی طرف سے جا رہے ہیں۔"

ماسٹر نشار راہ اندر کے روپ میں مسکرتا اور پھر ایک ہاتھ اٹھا کر گانا شروع کر دیا۔

ہاؤم۔ راہ ہوں میں قوم کا اندر میرا نام۔ ہاؤم

سبز پری پر عاشق ہوں میں عشق ہے میرا کام ہاؤم

برسات کے دنوں میں ہم دو موہنی نہر کے کنارے کنارے لمبی سیر کرتے۔ لبالب نہر

میں تیرتے ہوئے سبز، زرد، سرخ، انمول اور امرودوں کو چھلانگیں لگا کر پکڑتے، نہر کی پلایا پر کھڑے ہو کر مٹھیاں چوم کر پانی میں کود جاتے اور مردہ تاری لگایا کرتے۔ کبھی غوطہ لگا کر نہر کی تہ سے مٹھی بھر گیلی ریت اٹھا کر لاتے اور اُس سے اپنے دانت مانجھتے کیونکہ ہم نے بڑوں کو یہی کرتے دیکھا تھا۔

جنوری فروری کی سردی میں جب باغ اُجڑ جاتے تو ہم امرود کے باغوں میں نکل جاتے اور درختوں پر لگے اکوٹے امرود توڑ توڑ کر اُدھا کھاتے اور اُدھا پھینک دیتے۔ بارش شروع ہو جاتی تو ہم ٹاہلیوں کے گرتے پتوں میں پھیلتے گھر واپس آ جاتے۔

بھلا خیال تھا کہ ہم اسی کہنی باغ کے درختوں پر کھیلتے۔ پلایا پر سے نہروں میں چھلانگیں لگاتے اور ڈیوڑھی میں سرخی پاؤں تھوپے "شگنڈا" کھیلتے رہیں گے اور وقت کبھی نہیں گزرے گا۔ لیکن وقت گزرتا چلا گیا، اور پھر وقت جب ایک اہم موڑ پر سے گزرا تو ہم سے امرتسر کہنی باغ، مال بازار سکتری باغ، بجلی والی نہر اور مسجد خیر الدین ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔ جب ہم کہنی باغ کی نہروں میں چھلانگیں لگاتے پھر رہے تھے اور ماسٹر نشار آنکھیں بند رکھے ڈھولک بجاتے ہوئے لیلے مجنوں کے گانے گارہا تھا۔ اُس وقت برصغیر پاک و ہند کے مسلمان یٹڈ مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت پاکستان کے لئے جدوجہد کر رہے تھے جہاں مسلمان عزت و بڑی زندگی بسر کر سکیں ہمیں معلوم ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ایک روز جو ہم نہر سے ڈبکی لگا کر نکلے تو امرتسر میں چاروں طرف گولیاں چل رہی تھیں۔ اُگ لگی تھی، ہم پھٹ رہے تھے۔ دھواں ہی دھواں تھا۔ لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ اُگ ہی اُگ تھی۔ لبالب بھری ہوئی ٹھنڈے پانیوں کی نہریں سوکھ گئی تھیں۔ باغ اُجڑ گئے تھے۔ ٹھنڈی کھوئی کے پانی میں انسانوں کا گرم خون اُن ملا تھا۔ مسجدوں کے حوض خشک ہو گئے تھے۔ ہم نے امرتسر چھوڑ دیا۔ امرتسر نے ہمیں چھوڑ دیا۔

خستہ حال زخمی، بیمار، نیم جاں مہاجرین کے لئے پتے قافلے لاہور کی سرحدوں میں داخل ہو رہے تھے ہر طرف ایک افراتفری، ہیجان اور پریشانی کی فضا طاری تھی۔ بہن بھائی سے، ماں بیٹے سے، بیٹا باپ سے اور خاوند بیوی سے بچھڑ گیا تھا۔ لاہور سٹیشن پر کٹی ہوئی گاڑیاں چلی آرہی تھیں وقت گزرتا چلا گیا ماسٹر نشار سے نہ مل سکا۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی گاؤں کی طرف نکل گئے ہیں۔

پاکستان کو معرین وجود میں آئے۔ دس گیارہ برس گزر گئے۔ ایک روز میں انارکلی بازار سے گزر رہا تھا کہ میں نے بانو بازار کے کونے پر ایک دکان کے باہر ماسٹر نثار کو سڑک پر بیٹھے ایک الماری کو مرمت کرتے دیکھا۔ اُس کے بال سفید ہو گئے تھے۔ چہرہ سوکھ کر سیاہ ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی گئی تھیں۔ کپڑے میلے، بوسیدہ اور پیوند لگے تھے۔ وہ برے سے تختے میں سوراخ ڈال رہا تھا۔ اور اُس کے سفید بالوں میں لکڑی کا بورا پڑا تھا میں چپکے سے اُس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی زرد ویران آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور پھر وہ میرے گلے لگ گیا اور ہلکے ہلکے سکیاں بھرنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا "ماسٹر نثار! یہ کیا حال بنا لیا تم نے اپنا؟"

ماسٹر نثار میلی قمیض سے آنکھیں پونچھ کر دھیرے سے مسکرایا اور خشک آواز میں بولا:

باڈحمید! نیورمین!

امرتسر کی میاں پوترو

امرتسر کی ایک سردرات۔ کمپنی باغ کے درخت۔ جنوری کی دھند میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایک گہرا آلود غاموشی ہے جو سنانا شہر کے گلی کوچوں میں اتر آئی ہے۔ ابھی شہر میں بجلی نہیں آئی۔ لمپوں کی روشنی کہیں کہیں سردی میں ٹھہر رہی ہے۔ آسمان پر ستارے سفید برف کے شفاف ٹکڑوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ روڑاں والی مسجد کے والان کی گلابی سلیس ریخ ہو رہی ہیں۔ امرتسر کے بچے، بوڑھے، جوان، گرم کافوں میں دبکے گہری نیند سو رہے ہیں۔ مکانوں کے کواڑ بند ہیں۔ گھروں کی منڈیریں، مٹیاں، بکتوں کی کابکین، ٹین کے چھتر، ریل کی پٹریاں اور بھائیاں والے باغ میں امردوں کے اجڑے ہوئے درخت اوس میں بھیگ رہے ہیں۔

آدھی رات گزر گئی ہے۔ ٹھہرتی رات شہر کے ہونٹوں پر اپنا بروت آلود ہاتھ رکھ کر خوب میں کھو گئی ہے۔ بازار بکرواناں کے ایک دو منزلہ مکان میں دیٹے کی لومدھم ہو رہی ہے۔ چھ سات برس کی ایک بچی لحاف اوڑھے سو رہی ہے۔ ساتھ والی چار بانی پر ایک عورت لحاف کے اندر کانگری لے لے دم بخود بیٹھی ہے۔ فیروزی شال میں لپٹا اس کا چہرہ ساکت ہے۔ کان کسی آواز پر لگے ہیں۔ یہ آواز اس نے ابھی ابھی سنی تھی۔ ادھیڑ عمر کی یہ سرنج و سپید عورت لحاف کے اندر کانگری لے لے سو رہی تھی کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کی چار بانی کو ہلایا ہو۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ اور پھر اس نے ایک آواز سنی۔ ڈراؤنی، رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز، جسے سن کر امرتسر پتھر ہو جاتا تھا۔ جس کی دہشت نے ایک طویل عرصے تک امرتسر کی سنانا راتوں کو آسیب زدہ بنائے رکھا۔ یہ آواز دور سے آتی سنائی دیتی تھی اور کسی عورت کی آواز تھی۔ زمین کی گہرائیوں سے نکل کر ساکت آسمان کی دستوں میں گم ہوتی ہوئی ایک کرب انگیز چیخ کی آواز۔ اس میں کتنی آواز کے ساتھ دو

الفاظ بڑے صاف سنائی دیتے تھے۔ کشمیری زبان کے دو الفاظ ہیں۔

میان پوترو — میان پوترو

یعنی میرے بچو — میرے بچو!

ان الفاظ کی کانپتی ہوئی بازگشت نے شہر کی سرد ویران رات کو اور زیادہ ہیبت ناک بنا دیا تھا۔ جیسے کوئی عورت بال کھولے قبرستان کی قبروں میں ماتم کرتی چلی آ رہی ہو۔

نیچے گلی میں موت کا سناٹا ہے۔ لحد کی خاموشی ہے۔ وہ عورت سانس روکے چارپائی پر بیٹھی ہے اس کے دونوں ہاتھ لٹاف کے اندر کانگری پر جے ہوئے ہیں۔ طاق میں دیا گل رہا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ آواز پھر سنائی دے گی۔ اور وہی سرگ آواز ماتی آواز پھر بلند ہوتی ہے۔ آواز اس بار بھی دوسرے آئی تھی شاید صحرے کے تالاب یا چٹا کنڑ کی جانب سے۔ عورت کانگری لٹاف کے اندر سے نکال کر چارپائی کے ساتھ فرش پر رکھ دیتی ہے۔ اور طاق میں جلتا دیا پھٹک مار کر بجاتی ہے۔ دھوانے۔ اور گلی والی کھڑکی کی کھڑکی چڑھا کر بچی کو اپنے ساتھ لگا کر لٹاف اوپر کر لیتی ہے۔ وہ گھر میں اکیلے ہے۔ کمرے میں اندھیرا ہے۔ کانگری کی راکھ میں دبے ہوئے انگارے دھیمی چمک دینے لگے ہیں۔ اس کا غم کشمیری شالیں خریدنے سری لگر گیا ہوا ہے۔ یہ بچی اس عورت کے مرحوم بھائی کی نشانی ہے۔ بچی کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ اندھیرے میں ڈر کر پھوپھی سے کہتی ہے۔

آپنی۔؟

عورت کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔

دشمنی۔؟

بچی ہم کر اپنی پھوپھی کے ساتھ لگ جاتی ہے عورت کی آنکھیں اندھیرے میں پوری کھلی ہیں جیسے وہ اس بھیاٹک آسیبی آواز کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس کے کان گلی کی سسنان خاموشی پر لگے ہیں اور پھر اچانک وہی آواز ایک بار پھر سنائی دیتی ہے۔ عورت کا دل اچھل کر اس کے حلق کے قریب آجاتا ہے۔ پہلے وہ آواز شہر کے دوسرے کنارے سے آئی تھی اور اب۔ اب وہ آواز گلی میں بلند ہوتی تھی جیسے کسی عورت نے گلی میں مکان کے بند دروازے کے ساتھ منہ لگا کر چیخ ماری ہو۔

میان پوترو — تو رہے لگن!

دھیرے بچو! سردی لگتی ہے!

بچی کو سینے سے لگائے وہ عورت لٹاف میں لیٹی برف کی ماتہ منجمد ہو جاتی ہے۔ خوف اور ہیبت سے اسے پسینہ آگیا ہے۔ وہی ڈراؤنی آواز گلی میں ایک بار پھر بلند ہوتی ہے۔ اب وہ عورت ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھتی ہے۔ خوف سے کانپتی ہوئی بچی کو لٹاف کے اندر دبا کر کانگری اٹھاتی ہے۔ کھڑکی کے پاس آکر کانگری اترتی ہے اور کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر کانگری کی آگ گلی میں الٹ دیتی ہے اور تیزی سے کھڑکی کو کانگری لگا کر لٹاف میں آکر بچی کو سینے سے لگا لیتی ہے۔ سُرخ انگارے گلی میں گرتے ہیں تو کسی عورت کی بھیاٹک چٹخیں بلند ہوتی ہیں اور پھر یہ چٹخیں گلی سے نکل کر شہر کی سسنان فضاؤں میں بہت دُور چلی جاتی ہیں پھر شہر کے دوسرے کنارے پر جا کر ان چٹخوں کی دہشتناک آوازیں گم ہو جاتی ہیں۔

یہ منظر جو میں نے بیان کیا اور جسے آپ نے پڑھا آج سے کم و بیش ساٹھ ستر برس قبل امرتسر کی ایک سردرات کا منظر تھا۔ اور وہ بچی جو اپنی پھوپھی کے ساتھ لٹاف میں خوف کے مارے دیگی ہوئی تھی۔ میری والدہ تھی۔ جنہیں میں اپنی جی کہا کرتا تھا۔ سُرخ و سپید۔ بھاری بھر کم باوقار خاتون۔ گول چاند ایسا پُر حلال چہرہ جہاں بیٹھی ہوتی ارد گرد کی فضا ایک سنجیدگی اور جذب کی کیفیت میں ڈوب جاتی۔ کم سخن اور کم آمیز۔ سب سے زیادہ مجھ سے پیار کیا اور زندگی بھر سب سے کم مجھ سے بات کی۔

امرتسر میں تھے تو راتوں کو ہمیں "میان پوترو آگئی" کہہ کر ڈرایا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بچوں کو سر شام ہی بستر کی طرف لائٹ دیا جاتا۔ ہم گلی کی طرف بھاگتے۔ اور یہیں ہیں اٹھا اٹھا کر بستر کی پر پٹختیں۔

سو جا۔ نہیں تو میان پوترو آجائے گی۔

اور ہم اس کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے بستر میں سمٹ جاتے جس نے زرد آنکھوں والی سیاہ خونخوار ملی کو اپنی طرف اتنے دیکھ لیا ہو۔ میان پوترو امرتسر کی چڑیل تھی۔ اس کا نام ہی سن کر ہم کانپ جاتے اور ہمارے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ جاتی تھی۔ امرتسر کی ماٹیں بہنیں شہر اور نہ سونے والے بچوں کو میان پوترو کی آواز نکال کر ڈراتی تھیں اس آواز کے ساتھ ہی ایک چڑیل کی شکل سامنے آ جاتی کہ جس کے بال کھلے ہیں۔ دونوں پاؤں اٹھے ہیں۔ دانت باہر نکلے ہیں اور وہ بائیں پھیلائے ہماری طرف بڑھ رہی ہے خوف کی ایک سنناٹا سی خون میں اترتی اور ہم سو جاتے یا بے ہوش ہو جاتے

آپو جی یعنی میری والدہ نے میان پوترو چڑیل کی آواز سنی تھی۔ چنانچہ ایک بار جب میں نے ان سے پوچھا۔۔۔

”آپو جی! آپ نے میان پوترو کی آواز سنی تھی“ تو انہوں نے مجھے وہ سارا منظر سنایا جسے میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔

میں بہت چھوٹی تھی اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی کہ کچھ یاد نہ ہو۔ میان پوترو کی آواز پہلی بار میں نے اپنی بھوپھی کے پاس لیٹے ہوئے سنی بھوپھی کا خیال تھا کہ میں سو رہی ہوں میں جاگ رہی تھی اور میں نے صاف صاف میان پوترو چڑیل کی آواز سنی۔ پہلی بار آواز شہر کے ایک کنارے سے آئی۔ بڑی زور سے آئی شاید چڑیل بلاتی شاہ کے قبرستان میں تھی پھر اچانک ہماری گلی میں مکان کے باہر سے آواز آئی۔ خدا جیوٹ نہ بلوئے وہ آواز تو جیتے جاگتے انسانوں کو پتھر کر دیتی تھی کہتے ہیں جس گلی میں آدھی رات کو میان پوترو کی آواز آتی تھی وہاں اگلے روز ضرور کوئی نہ کوئی مرگ ہو جاتی تھی۔ بڑے کا کا جی کہا کرتے تھے کہ جوانی میں ان کے محلے میں ایک بار آدھی رات کو میان پوترو چڑیل بھر گئی اگلے دن گلی میں سے چار جنازے اٹھے بڑی بھوپھی نے ایک بار میان پوترو کی آواز سنی تو وہیں دم دے دیا آدھی رات کو شاید پانی پینے اٹھی ابھی گھر سے کے پاس ہی آئی تھی کہ گلی میں سے میان پوترو کی ڈراؤنی آواز بلند ہوئی بس وہیں دھڑکے گری اور دم دے دیا اللہ بخشے وزیر خالہ کہا کرتی تھی۔ میری ماں نے گلی میں میان پوترو کی آواز سنی تو اٹھ کر کھڑکی کھولی اور کانگری کی ساری آگ لگی میں الٹ دی اور کہا سردی لگتی ہے تو لے آگ اور مرے۔ شاید اسی لئے میری بھوپھی نے بھی اس رات گلی میں کانگری الٹ دی تھی کیونکہ یہ چڑیل، میان پوترو ہمیشہ پوہ، ماگھ کی ٹھٹھرتی دیران اندھیری راتوں کو نکلا کرتی تھی اور ہر بار میان پوترو کی آواز لگانے کے بعد یہ ضرور کہتی۔ ”دونی توڑ چھے“ لیکن مجھے سردی لگتی ہے۔ ہماری آپو جی اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن میں انہیں اپنے سامنے چارپائی پر بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔ گلابی فرد میں لیٹی مجھے میان پوترو کی کہانی سنارہی ہیں بچپن میں اس چڑیل کا نام سن کر میں بھی پتھر ہو جاتا میں روتا تو میری بڑی بہن مجھے میان پوترو کی آواز نکال کر ڈراتی اور میں جہاں کا تھاں ہو کر آنکھیں بند کر لیا کرتا۔

بڑا ہوا تو راتوں کو اندھیری گلیوں سے گزرتے ڈر لگتا کہ کسی مکان کے دروازے کے پیچھے سے اچانک میان پوترو نہ نکل آئے، تپتی دیران دوپہروں میں سجائیاں والے امروروں کے بلوغ

میں ایک سناٹا چھایا ہوتا۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ دوپہروں میں چڑیلیں پیچھے سے نام لے کر آواز دیا کرتی ہیں ایک بار میں باغ میں گرے پڑے کچے امرو دکھا رہا تھا کہ اچانک یوں لگا جیسے کسی عورت نے میرا نام لے کر آواز دی ہے، امرو د میرے ہاتھ میں رہ گیا اور ایک پل کے لئے میں پتھر بن گیا، پھر جو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تو شریف پورے والے پھانک پر آکر دم لیا۔ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو، لیکن میان پوترو کا خوف ہر امرتسری لڑکے کے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔

کچھ حقیقت پسند امرتسریوں کا بیان ہے کہ اصل میں میان پوترو ایک کشمیرن تھی۔ جو امرتسریوں کو توالی کے پاس اپنے دو بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ کو توالی کی پرانی عمارت گرائی گئی تو اس کے دونوں بچے بے تلے اگر مر گئے اپنے بچوں کے غم میں وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی اب وہ امرتسر کے گلی کو چوں میں پاگوں کی طرح پھرا کرتی اور اپنے بچوں کو آوازیں دیا کرتی۔ یہ حقیقت پسندانہ بیان کم از کم مجھے پسند نہیں تھا میان پوترو کو ایک چڑیل کے روپ میں ہی دیکھنا پسند کرتا تھا ہمارے ساتھ والے محلے چیل منڈی میں میرا ہم عمر اختر نام کا ایک خوبصورت گورا چٹا لڑکا رہتا تھا۔ دس گیارہ برس کا ہو گا کہ اچانک لاری کے نیچے اگر مر گیا اس کی ماں بھاری بھر کم انتہائی سنجیدہ مزاج کشمیری خاتون تھی اور ہمارے گھر اکثر میری آپو جی کو ملنے آیا کرتی تھی۔ بیٹے کی موت کے صدمے نے اسے دیوانہ کر دیا۔ وہ سفید برقع کا نقاب اٹھائے گلیوں میں پھرنے لگی کسی بھی لڑکے کو دیکھتی تو پیچھے سے آواز دیتی۔

”وے اختر“

لڑکے ڈر کر بھاگ جاتے۔ ایک بار اس نے مجھے بھی پیچھے سے آواز دی۔ میں ڈر کر بھاگ گیا۔ یا تو اس مامتا کی ماری کو شہر کا ہر لڑکا اپنا تخت جگرا کر نظر آتا تھا اور یا اسے اختر کہیں بھی نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے وہم ہو گیا کہ یہی عورت اصل میں میان پوترو چڑیل ہے اور میں اس کے سامنے سے بھاگنے لگا۔ ایک روز دوپہر کو میں نے دیکھا کہ وہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہے۔ میں نے ریل کی پیٹری سے جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی اور چالیس کنوؤں کی جانب بھاگ گیا۔ میرے دادا جان رومانک بزرگ تھے۔ سبز چائے اور درختوں پھولوں سے محبت کرتے تھے۔ ان کا پیشتر وقت محلے والے باغ میں گھورتا۔ مولسری کے ایک درخت کے نیچے دی بچھا کر ٹیپ کرتے رہتے کسی وقت کوئی چڑیل ان کے کندھے پر آکر بیٹھ جاتی تو ان کے ٹیپہ کرتے ہاتھ ایک دم ساکت ہو جاتے جب چڑیا اڑ جاتی تو وہ مگلا

گر پھر سے پتہ کرنے لگے۔ رونا ننگ ہونے کی وجہ سے ہی شاید انہیں بھی میان پوترو کے بارے میں حقیقت پسندانہ توضیح پسند نہیں تھی۔ جب کبھی میں ان سے میان پوترو کے بارے میں بات کرتا تو وہ سبز چائے کی پیالی میں پھونک مار کر ایک گھونٹ پیتے اور سفید مونچوں پر بڑی نفاست سے انگلی پھیر کر کہتے۔
 ”میان پوترو کشمیر کی چڑیل ہے۔ احمد کا کانے ایک بار بتایا تھا کہ وہ پہلے ٹن مرگ میں رہتی تھی۔ جب وہاں بہت لوگ مرنے لگے تو ایک روز وہاں سے کوچ کر کے امرتسر آگئی۔ دوپہروں میں باغوں میں نہ جایا کرو۔“
 ”مگر وہاں ادا جان! میان پوترو تو رات کو نکلتی ہے۔“

”تمہارے خالو کبہر رہے تھے کہ ایک آدمی تپتی دوپہر میں کپنی باغ میں سے گزر رہا تھا کہ میان پوترو نے آواز دی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور وہیں کھڑے کھڑے گر کر مر گیا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں دوپہر میں کپنی باغ میں نہ جاؤں۔ کپنی باغ ہی میرا گھر میرا ہوٹل اور میرا سکول تھا۔ گھر سے بھاگ کر کاسٹریڈ ہوٹل کے دوستوں سے بھاگ کر سکول سے بھاگ کر میں اگر کہیں جاتا تھا تو کپنی باغ میں۔ آج میرا کپنی باغ بچے سے بچھڑ چکا ہے شاید اسی لئے میں اب گھر سے کبھی نہیں بھاگتا سوچتا ہوں بھاگ کر خاؤں بھی تو کہاں پہلے تو صرف ایک ہی سڑک تھی جو سیدھی کپنی باغ کو جاتی تھی اور اب میرے ارد گرد سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے مگر ان میں سے ایک بھی سڑک کپنی باغ کو نہیں جاتی وحدت الوجود سے کثرت الوجود میں آگیا ہوں اللہ مجھے توحید کی توفیق دے پچھلے دنوں ایک عزیز ویزا لے کر امرتسر گئے تو مجھ سے پوچھا تمہارے لئے امرتسر سے کیا لاف؟ میں نے کہا کپنی باغ کا کوئی پھول لے آئیے گا۔ انہوں نے والپسی پر مجھے نیل کا ایک سرنخ پھول لاکر دیا یہ پھول وہ کپنی باغ کی ایک روش سے اٹھا کر لائے تھے وہ پھول میرے پاس پڑے پڑے سیاہ ہو گیا ہے رنگ اڑ گیا ہے مگر کپنی باغ کی ہلک اس میں سے اب بھی آتی ہے۔“

لیکن ان دنوں تو گرمیوں کی ٹھنڈی صبحیں تپتی دوپہریں اور شامیں کپنی باغ کی چھوٹی نہریں چلا گئیں لگاتے گزرتی تھیں۔ میان پوترو کا خوف مجھے کپنی باغ میں بہت ہی کم آتا تھا شاید میان پوترو بھی اس خوبصورت باغ میں اگر درخت بن جاتی تھی ایک روز شام کو میں نہر سے نہا کر نکلا تو پردہ کلب کی طرف آگیا یہاں ناشپاتی کے بے شمار درخت پھلوں سے بھرے ہوئے تھے باغ میں شام کا سرمئی

اندھیرا پھیلنے لگا تقابرات کے دن تھے ٹھنڈی کھوئی والے آموں کی طرف سے کوئل کے بولنے کی آواز آتی تھی۔ میں نے سوچا دو چار ناشپاتیاں توڑ کر لے جاؤں پردہ کلب کے عقب میں رکھواؤں کی جھونپڑی تھی کسی وقت رکھوالے کی آواز بلند بلند ہو جاتی تھی میں جھاڑیوں میں سے نکل کر پردہ کلب میں آگیا۔ ناشپاتی کے درختوں کی کچھ شاخیں کلب کے لان میں جھکی ہوئی تھیں۔ زردی مائل سبز ناشپاتیاں توڑ کر ٹیکر کی جیب میں بھر لیں اور واپس مڑا ہی تھا کہ اچانک ایک ہاتھ نے پیچھے سے میری قمیض پکڑ کر کھینچی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا پلٹ کر دیکھا تو پیچھے کوئی بھی نہیں تھا میں دہشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔

پردہ کلب کی جھاڑیوں کو چیرتا ہوا باہر نکلا اور پھیلیوں والے تالاب کے اوپر سے ہو کر رہا تھا کہ ایک سفید برقع والی عورت نے اچانک میرے سامنے آکر کہا۔
 ”وے اختر!“

اس کے بعد کی مجھے کوئی خبر نہیں کہ میں کیسے ٹھنڈی کھوئی اور وہاں سے اپنے گھر پہنچا دو روز میں بخار میں مبتلا رہا۔ تیسرے روز آپو جی کو ڈرتے ڈرتے یہ واقعہ سنایا تو انہوں نے کہا۔
 ”وہ ضرور میان پوترو تھی۔ خبردار جو تو اب کبھی کپنی باغ گیا۔“

بخار سے اٹھا تو ایک روز امرود توڑنے گئی منڈی والے قبرستان میں نکل گیا یہ قبرستان ہمارے محلے کٹراہ مہاں سنگھ کے پاس ہی تھا امرتسر کے قبرستانوں میں بھی لوگوں نے پھلوں کے باغ لگا رکھے تھے لوکاٹ، امرود، آلوچہ، ناشپاتی، فالسہ اور شہتوت کے درختوں کے جھنڈے اُگے تھے۔ بیج بیج میں قبر بھی بنی ہوئی تھیں۔ بڑے بہشتی تھے امرتسر کے آسودگان خاک بھی ایک چھوٹی سی تہر گئی منڈی والے قبرستان کے پہلو سے ہو کر گزرتی تھی اور پیچھے درختوں سے ٹپکے ہوئے پھل اس نہر میں تیرتے چلتے آتے اور ہم پانی میں اتر کر انہیں نکال کر کھایا کرتے تھے۔ عید کی صبح کو ہم منہ اندھیرے قبروں پر آکر موم بتیاں روشن کرتے اگر بتیاں جلاتے اور گیند سے گلاب کے پھول بکھیرتے اور درختوں سے کسیری رنگ کی لوکاٹیں اور کچے پکے امرود توڑ کر بھی کھاتے۔

میں دورہ مہاں سنگھ سے نکل کر کینہ سنی سرور کی طرف چلا ساؤن کی گھٹانے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی تکیے کے قریب سے گزرا تو بودی سائیں کی سریلی آواز سنائی

دی۔ وہ گھڑے پر گار ہاتھا۔

ایہہ بدل جو اُس نے
دھوئیں میرے دل والے
آسمانیں چھائے نے

امر تسری گھٹاؤں کے بادل واقعی دلوں سے اٹھ کر آسمان پر چھایا کرتے تھے یہ دھواں نہ دل سے
اٹھتا ہے نہ جہاں سے اٹھتا ہے اور نہ ہی باورچی خانوں سے اٹھتا ہے اگر کہیں سے اٹھتا ہے تو اونٹنی پس
والوں کی گاڑیوں سے۔ برج پھولا سنگھ کو پیچھے چھوڑ کر میں اس چوٹی سی سڑک پر آگیا جو قبرستان کو جاتی
تھی۔ دائیں بائیں پھلوں کے باغ شروع ہو گئے۔ طوطوں کی قطاریں امرود کے درختوں کو جا رہی تھیں میں
بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو گیا ہوا میں قبروں پر سگتی، اگر بیویں کے ساتھ ساتھ امرودوں کی خوشبو بھی ملی ہوئی
تھی۔ اچانک میری نظر ایک سیاہ ناگ پر پڑی جو حجر سے پچاس، ساٹھ گز کے فاصلے پر ایک قبر میں سے
اُدھا باہر نکلا۔ پھن اٹھائے کھڑا جھوم رہا تھا۔

ایک لمبے کے لئے میں اسی جگہ خوف زدہ ہو کر ساکت ہو گیا۔ سانپ کا پس چوڑا تھا اور اس کا رخ
میری طرف تھا اگرچہ وہ حجر سے کافی دور تھا۔ پھر بھی میں نے پیچھے کی طرف کھسکا شروع کر دیا جب کافی پیچھے
چلا گیا تو دل میں ایک احمقانہ سی خواہش پیدا ہوئی کہ عقب سے جا کر سانپ کو دیکھا جائے میں ندی پھلانگ
کر لوکاٹ کے درختوں میں سے ہوتا ہوا سانپ والی قبر کے عقب میں جا نکلا میں اب بھی اس قبر سے کوئی
چالیس پچاس گز کے فاصلے پر تھا مجھے سانپ کہیں نظر نہ آیا خدا جانے کہاں چلا گیا تھا بچپن کا شوقی فضول
اور جرأت رندانہ مجھے کشاں کشاں قبروں میں آگے ہی آگے کیسے پھینکتی لے گئی گھاس اور جنگلی پھولوں میں
چھپی ہوئی قبریں خاموش تھیں۔ سرانے کے پتھروں اور اینٹوں سے موم قیوں کی لگی ہوئی موم چپٹی تھا
میں رک گیا اب مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ اگر یہیں کسی قبر سے کالا سانپ نکل آیا تو کیا ہو گا میں پیچھے
کو دوڑا اور ندی پر اگر دم لیا۔ ندی کے گدے پانی میں ایک کچا آم تیرتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے پانی میں
اتر کر اسے اٹھایا اور مزے سے کھاتا ہوا امرودوں کے جھنڈ کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک میری نظر اپنے
مرحوم دوست انجی کی دیوانی والدہ پر پڑی اس نے میلا کچھلا سفید برقع اوڑھ رکھا تھا نقاب اٹھا تھا اس
کے سفید بالوں کی ایک لٹ لٹک رہی تھی اور وہ اپنے لخت جگر کی قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ پھر ایک ایسی

اس نے بین کرتے ہوئے ایک دلہن پر چڑھ ماری۔

ایک چنچ گویا میرے اندر سے بھی نکلی اور میں دہشت زدہ ہو کر وہاں سے دوڑا میں درختوں سے
بچتا جھاڑیاں پھلانگتا بھاگا چلا جا رہا تھا کہ کسی شے سے ٹکڑ کر کھا کر مقبور کی کانٹے دار جھاڑی میں گر پڑا
بے شمار کانٹے میرے بدن میں چبھ گئے۔ میرے جسم کو درد نے جیسے جکڑ دیا میں پھر بھی بھاگتا چلا گیا
قبرستان کی حدود سے باہر نکلا تو ایک سادھو نے مجھے روک لیا۔ شاید اس نے میرے جسم میں چبھے
کانٹوں کو دیکھ لیا تھا۔

”مٹھر جاؤ، یہ مقبور کے کانٹے ہیں اگر دیر کر دی تو یہ بدن کے اندر چلے جائیں گے۔
سادھو نے مجھے کنوئیں کے پاس پیل کے درخت تلے بٹھالیا اور بڑی محنت اور جانفشانی سے
ایک ایک کر کے میرے کانٹے نکالنے لگا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں مقبور پر کیسے گر پڑا۔ میں نے
کہا۔

”میان پوترو۔ وہاں۔“

پھر میں نے اسے بتایا کہ میان پوترو چڑیل میرے مرنے دوست اختر کی ماں کا روپ بدل کر قبرستان
میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سادھو کی باتیں مجھے یاد نہیں رہیں۔ اتنا یاد ہے کہ اس نے کمال دردمندی کے ساتھ
میرے جسم کے سارے کانٹے نکال دیئے تھے اور پھر مسکراتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھر کر آگے چل
دیا تھا۔ میں سادھو کا چہرہ بھی بھول گیا ہوں لیکن اس کے ہاتھ کے لمس میں جو انسانی مہر دی اور دکھ درد
میں کسی انسان کے کام کا جذبہ موجزن تھا اس کی گرمی میں آج بھی اپنے جسم میں محسوس کرتا ہوں۔

میں نے ڈر کے مارے گھر آ کر کسی کو یہ واقعہ نہ سنایا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میان پوترو میرے
مرنے ہوئے دوست اختر کی ماں کے روپ میں آگئی ہے اور یہی ملتا کی ماری راتوں کو سنان گلیوں
میں مکان کے باہر نہ کھڑی ہو اور مجھے آواز دے کر پتھر نہ بنا دے لیکن اختر کی ماں کو پھر کسی نے اپنے
نکسے میں نہیں دیکھا تھا وہ ادھر آتی ہی نہیں تھی۔ دیوانگی کی حالت میں قبرستانوں، دیرانوں میں گھوم مارتی
گئی۔ دیوانگی کی حالت میں قبرستانوں، دیرانوں میں گھوم مارتی تھی۔ اور یا پھر میرے خیال کے مطابق
گلیوں کی سنان راتوں میں شہر کی گلیوں میں اپنے پیارے بیٹے کو بین کرتی آواز میں بلایا کرتی تھی۔
وقت گزرتا گیا۔ ہم بڑے ہوئے تو امر تسری کے گلی کو چوں سے میان پوترو کی آواز غائب ہو چکی

تھی۔ صرف اس کی ایک دہشت ناک یاد باقی تھی اور مائیں اب بھی اپنے بچوں کو میان پوترو کا نام لے کر ڈریا کرتی تھیں۔ آپو جی کی زبانی معلوم ہوا کہ میان پوترو واپس کشمیر جا چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اختر کی دیوانی ماں بھی اپنے مردہ بیٹے کی تلاش میں دیرافوں اور قبرستانوں میں ماری ماری پھرتی، اُسے پکارتی، اس کی یاد میں بین کرتی کہیں گم ہو گئی۔ کہیں کھو گئی۔ شاید اسے اس کے لخت جگر نے اپنے پاس جنت میں بٹا لیا تھا۔ سب مائیں جنت میں جاتی ہیں۔ اور جن کے کسن بچے وہاں پہنچ جائیں وہ تو اپنی ماؤں کے لئے جنت میں محل و گہر کے محل بنا کر ان کا انتظار کرتے ہیں۔

مذکور میان پوترو بھی جنت میں گئی ہوگی۔ کیا ہوا جو وہ چڑیل تھی۔ آخر وہ بھی ایک ماں تھی۔ جس کے بچے پرانی کو قوالی کی عمارت کے میچے آکر مر گئے تھے۔ وہ بھی تو راتوں کو اپنے بچہ پڑے ہوئے بچوں کو رو رو کر آوازیں دیا کرتی تھی۔

”میرے بچو! میرے بچو!“

وقت کا پہیہ کچھ اور گھوما۔ پاکستان بن گیا۔ امرتسر ہم سے بچھڑ گیا۔ سب کچھ وہیں رہ گیا صرف یادیں ہمارے ساتھ آگئیں۔ ان میں میان پوترو چڑیل کی یاد بھی ہے۔ امرتسر کی مائیں شاید اب اپنے بچوں کو میان پوترو کا نام لے کر نہ ڈراتی ہوں لیکن ان کے دلوں میں میان پوترو کی یاد آج بھی زندہ ہو گئی۔ میان پوترو چڑیل کی یاد میرے دل میں بھی زندہ ہے مگر مجھے اب اس سے خوف محسوس نہیں ہوتا۔ شاید اس لیے کہ اب میں بچہ نہیں رہا۔ شاید اس لیے کہ اب تو امرتسر کی چڑیلیں بھی خوبصورت لگتی ہیں۔

پھر بھی کبھی کبھی لاہور شہر کی کسی سڑک، کسی گلی، کسی باغ کسی قبرستان میں سے گزرتے ہوئے مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی عورت نے پیچھے سے آواز دی ہو۔

”وے اختر!“

اور میں کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ اس لیے نہیں کہ میں پتھر نہ ہو جاؤں بلکہ اس لئے کہ جس۔ یاں پوترو نے مجھے آواز دی ہے کہیں وہ میری شکل دیکھ کر پتھر نہ ہو جائے۔

امرتسر کا ایک درویش

امرتسر کے ہال دروازے سے باہر نکل کر جب آپ داہنی جانب کو ہوں تو یہ تباہ و برباد کے مزار کے پہلو میں ایک نالے کا چھوٹا سا پل عبور کر کے سامنے انجن پارک کا ریتلا میدان آ جاتا ہے۔ یہ میدان ریلوے کے اونچے پل کی ڈھلانوں کے سائے میں ہے۔ ان ڈھلانوں پر سڑک کی اترائی کے ساتھ ساتھ لوسے کا جنگلہ لگا ہے جس پر یو کلیٹس کے گھنے درختوں کا سایہ پھیلا ہوا ہے۔ کونے میں ایک چھوٹی سی مسجد ہوا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک کنواں اور اکھاڑہ بھی تھا۔ انجن پارک امرتسر کی سیاسی اور سماجی زندگی کی آماجگاہ تھی۔ یہاں اگر ایم اے او کالج اور ڈی اے دی کالج کے معرکہ خیز کرکٹ میچ ہوا کرتے تھے تو مجلس احرار مسلم لیگ اور نیلی پوشوں کے ہنگامہ پرور جلسے بھی منعقد ہوتے تھے۔ کرکٹ میچوں میں ایم اے او کالج کے دینیات کے استاد حافظ نور شاہ صاحب زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ جاتے اور تسبیح کا ورد کرتے ہوئے دعا پڑھ پڑھ کر مروت حسین شاہ کو باؤ لنگ کرتے ہوئے دور سے پھونکیں مارا کرتے جب ہندو کالج کی وکٹ اڑتی تو حافظ نور شاہ اپنے خاکی کوٹ اور خاکی کلمہ لگڑی میں بائیں پھیلا کر اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے اور دوبارہ دھڑا دھڑا تسبیح اور دعاؤں کا ورد شروع ہو جاتا۔ مجلس احرار اور مسلم لیگ کے جلسوں میں لوگ گلے بچھاڑ بچھاڑ کر اسلام زندہ باد کے فلک شکاف نعرے لگاتے اور ڈٹ کر تیل کے قیمے والے پھورے اور نان چھوٹے کھاتے۔ کیا مجال جو کسی کے گلے میں خراش تک بھی پڑتی۔

دلی بمبئی سے کوئی سرکس امرتسر آتا تو انجن پارک کے میدان میں آکر اترتا۔ منبو، قناتیں تن جاتیں۔ چھوٹا لڑیاں لگ جاتیں غاردار جنگلوں کی دوسری طرف زنجیروں سے بندھے ہوئے قوی الجشہ ہاتھی گھاس کے ڈھیروں کے پاس جھوٹے نظر آتے۔ پنجروں میں بند شراقتی بندروں کی خوشبو کی

اوازیں آتیں کبھی کبھی کسی بوڑھے شیر کی نجیف سی "ہائیں ہائیں" بھی سنائی دے جاتی۔ سرکس کے ملازمین میدان میں ادھر ادھر بیٹھیں لگاڑنے اور جانوروں کو چارہ ڈالتے ہیں مصروف دکھائی دیتے۔ ہم رات کو سرکس میں کرتب دکھانے والوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پیروں خاردار جھگلوں کے پاس کھڑے رہتے مگر وہ لوگ سوائے رات کے دن کو کبھی دکھائی نہ دیتے تھے۔ انجن پارک کے مشرق میں مسجد نور تھی جسکی ٹوئیں سے ہم منزل لگا کر پانی پیا کرتے تھے اور جس کی اونچی چھت پر مناروں کے قریب کھڑے ہو کر ہم سرکس والوں کے چھپے ہوئے شیر کو دیکھنے کی کوشش کیا کرتے۔ مغربی جانب گندے تالے کے پار پرل ٹاکیڑ کی پرانے طرز کی اونچی لمبی عمارت کھڑی تھی۔ اسے جہان سنگھ کا منڈا بھی کہتے تھے۔ کسی زمانے میں یہ تھیٹر تھا۔ اور الفریڈ تھیٹر کیل اور کورنٹھین تھیٹر کیل کپنیاں اس کی سیٹج پر آغا حشر کے کھیل کھیل کرتی تھیں۔ اندر سے اس کی گیلری یورپ کے تھیٹر گاہوں کی طرح بڑی منقش اور قدیم سنائیل کی تھی۔ سینما کو عروج حاصل ہوا تو اس کی سیٹج پر پردہ لگا کر نجیت مودی ٹون کا "بھولا شکار" "طوفان میل" "روپ بسنت" پر بھات سینے ٹون کی "سیر نہ پیری" "استریوں کا راج" اور "پڑوسی" ایسی فلمیں کی نمائش شروع ہو گئی نیو تھیٹر مازکی "دھوپ چھاؤں" "منزل" "ڈاکو منصور" اور "دیو داس" کی نمائش بھی اسی سینما ہاؤس میں ہوئی تھی۔ امرتسر کا یہ بڑا پرانا اور سب سے پہلا تھیٹر ہاؤس تھا۔

گندے تالے کی اس جانب ڈنڈے شاہ کا تکیہ اور تھوڑی سی آبادی تھی۔ اس آبادی کے مکانوں کی کھڑکیاں اور اکثر کے دروازے گندے تالے کے دابنے کنارے پر کھلتے تھے تکیہ ڈنڈے شاہ میں جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے کچی اینٹوں کی دو چار قبروں، ایک اکھاڑے اور دھریک اور نیم کے سایہ دار درختوں کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔ ہاں ذرا پرے مسجد نور کے قریب ہی ایک اونچے جوڑے پر کسی بزرگ کا مزار ہزار تھوڑے جس کے درخت پر سبز اور سفید جھنڈے ہوا میں پھر پھڑپھا کرتے تھے۔

امرتسر کے جس درویش کی میں یہاں کہانی بیان کرنے لگا ہوں اُن کا مکان بھی اسی تکیہ ڈنڈے شاہ کی آبادی میں تھا۔ مکان کیا تھا بس گندے تالے کے کنارے کچی کچی اینٹوں کی ایک کوٹھڑی تھی جس پر کھیریل ڈال کر گارا پھیر دیا گیا تھا۔ اُس درویش کا نام حافظ شفیع تھا۔ اور اس جھونپڑی نما مکان

میں غالباً اُن کی بوڑھی والدہ صاحبہ رہا کرتی تھیں حافظ صاحب والدہ کی بے حد خدمت کیا کرتے حافظ صاحب بڑے زندہ دل محفل پرست، پرہیزگار ہنس مکھ اور قناعت پسند درویش تھے۔ پان تمباکو قوام والا کھاتے۔ تمباکو بالکل نہ پیتے۔ چائے خود بنا کر اداس میں زعفران ڈال کر پیتے اور دوستوں کو پلاتے۔ تھوڑی تھوڑی طبابت بھی جانتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی مریض آجاتا تو اُسے اپنے پاس سے دوائی خرید کر اور گھوٹ کر بھی دیتے حافظ قرآن تھے اور نماز پنج وقتہ ادا کرتے تھے۔ بلا پتلا چھر پر ابدن ستوان ناک، باریک ہونٹوں کے پیچھے بھنی ہوئی مونگ پھلی کے دانوں ایسے ہموار دانت فرخ کٹ حقیر سی ڈارھی اور باریک مونچھیں۔ نرم چمکیے سیاہ بالوں کے پٹے گھر میں دھلی ہوئی بغیر استری کی قمیض اور شلوار، پاؤں میں باٹا کی چل۔ سردیوں میں لونی کی لیگل مار کر ساری ہڈیاں گزار دیتے ہرن ایسی بڑی بڑی آنکھوں میں سرمے کی لکیر اور ہونٹوں پر ہر دم کھیلی زندہ دلی کی مسکراہٹ یہ تھے ہمارے درویش دوست حافظ شفیع۔

انہوں نے مسجد شیخ خیر الدین مرحوم میں ڈیرہ لگا رکھا تھا۔ یہ بال بازار میں میوہ منڈی کے دروازے کے عین سامنے تھی۔ مسجد خیر الدین میں داخل ہوتے ہی ایک چھتی ہوئی ڈیوڑھی میں سے گھورتا پڑتا تھا۔ اس ڈیوڑھی میں ہر موسم میں ٹھنڈا ٹھنڈا اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ کونے والے ستون پر عشق پیچاں کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ اس ستون کے پہلو میں ایک حجرہ تھا جس میں حافظ شفیع کا ڈیرا تھا۔ حجرے میں ایک صرف بجھی تھی۔ کونے میں ایک حازم پر صند وچھی رکھی تھی۔ الماری میں شرع، فقہ اور حدیث شریف کی پرانی کتابیں پڑی رہتی تھیں۔ ایک دھنسر۔ دو جوڑے قمیض شلوار اور ایک پرانا بستر۔ یہ حافظ شفیع کی کل کائنات تھی میں سردیوں میں عشا کی نماز کے بعد حافظ صاحب سے ملنے اُن کے حجرے میں جاتا۔ مسکرا کر سر کو والہانہ انداز میں جھٹکتے اور کہتے۔

”سبحان اللہ!“

یہ اُن کا تکیہ کلام تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب انہیں والدہ کے انتقال کی خبر ملی تو اُس وقت بھی انہوں نے سر کو آہستہ سے جھٹک کر کہا تھا۔

”سبحان اللہ!“

میں لکڑی کی پرانی صند وچھی کے پاس حازم پر کشمیری فرد کی لیگل مار کر بیٹھ جاتا حافظ

قناعت تھی۔ دو چار آنے کی دوائیں روز بک جاتی تھیں۔ تنور سے دال روٹی منگو لو، میں
جگرے میں بیٹھ کر کھا لیتے اور سبحان اللہ کہہ کر سماوار میں چائے کے لئے کوئلے سلگاتے
لگتے۔

ایک بار بال بازار کے مشہور لکھتی تاجر تندر لعل کا اکھوتا لڑکا کنڈن لعل سخت بیمار پڑ
گیا۔ وہ میرا ہم جماعت بھی تھا۔ اُس کے سپیٹ میں کچھ خرابی ہو گئی تھی اور حالت روز بروز
تشویش ناک ہوتی جا رہی تھی تندر لعل اپنے بیٹے کنڈن لعل کے لیے انتہائی پریشان ہو گیا۔ اُس
نے گھر پر امرتسر، جالندھر اور لاہور کے نامی گرامی ڈاکٹروں کو جمع کر دیا۔ مگر اتفاق کی بات ہے کہ
یہ سارے ڈاکٹر مل کر بھی کنڈن لعل کی بیماری کو دور نہ کر سکے۔ اُس کی حالت بگڑتی چلی گئی میں
نے کنڈن لعل کے پتا جی سے کہا کہ حافظ صاحب کو بھی دکھالیں کیا خبر اللہ شفا دے دے۔ لالہ
جی خود حافظ صاحب کو لے کر گھر آئے۔ کنڈن لعل کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ دونوں میں
وہ سوکھ کر کاٹا ہو گیا تھا اور نقابہت کے عالم میں ایک شاندار پلنگ پر لیٹا نحیف سانس لے
رہا تھا۔ اُس کی ماما جی سرانے سر جکائے بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ میز پر بڑی بڑی قیمتی دوائیں
پڑی تھیں۔ لوہے کی الماریوں اور آہنی سیفوں میں ہزاروں روپے کے زیورات بند پڑے
تھے مگر کنڈن لعل کو کوئی نہ بچا سکتا تھا۔

حافظ صاحب کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر ماما جی نے سفید ساڑھی کا گھونگھٹ سا نکال لیا۔
حافظ شفیع نے بسم اللہ پڑھ کر کنڈن لعل کی نبض ٹٹولی اور آنکھیں بند کر لیں تھوڑی دیر بعد
آنکھیں کھول کر مسکرائے اور تندر لعل سے بولے۔

”فکر نہ کریں لالہ جی! بچہ اچھا ہو جائے گا۔ سبحان اللہ!“

پھر چپ میں سے ٹین کی ایک ڈبیا نکال کر اُسے کھولا۔ اس میں سے ننھی ننھی چھ بڑیاں
نکال کر میز پر رکھیں اور کہا۔

”دو دو گھنٹے بعد پانی کے ساتھ ایک پڑیا دیتے جائیں۔ اللہ شفا دے گا خدا کی قدرت
کہ اگلے روز کنڈن لعل کی حالت سنبھل گئی۔ حافظ شفیع نے مزید چھ بڑیاں بھجوا دیں۔ تیسرے
روز کنڈن لعل پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا چوتھے روز وہ اپنے گھر میں چل پھر رہا تھا اور پانچویں دن وہ

اپنے والد کی دکان پر بیٹھا تھا۔ لالہ تندر لعل اسی روز اپنے لخت جگر کو لے کر حافظ صاحب کے
پاس جگرے میں حاضر ہوا۔ میں بھی وہیں شال کی بگل مارے صف پر بیٹھا تھا۔ حافظ صاحب سماوار
میں کوئلے سلگائے سے ہوا کر رہے تھے لالہ جی نے ہاتھ جوڑ کر بندگی کی اور اپنے بیٹے کے ساتھ
دو زانو ہو کر بڑے ادب سے صف پر بیٹھ گئے۔ حافظ شفیع نے مسکرا کر کہا۔

”خدا تے آپ کے بچے کو شفا دے دی۔ سبحان اللہ“

لالہ تندر لعل بچھا جا رہا تھا۔ بڑے انکسار سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”حافظ جی! میں آپ کی دوا کے پیسے دینے آیا ہوں۔ انہیں قبول کیجئے“ اس کے
ساتھ ہی لالہ جی نے جیب سے سو سو روپے کے بیس نوٹ نکال کر حافظ شفیع کے قدموں
میں رکھ دیئے۔ حافظ شفیع نے نوٹوں کو دیکھا۔ پھر لالہ جی کو دیکھا اور سر جھٹک کر مسکراتے
ہوئے بولے۔

”مگر لالہ جی! میری دوا تو تین آنے کی تھی“

میں وہ منظر ساری زندگی نہیں بھول سکتا کہ کس طرح امرتسر کا لکھتی تاجر لالہ تندر لعل حافظ
شفیع کو دو ہزار روپے قبول کرنے پر اصرار کر رہے تھے اور حافظ شفیع کس بے نیازی سے
صرف تین آنے لینے پر بعد تھے دو ہزار روپے ۱۹۴۵ء میں بیس ہزار سے کم نہ تھے۔ آخر
لالہ جی کو سارے نوٹ واپس لینے پڑے اور اپنے کوٹ کی جیب میں سے تین آنے
نکال کر حافظ جی کے قدموں میں رکھ دیئے۔ اُس وقت لالہ جی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
انہوں نے فرط عقیدت سے حافظ شفیع کے پاؤں کو چھو کر ہاتھ اپنے ماتھے پر لگائے۔ جب
لالہ جی چلے گئے تو حافظ شفیع نے پنکھا صف پر پھینک کر دروازے میں سے سر باہر نکال کر
دیکھا کہ لالہ جی مسجد سے نکل گئے ہیں، پھر جو پلٹے تو اُن کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔
بچوں کی طرح مسرور ہو کر بولے۔

”سبحان اللہ! آج کی روٹی کا بندوبست ہو گیا بٹ صیب“

آج کی روٹی — یعنی دو پیسے کی دو روٹیاں اور پیسے کی دال — کسی وقت ہم
دونوں کمپنی باغ کی سیر کو نکل جاتے۔ راستے میں کوئی جنازہ مل جاتا تو حافظ شفیع کلمہ شریف

پڑھ کر اس طرف لپکتے اور کندھا دے کر ساتھ ہو لیتے میں بھی اُن کے ساتھ ہو جاتا۔ محلے میں کسی لڑکی کی شادی ہوتی تو حافظ شفیع بن بلائے ہی وہاں پہنچ جاتے۔ دریاں بکھا رہے ہیں۔ قناتیں رگڑ رہی ہیں۔ دسترخوان جھاڑ رہے ہیں۔ منوں میں پانی ڈلوا رہے ہیں براتیوں کو پانی پلا رہے ہیں تھال بھر بھر کر پلاؤ اندر لے جا رہے ہیں اور جب برات چلی جاتی تو عمر تنور والے کی دکان پر آکر وہی دو روٹیاں اور دال لیتے اور سبحان اللہ کہہ کر کھانا شروع کر دیتے۔ صبح صادق کو اٹھ کر مسجد میں داخل دیتے مسجد کے صحن میں جھاڑو دھیتے اور منبر کو اپنے بسنتی رومال سے جھاڑتے۔ رمضان شریف میں سحری کے وقت محلے میں ہر گھر پر جا کر دروازہ کھٹکھٹاتے اور صاحب خانہ کا نام لے کر اُسے جگاتے۔ افطاری کے وقت مسجد میں انواع و اقسام کے پھلوں اور کھانوں کے ڈھیر لگ جاتے مگر حافظ شفیع کو میں نے ہمیشہ نمک اور کھجور سے ہی روزہ افطار کرتے دیکھا۔ افطاری کے بعد میرے ساتھ ادا کرتے۔ تنور پر جا کر دال روٹی کھاتے اور پھر مجھے ساتھ لے کر تراویح پڑھانے تحصیل پورے والی مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے۔ سارا رستہ ہنس ہنس کر باتیں کرتے جاتے رومی اور سعدی کے شعر سناتے۔ زعفرانی چائے کے فوائد پر لہک لہک کر باتیں کرتے۔ سبحان اللہ! کیا لوگ تھے!

حافظ شفیع سے امرتسر میں میری آخری ملاقات ۲۳ اگست ۱۹۷۷ء کو شریف پورے کے باہر ریلوے لائن پر ہوئی۔ امرتسر کے درو دیار فسادات کی آگ میں جل رہے تھے۔ شہر پر ہندو سکھ فوج نے قبضہ کر رکھا تھا اور امرتسر کے مسلمان مہاجرین سے بھری ہوئی ریل گاڑیاں شریف پورے سے پاکستان کی طرف جا رہی تھیں ہر شخص پریشان اور بے حال تھا۔ چہروں کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں دیران ہو رہی تھیں۔ کسی کا میٹا شہید ہو گیا تھا تو کسی کا باپ۔ کسی کے بھائی کی لاش بے گور و کفن شہر کی کسی سڑک پر پڑی رہ گئی تھی۔ تو کسی کی بہن محلے کے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر عزت کی موت مر گئی تھی۔ امرتسر جل رہا تھا۔ ہر طرف آگ اور خون کا کھیل جا رہا تھا۔

شریف پورے والی ریلوے لائن کے آس پاس مہاجرین کا سیلاب اٹھ آیا تھا بلوچ رجمنٹ کے جوان مشین گنیں سنبھالے جالندھر اور بٹالے کی طرف پوزیشنیں لئے بیٹھے تھے۔

شریف پورے کے آس پاس کی آبادی کو مہاجرین کیمپ قرار دیا جا چکا تھا۔ شہر میں رہے رہے مسلمانوں کے پریشان حال قافلے یہاں جمع ہو رہے تھے۔ رات رات بھر شہر کی طرف سے ہندو اور سکھ فوجی اس کیمپ پر فائر کھول دیتے۔ سارے کیمپ پر ایک دہشت کی فضا طاری تھی۔ ہمارے خاندان کے تقریباً سیسھی افراد پہلی گاڑی میں لاہور روانہ ہو چکے تھے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ میں کس لئے اکیلا شریف پورے میں رہ گیا تھا۔ بہر حال میں ریلوے لائن کے پاس دوسرے ہزاروں مہاجرین کے ساتھ پتھروں پر بیٹھا پاکستان جانے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا اتنے میں امرتسر ریلوے سٹیشن کی جانب سے چھک چھک کرتی خالی گاڑی آئی اور ہمارے پاس آکر رُک گئی۔ بس اس کے بعد کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا دیکھتے دیکھتے ریل گاڑی کے اندر، باہر اور چھت پر تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح ہجوم میں گھس گھسا کر ایک ڈبے میں سوار ہو کر کسی کے سامان پر بیٹھ گیا میں ایک آدمی کی ٹانگ اور دوسرے آدمی کے بازو میں سے کھڑکی کے باہر کا کچھ منظر دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف ایک شور، ایک ہنگامہ اور ایک قیامت برپا تھی۔ اتنے میں میں نے حافظ شفیع کو دیکھا۔ وہ ایک سیلا سا تھلا کندھے پر ڈالے ایک طرف سگلی کے کھجے کے پاس کھڑے تھے انہوں نے دو ایک بار گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش بھی کی مگر لوگوں نے انہیں دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ وہ ایک بار پھر چپ چاپ سے کھجے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھے اور میں انہیں آواز نہ دے سکتا تھا گاڑی چل پڑی۔ بچے کچے لوگ بھاگ بھاگ کر سوار ہونے لگے۔ میں نے دُور سے حافظ شفیع کو دیکھا۔ انہوں نے بھی لپک کر ایک ڈبے میں سوار ہونے کی کوشش کی لیکن ایک آدمی نے جو پائیدان پر لٹکا ہوا تھا حافظ جی کا ہاتھ پر سے جھٹک دیا۔ گاڑی اب شریف پورے سے اُگے نکل آئی تھی۔ شریف پورہ کیمپ سے پاکستان آنے والی یہ آخری گاڑی تھی۔ اس کے بعد جو گاڑی بھی آئی اسے کاٹ دیا گیا۔ کچھ دُور تک میں حافظ شفیع کو دیکھتا رہا۔ وہ ریلوے لائن کے قریب ایک کھڑے تھلا کندھے پر ڈالے چپ چاپ پاکستان کو جانے والی گاڑی کو تک رہے تھے۔ اُس وقت میں اُن کے پاس نہیں تھا مگر مجھے یقین ہے کہ انہوں نے ایک بار دُور سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے کہا ہو گا۔

امرتسر کا اسد جو

نام اُس کا اسد جو تھا۔

سردیوں میں وہ محلے کی ایک جھکی ہوئی چھت والی بوسیدہ اور اندھیری دکان میں ہرلیہ بیچتا اور گرمیوں میں کوئی کام نہ کرتا عام طور پر وہ اس چھلپاتی دھوب اور گرم لوہے موسم میں کشمیر چلا جاتا جہاں امیر اکمل کے کسی قریبی گاؤں میں اُس کی رشتے میں کوئی بھوپھی رہا کرتی تھی۔ ستمبر کے شروع دنوں میں وہ کشمیر سے واپس امرتسر آتا تو اُس کا رنگ سرخ ہوتا وہ اپنے ساتھ کشمیر کے ابری سید، بادام اور دو ایک لوٹیاں ضرور لاتا۔ لوٹیاں وہ محلے میں ہی کسی کے ہاتھ بیچ دیتا اور بادام اور سید ہمالیوں میں بانٹ دیا کرتا۔ ایک بار ابا جی نے اسد جو سے بھورے رنگ کی ایک لوٹی خریدی اور اُسے منڈا کر ہم بھائیوں کے کوٹ بنوا دیئے وہ اس قدر گرم تھے کہ پوہ ماگھ کی سردی میں ہمیں اُن میں گرمی محسوس ہوا کرتی۔ کئی سالوں تک اُن کوٹوں نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا۔ اسد جو اپنے لمبے کوٹ کی جھولا نما جیب میں دو تین لال لال کشمیری سید نکال کر ابا جی کو دیتا اور کہتا۔

”خلیفہ! ایسہ خاص تیرے لئے تحفہ اکی“

یہ امبری سید جس کمرے یا دکان میں کاٹے اور چھیلے جاتے وہاں کی فضا اُن کی ٹھنڈی اور انتہائی شریں خوشبو سے مہک اُٹھتی۔ اسد جو صدی کی اندرونی جیب میں سے لکڑی کے دستے والا پرانا چاقو نکال کر سید کی ایک قاش کاٹتا اور مجھے دے کر کہتا۔

”اوئے کھا اوئے می دے“

اسد جو کا لہجہ ٹیٹ کشمیری تھا۔ وہ کشمیری زبان بڑی روانی سے بولتا تھا۔ امرتسر کے کشمیریوں

کو کشمیر کی داوی سے ہجرت کئے ایک دو پشتیں گزر گئی تھیں۔ اور اب اُن کے گھروں میں صرف، تانیاں دادیاں یا بڑے بڑے ہی تھوڑی بہت کشمیری بولتے تھے لیکن اسد جو کشمیر میں ہی پیدا ہوا۔ وہیں اُس نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری۔ پھر جانے کیا ہوا کہ وہ امیر اکمل والے اپنے گاؤں سے بویا بستر اٹھا کر امرتسر آگیا اور پھر یہیں کا ہو رہا۔ اُسے کشمیر سے اُسے اٹھارہ انیس برس ہو چکے تھے جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں اُس وقت اسد جو کی عمر پچاس برس سے دو ایک سال اوپر ہی تھی مگر اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ سرخ و سفید رنگ، اونچا لمبا چوڑے شانے، گنجان سیاہ بھونٹیں، تیز چمکدار عقاب آنکھیں۔ ڈارھی صفا چٹ، رعب دار بھری بھری مونچھیں چوڑے کانوں کی سرخ لویں، گویا ابھی خون ٹپک پڑے۔ پاؤں میں پمپ شو اور کبھی پٹاوری چل ہوتی۔ شلوار قمیض کے اوپر صدر کی پہن کر دھتہ یا مثال اوڑھ لیتا۔ سر پر روس کے قازقوں والی جبت دار سمور کی ٹوپی چوزے رخ پہنتا تھا۔ دور سے یوں لگتا جیسے زار روس کی فوج کا کوئی پرانا تاتاری سپاہی چلا آ رہا ہے۔ آواز گرفت اور پاٹھ دار تھی۔ کبھی کبھی سردیوں میں پہلی جنگ عظیم کے فوجیوں کی برانڈی سے مٹی ہوئی جیکٹ پہن کر نیچے فلائین کا گرم پاجامہ پہن لیتا۔ گریٹ بالکل نہ ہیتا تھا۔ مگر حقے کا بڑا رسیا تھا۔ ہر لیے کی دکان پر نہ ہر وقت منہ می لگی رہتی۔ تمباکو نے دانت خراب کر دیئے تھے۔ سر درمیان ہی سے گنجہ تھا۔ ارد گرد کے بالوں اور مونچھوں میں کبھی کبھی سفیدی بھلکنے لگی تھی۔

سردیوں میں جس بوسیدہ دکان میں وہ ہرلیہ بیچتا وہ ہمارے محلے میں پکی لگی کے سامنے تھی۔ دکان کے باہر ایک پرانا رنگ خوروہ بورڈ لگا تھا جس پر فارسی کا یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

یک پاؤ ہرلیہ صبح گاہی

بہتر از ہزار مرغ و قافہ

ہرلیہ بنانے میں اُس کا شہر میں کوئی جواب نہیں تھا۔ اُس کی دکان بڑی گندی اور گھٹی ہوئی تھی۔ چھت کی کڑیوں پر دھوئیں کی کالک جی مٹی اور جالے لٹک رہے تھے۔ کونے میں پانی کے دو منگے تھنڈا کس پڑے رہتے۔ دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں اور جانے کس شے کی پٹلیاں لٹکی رہیں اندر داخل ہوتے ہی بائیں طرف دیرھ فٹ اونچا اور کوئی چھ سات مربع فٹ چوڑا چبوترہ تھا جس کے کناروں کی اینٹیں اکھری ہوئی تھیں۔ اس چبوترے کے بیچ میں مٹی کا بڑا سامٹ گڑھا تھا جس کا

چوترے کی سطح کے برابر تھانیچے بھنی تھی۔ اس مٹ میں جانے لگتے میر بکرے کا گوشت چنے کی دال اور انواع و اقسام کے مسالے ڈال کر اسد جو بھنی کی ہلکی ہلکی آنچ پر رات بھر بڑے سے ڈنڈے سے گھوٹتا رہتا رات کے پچھلے پہر ہر لیبہ پک کر تیار ہو جاتا اور اذان کے وقت گاہک آنا شروع ہو جاتے۔ اسد جو پو پھٹے کی ٹھٹھرتی سردی میں دکان کے پٹ جوڑے دھواں بھری دکان اندر گرم حمام بنی ہوتی۔ اسد جو آستینیں چڑھائے کفگیر سے جھک کر مٹ میں سے ہر لیبہ نکال کر فرائی پین میں اور ک ڈال گھی کا تڑکا لگاتا اور گاہک کے برتن میں پٹ کر اوپر دو کباب رکھتا اور گرم مسالے کی چٹکی چھڑک دیتا۔ اکثر گاہک اپنا گھی ساتھ لاتے۔ میں بھی منہ اندھیرے کا کامدو کی دکان سے گرم گرم قلیچہ لے کر پیالی میں گھی لئے اسد جو کی دکان پر پہنچ جاتا سردی سے میرے دانت بچ رہے ہوتے۔ لیکن اسد جو کی دکان کا پٹ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے کندھوں کے اوپر گرم لوئی ڈال دی ہو۔ د بکتی انگلیٹھی کے آگے بیٹھے اسد جو کا چہرہ سرخ ہو کر پسینے میں جھک رہا ہوتا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کبابوں کے دیگے پر صافی پھیر کر کہتا۔

”اگلی میری چھوٹی خلیفہ جی“

دکان کی چھت دھوئیں کے بادلوں میں چھپی ہوتی اور اندر گرم مسالوں کی تیز مہک پھیلی ہوتی۔ میری آنکھوں میں پانی آ جاتا اور تھوڑی ہی دیر بعد مجھے گرمی لگنے لگتی۔ لیکن اباجی کا حکم تھا کہ منکے سے نکال کر جب ہر لیبہ سرد ہوا میں گھرا لیا جاتا ہے تو اس کا اثر اڑ جاتا ہے۔ وہ خود اکھاڑے سے لڑتے ہوئے وہیں بیٹھ کر ہر لیبہ کھاتے تھے۔ اسد جو میرے لئے ہر لیبہ نکال کر فرائی پین میں اُسے گھی کا تڑکا لگاتا پھر میرے پیالے میں ڈال اُس پر دو کباب رکھ کر گرم مصالحے کی ہوائی چھوڑتا اور مجھے بٹھا کر کہتا۔

”مینو کھانڈی تے جان بنا ونڈی چھوٹی خلیفہ جی“

چوترے میں دھننے بھاپ چھوڑتے ہر لیے سے بھرے ہوئے مٹ کے آگے بیٹھا، بڑی بڑی مونچھوں اور لپینہ بھرے سرخ و سپید چہرے اور چوڑے شانوں والا اسد جو بڑی گرم جوشی سے ہر لیبہ نکال کر فرائی پین میں ڈال رہا ہوتا لاشین کی روشنی میں اس کا بھوت نما سایہ عقی دیوار پر لہرا رہا ہوتا اور مجھے یوں لگتا جیسے وہ کوئی الف لیلا کا جین ہے جو بھوتوں کو کھانا کھلا رہا ہے

ہر لیبہ کھا کر جب میں دھواں بھری بند دکان کی گرم فضا سے باہر نکلتا تو دسمبر جنوری کی یخ بستہ سردی میں بھی مجھے لپینہ آ رہا ہوتا۔

سورج نکلنے سے پہلے اسد جو کا سارا ہر لیبہ ختم ہو جاتا۔ پھر وہ اپنے لئے رکھی ہوئی ہر لیبہ کی تیلی ٹوٹی الماری میں سے نکال کر اُسے کم از کم تین چھٹانک گھی کا تڑکا لگاتا اور تین چار قلیچوں کے ساتھ ڈٹ کر کھاتا اس کے بعد وہ بوہڑ والی مسجد میں جا کر صبح کی نماز ادا کرتا اور مسجد کے حجرے میں لوئی اور ڈھکڑ سو جاتا۔ پھر میں سکول سے واپس آتا تو اسد جو کو شاد سنار کی دکان پر سدا دیا جھٹے دیکھتا۔ شاد سنار کی دکان پر پڑھے لکھے اور با ذوق لوگوں کی ایک منڈلی اگر بیٹھا کرتی تھی دن میں گورے چٹے بھاری بدن اور بڑے خوبصورت سہوار موتیوں ایسے دانتوں والا بابو محمد حسین بٹ تھا۔ جو ریوے میں ملازم بٹھا صاحب کے گھر میں انگریزی پڑھنے جایا کرتا تھا۔ میں مجھے بھول جاتا تو میرا کان مروڑ کر غصے میں کہتے۔

”کیا جھک مار رہے ہو“

”جھک“ کے لفظ کو وہ پنجابی میں ”چہنچ“ کہتے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے جب وہ یہ لفظ ادا کرتے تو مجھے یوں لگتا جیسے اُن کے منہ میں جھاگ بھرا ہوا ہے۔ وہ ہمارے مکان کے سامنے والی مسجد کے مقابلے میں نہانے آیا کرتے تھے۔ وضو کرنے والی ٹوٹیوں کے آگے کھڑے پر بیٹھ کر پسے تو مسواک کرتے۔ پھر کالی نوس ٹوٹہ پیٹ سے خوب جھاگ نکال نکال کر دانتوں کو صاف کرتے۔ وہ دانتوں کی صفائی اور صحت کا بے حد خیال رکھا کرتے تھے۔ آج کل غالباً وہ ملتان کے ریوے آفس میں ہیں۔ سنا ہے کہ اُن کے سارے دانت جھڑ گئے ہیں۔ ایک روز ماسٹر رفیق نعت خواں جیسے اپنا رنگ گورا کرنے کا بڑا شوق تھا۔ سقاوے میں نہارا تھا اور باہر نکلتے کام نہیں لیتا تھا۔ بٹ صاحب تو لبہ کندھے پر ڈالے کھڑے کھڑے بے چین ہو رہے تھے۔ جب ماسٹر رفیق قیسری بار صابن لگانے لگا تو بٹ صاحب نے جھجھکا کر کہا۔

”ماسٹر رفیق اگر تم شملے میں اس طرح پانی صانع کرتے تو تم پر حکومت ٹیکس لگا دیتی۔“

بٹ صاحب کو کلاسیکی موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا۔ شاد کی دکان پر تر کی ٹوپی والے

مرتبجاں مرنج شریف النفس بابو سید احمد بھی آیا کرتے دتین کہانیاں انگریزی میں ٹائپ کر کے بھی بھجوا رکھی تھیں جبکہ کوئی جواب نہ آیا تھا۔ غالباً ضلع کچہری میں سٹیٹو گرام تھے شادی نہیں کی تھی۔ بیوہ بہن کے بچوں کی پرورش کر رہے تھے۔ بڑی شائستگی سے باتیں کرتے فسادات میں جب سکھوں نے کراپاتیں سونت کر ان کے گھر پر حملہ کیا تو بابو سید احمد ہاتھوں پر ان کے وار روکتے رہے۔ ان کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کٹ گئیں اور کنپٹی سے لے کر کان کی ٹوک ایک گہرا زخم آیا اس خوش ذوق منڈلی کا تیسرا رکن ایک ہندو تھا۔ جس کو یہ لوگ دت صاحب کے نام سے پکارتے تھے۔ رات بھی گورا چٹا، بھرے بھرے جسم والا ہندو لالہ تھا جس کے اوپر والے چار دانت ذرا اونچے تھے جو بات کرتے ہوئے صاف نظر آتے۔ ایک دانت پر سونا چڑھا تھا یہ شخص پکا راگ گاہی لیتا تھا۔ کمالا جھریا اور استاد عبدالکریم خان کا عاشق تھا۔ شاید بچے والے کھوہ سے اپنے دوستوں کو ملنے شاد سنار کی دکان پر آیا کرتا۔

شاد سنار خود بڑا خوش ذوق، مرتبجاں مرنج اور کم گوانسان تھا۔ حقہ بہت پیتا تھا۔ لالہ میں جڑے ہوئے سونے کی چھلانی کر رہا ہوا اخبار پڑھ رہا ہو۔ حقے کی منہ میں دبی رہتی۔ تمباکو والے پان درجنوں کے حساب سے کھاتا تھا۔ سامنے اللہ بندے پان دلے کی دکان تھی۔ اللہ بندہ پان سگریٹ بھی بیچتا اور گود میں رکھے لکڑی کے تختے پر ڈرائنگ کا غد چپکائے پنسل سے انا ترک کی تصویر بھی بنا رہا ہوتا۔ کام کرتے کرتے حقے کی نئے ہٹا کر شاد سنار آواز دیتا۔

”لاؤ یار اللہ بندے پان ہی کھلا دو“

اسد جو ان خوش ذوق خوش مزاج لوگوں کی منڈلی کا ایک اہم جزو تھا۔ یہ لوگ عام طور پر تیسرے پر شاد، دکان پر جمع ہو جاتے زیوروں سے بھری ہوئی چھت تک گئی لوہے کی الماری کے آگے بچھی ہوئی چاندنی پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے شاد پان منہ میں دبائے حقہ پی رہا ہوتا۔ قریب ہی بابو محمد حسین بٹ بابو سید احمد اور دت بیٹھے بڑی گرم جوشی سے مہنس مہنس کراپاتیں کر رہے ہوتے کسی وقت دت ہاتھ کا نرت کر کے کوئی تان اڑا دیتا اور سمجھوں کے سر جھوم جاتے آہنی الماری نے پہلو میں اسد جو چوکی پر بیٹھا سمادار کو خوب چپکا کر اس میں چائے کی پتی ڈال کر آگ سا رہا ہوتا۔ جب چائے پک جاتی تو سب مل کر بڑے شوق سے پیتے برسات ہو

گرمی ہو یا پالا پڑ رہا ہو۔ یہ خوش ذوق منڈلی تیسرے پر شاد سنار کی دکان پر ضرور اپنی محفل جاتی۔ کبھی کبھی میں بھی بازار میں چورس پاسی کھیلنے کھیلنے ان لوگوں کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا۔ مجھے ان کی باتیں یاد نہیں لیکن ان کے باتیں کرتے ہنستے مسکراتے، قہقہے لگاتے، تانیں اڑاتے اور کسی تان پر جھوم جھوم کر سر ہلاتے چہرے ضرور یاد ہیں۔ چائے کی پیالیاں ان کے ہاتھوں میں ہوتیں۔ آنکھیں چائے کی گرمی اور گفتگو کی مسرت سے چمک رہی ہوتیں۔ اسد جو بھی پیالی ہاتھ میں تھا بڑی عقیقت سے ان لوگوں کی باتیں سن رہا ہوتا۔ وہ ان کی باتوں میں حصہ نہیں لیتا تھا مگر ان کی ہر بات پر سر ضرور ہلا دیتا تھا۔ شام پڑے جب یہ محفل برخاست ہو جاتی تو شاد سنار الماری میں زیورات بند کرنے شروع کر دیتا اسد جو دکان کے پھٹے پر ایک طرف بیٹھ کر سمادار میں سے چائے کی گیلی پتی نکال کر نیچے پھینکتا۔ پھر اسے راکھ سے مانجھ کر خوب چمکاتا اور دھلی دھلائی پیالیوں کے ساتھ آگے روز کے لئے الماری میں بند کر دیتا۔

عید میلاد النبی کے جلوس میں اسد جو اپنی تاتاری ٹوپی میں چاند تارے کا تکرہ لگا سبز رنگ کا بالائی پرچم ہاتھوں میں تھام لیتا وہ جلوس کے آگے آگے عقابی آنکھیں بالکل سامنے گاڑے، چہرہ ساکت کئے، نئے تلے قدم اٹھائے جرنیلوں ایسی شان سے چل رہا ہوتا۔ اس کی مانگے کی برجس رانوں پر سے پھولی ہوتی۔ کمر میں چمڑے کی بیٹی کے ساتھ تنوار لٹک رہی ہوتی۔ گل مجھے پھڑک رہے ہوتے رخسار جوش اسلام سے تھمارہے ہوتے۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوتا اور بار بار اپنا منہ اوپر اٹھا کر اسد جو کے مونچھوں بھرے لال لال چہرے کو دیکھا کرتا مجھے وہ کوئی سپر سالار لگتا جو اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ دشمنوں پر دھاوا بولنے جا رہا ہو۔ ایک بار میں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے ہلایا تو اسد جو نے نظریں سامنے رکھے بائیں مونچھ کو پھیر پھرا کر اتنی زور سے ”ہوں ہوں“ کہا کہ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

محفلے میں کوئی بیاہ شادی ہوتی تو اسد جو کو شوربے کی دیگ پر بٹھلایا جاتا کیا مجال جو کسی کے پیالے میں مقدار سے بڑھ کر شوربہ چلا جائے یا ایک بولی بھی فالتو پڑ جائے۔ اسد جو آستین چڑھائے ذرا ترچی رکھی شوربے کی دیگ کے آگے پیڑھی پر بیٹھا ہوتا بڑا چمچ اسکے ہاتھ میں ہوتا۔ بڑے پختے انداز میں پیالیاں شوربے سے بھرے جاتا۔ کوئی اچھی بولی دیکھائی دیتی تو اسے سب کے

سامنے منہ میں ڈال لیتا اور رومال سے مونچھیں پونچھ کر کہتا۔
 "اس تے میرا فہر لگا ہو یا سی"

کسی روز وہ ہر سیدہ بیچ کی دکان بڑھانے کے بعد بڑے کاکا کے تنور پر آجاتا۔ تنور کے پاس
 ہی بازار کے رخ پر سجھے ہوئے پرانے تخت پوش پر وہ ٹانگوں پر لونی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ محلے
 کے بچے اور بچیاں اُس کے آگے رومال بچھا دیتیں۔ کاکا تنور سے گرم گرم تافتا لے کر دے اور
 قلعے نکال نکال کر اسد جو کے آگے پھینکے جاتا اور اسد جو گاہکوں کو نمٹائے جاتا کوئی بھی شور مچاتی۔
 "اسد جو پہلے مجھے دو۔ پہلے میں آئی تھی"

اسد جو مونچھوں کے پیچھے ہنستا اور بچی کے سر پر آہستہ سے دھوپ مار کر کہتا۔

"تینوں دی دے دیندی"

پھر وہ تنور پر رکھے حقے کی تے منہ میں ڈال کر اندر تکرڑی میں میدے کے پیرے تولتے ہوئے
 گانی کو آواز دیتا۔

"جلدی کرو دی سی جلدی گانی"

فسادات میں جب محلے میں ہر طرف بے چینی پھیلی ہوئی تھی اسد جو کاکا سمار و ضرور گرم ہوتا
 تھا۔ پھر فسادات زیادہ شدت اختیار کر گئے۔ شاد سنار کی دکان پر تالہ پڑھ گیا۔ وہ ہندو علاقے سے
 ہمارے محلے میں آتا تھا۔ دت نے بھی آنا بند کر دیا۔ شاد کی دکان پر سجنے والی زندہ دل محفلیں آجرائیں
 اسد جو سمار لے کر اپنی بوسیدہ چھت والی دکان میں چلا گیا۔ اُس نے امیر اکمل چلے جانے کی گوش
 کی لیکن فسادات کی آگ راستے میں دیوار کئے کھڑی تھی۔ سارا محلہ ویران ہو گیا۔ چاروں طرف آگئیں بھڑک
 اٹھیں۔ چوک چوک میں قتل و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ اسد جو لگی کے بند دروازے پر ساری ساری رات
 پہرہ دیتا۔ ہمارے ساتھ وہ بھی لگی میں بند ہو گیا تھا۔ کرفیو لگی و بشت زدہ راتوں میں دُور سے غرض
 کی آوازیں اور گولیوں کی ٹھانیں ٹھانیں سنائی دیا کرتیں۔ ایک رات میں لگی میں ہی اپنی خالہ کے
 مکان سے نکل کر اپنے مکان کی طرف جا رہا تھا کہ میں نے چاچا قادری شال ہات کی دکان کے
 پھٹے پر اسد جو کو بیٹھے دیکھا۔ مجھے ہوئے سمار پر ایک ہاتھ رکھے وہ دکان کے بند دروازے
 سے ٹیک لگائے کھوئی کھوئی آنکھوں سے غلامیں تک رہا تھا۔ فضا میں تڑا تڑا فائر کی آوازیں

گونج رہی تھیں مجھے یوں لگا جیسے اداس اور غلگین اسد جو۔ اکیلا اور بے یار و مددگار اسد جو۔
 اپنی بادام کے ٹکڑوں سے لدی ہوئی دادیوں، اپنے ہنستے مسکراتے دوستوں اور اُن کی پرجوش محفلوں
 کی سوگوار یاد میں گم ہے۔ چائے کی پیالی خالی چھوڑ کر محفل سے اٹھ کر چلے جاتے والوں اور مجھ بھی
 واپس نہ آنے والوں کے قدموں کے نشان کو ویران نگاہوں سے تک رہا ہے۔

اس کے بعد میں نے اسد جو کو پھر نہ دیکھا۔ کبھی کبھی دل میں ایک امنگ سی پیدا ہوتی
 ہے کہ کہیں سے اسد جو کو دھونڈ کر لاؤں۔ اُسے اُس کے پیاری پیاری صورتوں والے دوستوں میں
 لاکر بٹھا دوں اور کہوں اے اچھے لوگو! اچھی اچھی باتیں کرو۔

اے اسد جو سمار میں چائے کی پتی ڈال دے۔ اور جب کھولتی چائے خوشبودار دینے لگے
 تو ایک پیالی مجھے بھی دینا۔

لیکن اسد جو کھو گیا ہے۔ اُس کا سمار کھو گیا ہے۔

امرتسر کا ایک گیت کیپر

آج میں آپ کو امرتسر کے ایک گیت کیپر کی کہانی سناتا ہوں۔

یہ کہانی امرت ٹاکنز سے شروع ہو کر لاہور کی فلمنگ روڈ اور لاہور ہوٹل کے ارد گرد اگر ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے اس دردناک کہانی کے اجزائے ترکیبی کو امرت ٹاکنز میں مرتب ہوتے پرچہ چڑھتے، پھلتے پھولتے دیکھا اور پھر لاہور ہوٹل اور فلمنگ روڈ کے گلی کوچوں میں ان اجزائے پر خچے اڑتے دیکھے۔ انہیں خاک و خون میں غلطاں دیکھا۔ میں اس کہانی کو امرتسر کے ایک پرانے سینما گھر امرت ٹاکنز سے شروع کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ شعلہ جواب راگھو بن چکا ہے پہلے پہل اسی آتش کدے سے اٹھا تھا۔

ہال بازار امرتسر میں ایک بازار چوک گول مٹی سے پھم والے بازار کی طرف مڑتا تھا۔ اسے کٹرہ کہنیا لعل کہتے تھے۔ کٹرہ کہنیا لعل کے چوباروں میں طوائف بیٹھا کرتی تھیں۔ دن بھر اس بازار کے لکڑی کے چھبے دار مکانوں کی کھڑکیوں پر چھپ چھپ رہی رہتیں۔ شام ہوتے ہی بازار کی رونق شروع ہو جاتی چلیں اوپر اٹھ جاتی کھڑکیوں میں کہیں بجلی کے قمقمے اور کہیں لالٹیں روشن ہو جاتیں اور ان کی روشنی میں طوائف خوب بن سنور کر، سچ دھج کر سُرخ پاؤڈر تھوپے چوکیوں یا کرسیوں پر اگر بیٹھ جاتیں وہ بت بنی شوکیوں میں رکھے ہوئے بکاؤ مال کی طرح چپ چاپ بیٹھی رہتیں۔ کبھی گردن پھیر کر نیچے بازار میں آواز سے کہنے والے تماشینوں کو دیکھتیں ذرا سا مسکراتیں اور پھر بت بن کر بیٹھ جاتیں۔ کوئی پان چار ہی ہوتی۔ کوئی سگریٹ پی رہی ہوتی۔ جس وقت کوئی طوائف اچانک اٹھ کر کھڑکی سے غائب ہو جاتی تو اس کا مطلب ہوتا کہ کوٹھے پر تماش بین آگیا ہے۔ یہ تماش بین منہ سر چھپا کر کوٹھے کی اندھیری سیڑھیاں اوپر چڑھ جاتے اور تھوڑی دیر بعد جب

منہ سر چھپانے نیچے اتر کر بازار کے ہجوم میں گم ہو جاتا تو کوٹھے والی طوائف دوبارہ پاؤڈر سُرخ تھوپے کھڑکی میں آکر بیٹھ جاتی۔ بڑی بیٹھک۔ روڑیاں والی گلی کے سامنے اسی بازار میں تھی۔ گوری چٹی، بڑا خوبصورت جسم سنہری بال اور نیلی نیلی نیشیلی آنکھیں۔ اُس کی بیٹھک کے نیچے اکثر تماش بینوں کا ہجوم رہتا اور عید میلاد کی پر تو بڑو کو سر کھانے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ میں اُن دنوں ساتویں یا آٹھویں جماعت پڑھتا کرتا تھا اور ایم اے او سکول جاتے یا آتے ہوئے میں منہ اوپر اٹھا کر بڑو کو ضرور دیکھ لیا کرتا بڑو دن کو بھی بن سنور کر کھڑکی میں بیٹھا کرتی۔ مجھے وہ نیلی آنکھوں والی رومن شہزادی لگتی ہے جو اپنے سنہری بال کھوئے۔ شاہی بھرے میں بڑی تمکنت سے بیٹھی دریائے نیل کے پرسکون پانیوں پر سیر کر رہی ہو اُس کی ناک میں فیروزی ننھا سا لکینہ دن کو دھوپ میں اور رات کو بجلی کی روشنی میں دمک رہا ہوتا۔ بلاشبہ بڑو کٹرہ کہنیا لعل کی سب سے نازک اندام اور حسین طوائف تھی۔ پاکستان بننے کے کچھ ہی سال بعد میں نے اس رومن شہزادی کو ہیرا مندھی کی ایک گلی میں دیکھا کہ اُس کا شاہی بھرائٹ چکا تھا۔ محل کی زرنگار خواب گاہوں میں آگ لگ چکی تھی سنہری بالوں میں سفید رکھاڑ رہی تھی۔ گورا چہرہ سوکھے ہوئے پرانے چمڑے کی طرز سکڑ گیا تھا۔ اور وہ آنکھیں جو کبھی نیلی اور شفاف ہوا کرتی تھیں اب گندے جوہر کے زنگار لگے پتھر کی طرح ہو گئی تھیں۔ عیاشی کے شعلوں نے اُس کے جسم کے آتش دان کو وقت سے پہلے جلا کر رکھ کر دیا تھا۔ اب یہ آتش دان ٹھنڈا تھا۔ اُس کی اکھڑی ہوئی اینٹوں میں بھی ہوئی سرد رکھ تھی اور دیوار پر دھوئیں کے جالے لٹک رہے تھے۔

مختار بیگم عرف دار کی امرتسر والی کی بیٹھک بھی اسی بازار میں تھی۔ یہ بیٹھک فرینڈز ہوٹل سے ایک مکان چھوڑ کر تھی۔ یہی وہ چوبارا تھا جہاں آغا حشر کاشمیری کی محفلیں گرم ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اُن دنوں آغا حشر غالباً کھلتے جاچکے تھے۔ دار کی امرتسر والی کی بیٹھک کے بغل میں امرت ٹاکنز تھی۔ سامنے بوڑا اور دانے دار کھانڈ بتا شے اور کھانڈ کے کھلونے بناتے والوں کی دکانیں تھیں۔ ذرا پرے "لاہوریاں دی ہٹی" تھی یہ ایک ہوٹل تھا اس ہوٹل کے باہر ایک اونچا لمبا شیشے کا شوکیں تھا جس میں کرسن فادر کی شکل کا ایک بوڑھا ہاتھ میں سُرخ سوڈا واٹر کی بوتلی اور گلاس لئے کھڑا رہتا اس کے اندر کچھ ایسے کل پُر زور لگے تھے کہ بار بار

اُس کا بوتل والا ہاتھ لگا کس کی طرف جاتا اور پھر واپس آجاتا۔ ہم سکول آتے جاتے اس کمرہ سے
 فادر کو بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ بیساکھی پر جب باہر سے دیہاتی سکھ آتے تو یہاں
 ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ میں نے کئی بار اس بوتل میں دوستوں کے ساتھ گدے دار اونچی اونچی
 کرسیوں پر بیٹھ کر سوڈا واٹر اور ٹیک پیا اور سنگ مرمر کی گول گول ٹھنڈی میزوں پر
 بانہیں ڈکا کر قبضے لگاتے ہیں۔ کونے میں شوکیس کے پاس کاؤنٹر پر بیٹھا ایک موٹا لالہ سنگل
 کانن، جو تھیکا رائے اور مکلا جھریا کے ریکارڈ بجا کرتا۔

ہم بالم آئے بسو میرے من میں
 اور پھر مکلا جھریا کی گائی ہوئی مشہور غزل

مجھے جس دم خیال نرگس ستانہ آتا ہے
 صراحی جو ممتی ہے وجد میں پیمانہ آتا ہے

ان دنوں یہ ریکارڈ بے حد مقبول تھے اور لوگ انہیں سن سن کر سر دھنا کرتے تھے ہاں۔
 تو میں امرت ٹاکیز کی بات کر رہا تھا جو اسی بازار میں تھی۔ امرت سر کا یہ سب سے پرانا سینما ہال
 تھا۔ سینما ہال کیا تھا بس ریل کا ایک لمبا چوڑا ڈبہ تھا جس کے آخر میں جا کر پردہ لگا تھا۔ اُس
 کی مشین کے چلنے کی آواز باہر بازار تک آیا کرتی اور ہم اکثر فلموں کے گانے اور مکالمے
 بازار میں کھڑے ہو کر سن لیا کرتے تھے۔ پرکاش فلم کی پاسنگ شو واڈیا مودی ٹون کی ہنٹر
 والی جس کی پہلوان بیروٹین مس ناڈیا برہمن میں ڈنٹر ضرور پلٹی دکھانی جاتی تھی۔ ماسٹر شیراز کی
 چلتا پرتھ۔ ہر شہنشاہ۔ جیتی نشانی۔ ایک دن کی بادشاہت اور چار حصوں پر مشتمل فلم حاتم طائی
 فلم شام چھ بجے شروع ہوئی اور ساری رات چلتی رہی۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ
 آنے والی تھرڈ کلاس کے بیچ پر انڈوں بیٹھا بت بنا حاتم طائی کو جنات کا مقابلہ کرتے
 کوہ ندا میں کالی بکاسے لڑتے اور "یا اللہ مدد" کا نعرہ لگا کر دریا کا آگ عبور کرتے دیکھتا رہا
 جب فلم ختم ہوئی تو امرت سر شہر پر صبح صادق کی جھلکیاں نمودار ہو رہی تھیں اور سینما کے گیٹ
 کے باہر والد صاحب ہنٹر لیے ہم دونوں بھائیوں کے انتظار میں بڑی گر محووشی سے ہنٹر
 کو بار بار ہوائیں شڑاپ شڑاپ کی آوازوں کے ساتھ لہرا رہے تھے۔

امرت ٹاکیز کے سینما ہال میں پاپڑ اور مسالے دار چٹوں کی تیز مہک ہر دم پھیل رہتی نہرول
 میں پھری والے لڑکے پاپڑ مسالے دار چھوئے، کڑیاں والے اور پان سگریٹ کا اس قدر شور
 مچاتے کہ ہم تھرڈ کلاس میں بیٹھے اپنے ساتھیوں سے چیخ چیخ کر اور بعض اوقات صرف اشاروں
 میں ہی باتیں کرتے۔ امرت ٹاکیز کا انٹرول کا عرصہ گزارنا دریاے شور عبور کرنے کے برابر تھا۔
 امرت ٹاکیز کی ڈیوڑھی میں دونوں جانب دیواروں پر چالو فلم اور آئینوالی فلموں کے فوٹو چھٹوں
 میں لگے رہتے۔ ہم ان تصویروں کو بڑے شوق سے دیکھا کرتے اور پھر شام کو یا دوپہر کو گھر سے
 پیسے چرا کر اور یا بہنوں سے چھین کر فلم دیکھنے آجاتے۔ واپسی پر ہنٹر سے خوب ٹھکانی ہوتی مگر
 لگے روز پھر سینما ہال کی تھرڈ کلاس میں موجود ہوتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار سینما ہال میں بڑا رش
 تھا اور میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ سیٹج پر لیٹ کر فلم دیکھی تھی۔ ایک بار اسی سینما ہال
 میں ملکہ ترم نور جہاں نے جوان دنوں بے بی نور جہاں تھی سیٹج پر زندہ ناز گانا کیا تھا۔ یہ ناز گانا ہی
 نے آگ بجھانے والی لال لال بالٹیوں کے پاس ایک کھڈے میں بیٹھ کر دیکھا تھا۔

جب جس غم نصیب گیٹ کیپر کی میں کہانی سنانے والا ہوں وہ اسی امرت ٹاکیز کے مین
 گیٹ کا گیٹ کیپر تھا۔ بازار سے سینما کی چوڑی اور ریل کے ڈبے ایسی ڈیوڑھی میں داخل ہوں تو اُس
 کے اخیر میں لکڑی کا ایک جنگلہ آجاتا تھا یہ جنگلہ سینما کا پہلا دروازہ تھا۔ یہاں سے سامنے سینما کے
 کیبن جہاں مشین لگی تھیں دکھائی دیتے تھے۔ یہاں سے ٹکٹ کٹوا کر گویا آپ سینما کے باقاعدہ تماشائی
 کی حیثیت سے سینما کے برآمدوں میں سے گزر کر ٹکٹ کے مطابق اپنی کلاس میں داخل ہو سکتے
 تھے۔ لکڑی کے اس جنگلہ ناگیٹ پر ایک گیٹ کیپر لوہے کی کالی کرسی پر بیٹھا رہتا۔ تیس بتیس
 کی عمر کالی اچکن، کالے پپ شو، سفید لٹھے کی بے داغ شلوار، سر پر سرخ مخرومی ترکی ٹوپی لکڑی
 چہرے پر بڑے ہلکے ہلکے چپک کے داغ، پُر سکون دھیمی دھیمی شرتی آنکھیں تیکھا ساناک نقشہ ذرا
 لمبوتر چہرہ، دُبل پتل مناسب قد کاٹھ۔ میں نے اُسے کبھی مسکراتے یا کسی سے بات کرتے نہیں
 دیکھا تھا۔ میں لکڑی کے جنگلے پر ایک طرف چڑھ کر کھڑا ہو جاتا اور سینما ہال میں داخل ہونے والوں
 کو کتے جاتے دیکھتا رہتا۔ مجھے اور میرے دوستوں کو یہ شوق ہوتا کہ اگر پوری فلم دیکھنے کے لیے
 نہیں تو کم از کم اُس کا ایک آدھ سین ہی مفت میں دیکھ لیں۔ کیونکہ سینما والے کبھی کبھی چلتی فلم

میں ہال کا سامنے والا فسٹ کلاس کا دروازہ لوگوں کی آتش شوق کو بھڑکانے کے لیے چوڑا کھول دیا کرتے تھے۔ یہ دروازہ دو ایک منٹ کے لئے کھلا رہتا اور پھر بند کر دیا جاتا عام طور پر یہ دروازہ فلم کے کسی مارکٹائی والے سین پر کھلا کرتا۔

ترکی ٹوپی والے اچکن پوش گیٹ کیپر نے ہمارے جنگے پر کھڑے ہونے پر کبھی اعتراض نہ کیا تھا۔ وہ تو کسی سے بات ہی نہیں کرتا تھا۔ فلم دیکھنے والوں کا ٹکٹ لے کر کاٹتا۔ آدھا نہیں دیتا۔ آدھا لکڑی کی صندوقچی میں ڈال دیتا اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھا رہتا۔ جب کبھی رش ہوتا تو وہ اٹھ کر گیٹ کے پاس کھڑا ہو جاتا اور نظریں جھکائے جلدی جلدی ٹکٹ کاٹ کر لوگوں کو گزارے جاتا۔ کسی وقت مشین مین کیبن سے اُسے کوئی آواز دیتا تو وہ ہاتھ ہلا کر اُسے کوئی اشارہ کرتا اور پھر اپنے کام میں لگن ہو جاتا۔ امرت ٹائیز کا مالک ادھیڑ عمر کا ڈارھی مونچھ صاف چٹ ایک ہندو لالہ امرت لعل تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے شراب کے بلکے بلکے نشے میں رہتا۔ دبلا ڈھیلا ڈھالا زرد چہرہ سر پر گول بند والی کالی ٹوپی دھوتی، بوسکی کی قمیض اور سیاہ پمپ میں وہ جھومتا جھامتا مسکراتا ہوا سینما ہال میں ادھر سے ادھر منڈ لایا کرتا۔ دو تین خوش پوش آدمی مزور اُس کے گے پیچھے ہوتے تھے۔ ایک بار میزے سامنے یہ ہندو لالہ جنگلے کے پاس اکر ٹک گیا۔ گیٹ کیپر نے اس کی کرسی پر سے احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالے نے اپنی خمار آلود پلکیں اٹھائیں اور گیٹ کیپر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”شاہ جی! کبھی مجھ ہی کوئی بات کر لیا کرو۔ کوئی تکلیف تو نہیں؟“

گیٹ کیپر نے نظریں جھکائے جھکائے مسکرا کر آہستہ سے کہا۔

”آپ کی نبرانی ہے لالہ جی۔“

اُس روز مجھے معلوم ہوا کہ گیٹ کیپر کو شاہ جی کہتے ہیں اور اُس کی آواز باریک ہے اور یہ کہ وہ بولتا بھی ہے۔ اور مسکراتا بھی ہے۔ کبھی کبھی دوپہر کو ایک میلے سے سفید برقعے والی بوڑھی عورت جنگلے کے پاس اکر کھڑی ہو جاتی گیٹ کیپر روٹی کا ڈبہ لے کر صندوقچی کے قریب ہی رکھ لیتا۔ کچی محبت سے اس کے ساتھ اکر لگ جاتی۔ وہ کچی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتا اور اچکن کی جیب سے ایڈورڈ کے زمانے کا تانبے کا پیسہ نکال کر دیتا۔ کچی خوشی سے پھولی نہ

ساقی۔ گیٹ کیپر کچی کے ماتھے پر پیار کرتا۔ بوڑھی عورت اُس سے دو ایک باتیں کرتی جبکہ جواب وہ ہوں یا ہاں میں دیتا۔ جاتے ہوئے برقعہ پوش بوڑھی عورت گیٹ کیپر کے کندھے پر محبت سے ہاتھ پھیرتی اور دعائیں دیتی کچی کو ساتھ لے کر سینا مال کی ڈیوڑھی سے باہر نکل جاتی۔ میں سوچا کرتا کہ یہ عورت بوڑھی عورت گیٹ کیپر کی ماں ہے اور وہ کچی اس کی بیٹی ہے۔ حقیقت کیا تھا؟ یہ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ میں خود اُن دنوں بارہ چودہ برس کا تھا۔ میرے لئے زندگی کا بازار ابھی کھلا ہی تھا۔ ماہ و سال کے چوتروں پر لوگوں نے ابھی اپنی اپنی دکانیں سحانی شروع ہی کی تھیں۔ زندگی کا بھرپور طاقتور، تازہ اور پُر جوش خون میری رگوں میں اُگ بن کر دھک رہا تھا۔ اور میں بہار کی خوشبو بھری مست خوش فکر اور لا اُمالی ہوا کے جھونکے کی طرح امرتسر کے بازاروں، باغوں، نہروں اور کھیتوں میں اُڑتا پھیر رہا تھا۔ خالص دودھ مکھن گھی، ہوا اور امرتسری پانی کی طاقت میں بہن کی طرح چوڑی بھرتی نگاہ میں کوئی صورت نہ ٹھہرتی تھی۔ ہر لمحے، ہر پل نئے نئے ستارے طلوع ہو رہے تھے۔ لیکن کچھ لوگ، کچھ مناظر، کچھ ستارے ایسے تھے جنہوں نے اُس وقت میری توجہ اپنی طرف کھینچی اور جنہیں میں آج تک نہیں بھلا سکا۔ یہ گیٹ کیپر بھی انہی لوگوں، انہی مناظر اور اُن ہی دھیمے دھیمے چمکنے والے ستاروں میں سے تھا۔

روٹی کا ڈبہ صندوقچی کے پاس رکھ کر وہ ٹکٹ کاٹنے میں مصروف ہو جاتا۔ خدا جانے وہ کب روٹی کھاتا تھا؟ خدا جانے وہ روٹی کھاتا بھی کھاتا یا نہیں! میں نے اُسے کبھی کچھ کھاتے پیتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ سینا گھر کے دوسرے گیٹ کیپر سارا دن چرتے رہتے اور گالیاں بکتے رہتے۔ تھرڈ کلاس کے ٹکٹ دینے والے کی کھڑکی پر جب میں لوگوں کے سروں پر سے چھلانگیں لگا کر پہنچتا تو دیوار کے چورس سوراخ میں سے وہ مجھے ہمیشہ پا پڑ کھاتا دکھائی دیتا تھا۔ سبحان اللہ! امرتسر کے پا پڑوں کا بھی جواب نہیں تھا۔ مگر یہ اچکن پوش غاموش گیٹ کیپر کبھی کچھ نہ کھاتا تھا۔ میری اپنی کڑتے کی جیب گڑ والی ریوڑیوں سے بھری رہتی تھی میں گیٹ کے جنگلے پر چڑھا مزے مزے ریوڑیاں کھاتے چلتی فلم میں سینا مال کا دروازہ چوڑا کھلنے کا انتظار کیا کرتا۔ مجھ سے ذرا فاصلے پر غاموش گیٹ کیپر بوسے کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا اپنی نرم ہر سکون نگاہوں سے بازار کی طرف دیکھتا رہتا۔ اُس نے کبھی مجھ سے نہیں کہا

دوسرے سے ہنستے مذاق کرتے چل دیئے مجھے آج بھی گیٹ کپڑ کی ٹھکی ٹھکی آنکھیں، اُس کا انگلی کے اشارے سے ہمیں جانور کو مارنے سے روکنا اور پٹے کا اُس کی گود میں مزے سے بیٹھنا یاد ہے۔

زندگی کے سینما ہال میں وقت کی فلم بھی بڑی تیزی سے چلتی چلی گئی اور اُس کے پارٹ ایک ایک کر کے ختم ہوتے گئے۔ میں اُسی عمر میں ہندوستان کے دور دراز شہروں میں آوارہ گردی کو چل نکلا۔ جب کبھی امرتسر واپس آتا تو اُس خاموش گیٹ کپڑ کو اُسی طرح گیٹ کے پاس بوسہ کی کمرسی پر چپ چاپ بیٹھے کٹ کٹتے دیکھتا اور پھر کسی دور دراز شہر کی آوارہ گردی کو نکل جاتا دوسری جنگ عظیم میں میں برما میں پھنس گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو فسادات شروع ہو گئے۔ رام باغ اور کٹرہ کہنیا لعل کی طوائفین بھاگ کر دوسرے شہروں میں چلی گئیں یہاں زیادہ تر مکان اور دکانیں ہندوؤں کی ملکیت تھیں مسلمانوں نے انہیں آگ لگا دی۔ کٹرہ کہنیا لعل سارے کا سارا آگ کی لپیٹ میں آگیا۔ ایک روز کٹرہ کہنیا تو میں نے اس کٹرے میں سے گزرتے ہوئے امرت ٹاکنیز کو دیکھا۔ اُس کا سینما ہال جل کر خاک ہو گیا تھا۔ دیواروں کا ڈھانچہ کھرا تھا گیٹ بھی جل گیا تھا۔ مجھے خاموش گیٹ کپڑ کا خیال آگیا۔ خدا جانے فسادات کے اس فحش ہنگاموں میں وہ بے ضرور کم سخن انسان کہاں ہوگا۔ کیا وہ اُس کی بوڑھی ماں اور بھولی بھالی بچی سلامت ہوگی اُس کے تو اگر چہرہ بھی گھونپ دیا گیا تو وہ کسی کا ہاتھ نہیں روکے گا۔ کسی سے کچھ نہ کہے گا۔ بلکی سی آہ تک نہیں بھرے گا۔ اور چپ چاپ لگی یا بازار میں گر کر مر جائے گا۔

فسادات بھی ختم ہو گئے۔ ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ پاکستان بن گیا اور مہاجرین کے لئے پٹے قافلے آن دیکھی منزلوں کو چل پڑے۔ نئے وطن کی نئی سرگرمیوں اور نئے مسائل نے بہت کچھ وقتی طور پر بھلا دیا میں بھی امرت ٹاکنیز کے خاموش گیٹ کپڑ کو بھول گیا۔ چھ سات برس بعد اچانک میں نے اُس گیٹ کپڑ کو لاہور کے پلس سینما کے باہر دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ سر کے بالوں میں سفیدی آگئی تھی۔ اچکن۔ لٹھے کی صاف ستھری شلوار اور پمپ شو غائب ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں وہی دھما دھما درو اور سکوت تھا ہونٹوں پر لہر خاموش تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر سینما کے سامنے ہاتھ میں بیٹھی خطائیوں کا تھال لئے کھڑا تھا۔ سر پر میلی کپیلی رومی ٹوپی تھی اب میں اُسے کبھی کبھی لاہور کی سڑکوں یا سکولوں کے باہر بیٹھی خطائیاں بیچتے دیکھ لیتا کرتا۔ کئی بار دل چاہا

اُس کے پاس جا کر کوئی بات کروں۔ اُس سے اُسکی بوڑھی ماں اور بھولی بھالی بچی کی خیریت پوچھوں مگر جانے کیوں میں بھی چپ چاپ اُس کے قریب سے گزر جاتا۔ ہر بار جب وہ مجھے ملتا تو اُسکی حالت پہلے سے خراب ہوئی۔ کپڑے زیادہ میلے کچلے اور چہرہ میلے سے زیادہ زرد ہوتا۔ وہ خطائیوں کا تھال لئے سر جھکائے گیوں میں سے گزر جاتا۔ کوئی بچہ اُسے روکتا تو وہ دُک جاتا۔ پیسے در پیسے کا سودا بچے کو دیتا اور خاموشی سے اُسے گزر جاتا۔

پھر ایک روز میں نے اُسے خطائیوں کے تھال کے بغیر دیکھا۔ وہ مکانوں کے ساتھ ساتھ لگا کر جھکائے چلا رہا تھا۔ کسی وقت وہ گردن پھیر کر دائیں بائیں یوں دیکھتا جیسے اُس کی کوئی شے گم ہو گئی ہو۔ سر کے سفید بال اور ڈاڑھی بڑھ آئی تھی۔ رومی ٹوپی غائب تھی اور ٹوٹی ہوئی چل پاؤں کے ساتھ ساتھ گھسیٹ رہی تھی۔ مجھے اُس سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ یوں لگا گویا اُس کی تباہ حالی کا میں ذمے دار ہوں۔ وقت لاہور کی سڑکوں پر شور مچاتا مگر اُڑاتا بھاگتا اُڑتا چلا گیا۔ ایک دن میں نے اُسے ایبٹ روڈ پر دیکھا۔ اُس کے پاؤں سے چل غائب تھی۔ چہرہ مٹی کے رنگ کا ہو گیا تھا۔ پاجامے کا ایک پانچہ پھٹ گیا تھا۔ وہ کُڑے کے ایک ڈھیر پر جھکا ہوا تھا اور کاغذوں کے چھترے نکال نکال کر اپنے گندے کوٹ کی جیبوں میں بٹھول رہا تھا۔

اب میں نے فلیننگ روڈ پر ہالٹس اختیار کر لی تھی۔ دو ماہ بعد میں نے امرتسر کے اس بے زبان گیٹ کپڑ کو لاہور ہوٹل کے پاس بیٹھے کاغذ نکال نکال کر جیبوں میں بھرتے دیکھا۔ اس کی حالت انتہائی خستہ ہو چکی تھی۔ لمبے لمبے سفید بالوں میں لاہور کے ہر بازار ہر گلی کو پچے کی مٹی بھری تھی ڈاڑھی مونچھوں کے خاکستری بالوں میں زرد مٹی رنگ کا سوجھا ہوا بے جان چہرہ پتھر کی طرح ساکت تھا۔ سفید آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ پاس ہی گندے مندے کاغذوں سے بھری ہوئی گانتھ رکھی تھی۔ وہ کوڑا کرکٹ بھی گریڈ رہا تھا اور اونگھ بھی رہا تھا۔

میں نے آخری بار اُسے اُسی بازار میں ایک مسجد کے باہر دکان کے تھڑے پر گندے چترہوں کے گھڑے سے ٹیک لگائے اونگھتے ہوئے دیکھا۔ میں قریب سے گزرا تو اُس نے ایک پل کے لیے اپنی سوجی ہوئی پلکیں اٹھا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں ایک پل کے لئے دُک گیا۔ ایک پل کے لیے ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ اُسی طرح پتھر بنا اپنی وحشت زدہ آنکھوں سے

مجھے دیکھتا گیا۔ شاید وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ مٹی اور چیتھڑوں کا جو گنہ مند اڈھیر سا دکان کے قوسوں پر رکھا ہے کیا یہ وہی کم سخن، اچکن پوش خوش لباس گیٹ کپڑے ہے۔ جو آج سے عرصہ پہلے امرتسر کے ایک سینا گھر کے گیٹ پر روہے کی گڑسی پر چپ چاپ بیٹھا ٹکٹ کا ٹاکرنا تھا اور جیسے اس کی بوڑھی ماں اور بھولی بھالی معصوم بچی روٹی دینے آیا کرتی تھی؟ اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سفید بالوں اور چہرے کی دکھ بھری لکیروں والا آدمی وہی چھوٹا سا لڑکا ہے جو کبھی بڑی بے فکری سے میرے پاس گیٹ کے جنگلے پر چڑھا جیب سے ریوڑیاں نکال نکال کر کھایا کرتا تھا؟ ہم دونوں یہی سوچ رہے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ وقت کی برق رفتار گاڑی ہم دونوں کو زندگی کے ویران سٹیٹن پر اکیلا چھوڑ کر بہت دور نکل چکی تھی۔

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور میں آگے چل دیا۔ اس کے بعد پھر میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ خدا جانتے اب وہ کہاں ہے! اُس کی دکھی ماں اور معصوم بچی کہاں ہے؟ وہ یقیناً اب بڑی ہو گئی ہوگی۔ کاش۔ میں کبھی اُس سے مل کر، اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر پوچھتا۔

بیٹی! تیرے باپ کو اب روٹی دینے کون جاتا ہے؟

امرتسر کا ایک جواری

محلے میں لوگ اُسے گاما سنگھاڑیا کے نام سے پکارتے تھے۔ لمبا قد، چھریرا بدن، گندمی رنگت، سرسوں کے تیل میں چمکتے ہوئے سیاہ لہریلے بال گنجان کالی بھنودوں کے سائے میں خواب آلود نسواری آنکھیں اور چوڑے نتھنوں والا چٹاناک دو گھوڑا بوسکی کی کار دار قمیض پر چمکارا ماتے سونے کے بٹن سفید ٹالسے کی دھوتی، پٹنیٹ کا سیاہ پمپ شو اور کندھے پر لال صافہ۔

گاما سنگھاڑیا کالی کتنی والی ریشمی دھوتی کا پتو سونے کی انگوٹھیوں والی انگلیوں میں مٹھائے، منہ میں تمباکو والا پان رکھے بڑی اُن بان کے ساتھ محلے میں ہٹتا کرتا۔ کبھی طفیل ستار کی دکان پر بیٹھا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے۔ کبھی کاکا عمدہ سے ہنسی مذاق ہو رہا ہے اور کبھی ہماری دکان کے تخت پوش پر پاؤں رکھے میرے والد سے مزے مزے کی باتیں کر رہا ہے۔ کپڑوں پر اگر پان کا بکاسا نشان بھی پڑ جاتا تو گلی کے نکلے پر صافے کی کتنی پانی میں بھگو کر دیر تک پان کے داغ کو رگڑتا رہتا۔ بڑا صاف ستھرا اور صفائی پسند آدمی تھا۔ جس روز اُس نے کوکین دالا پان کھایا ہوتا اُس روز وہ سندر سنگھ حکیم کی دکان پر کھبے سے ٹیک لگا کر مست ہو کر بیٹھا رہتا اور پہروں کسی سے کوئی بات نہ کرتا۔ منہ میں پان دبائے چہرے پر سدا کھیلنے والی بچوں ایسی مسکراہٹ لئے وہ آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا اور دھوتی کا پتو اٹھا کر منہ کی ہوئی پنڈلیوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا رہتا اور وہ دنیا میں اکیلے تھا۔ نہ باپ، نہ ماں، نہ بہن اور نہ بھائی۔ عمر چالیس کے قریب تھی۔ شادی نہیں کی تھی۔ ہماری گلی میں ایک مسجد کے کچھوڑے کو ٹھٹھی میں رات کو کسی وقت اگر پہرٹ رہتا تھا۔

گاما سنگھاڑیا جواری تھا شرابی تھا۔ وہ ان معنوں میں محلے کا بد معاش تھا کہ جو اکھیلتا تھا

شراب پیتا تھا۔ کوکین کھاتا۔ اور کٹڑہ کہنیا نعل میں جا کر بونگھری کا ٹبراستہ تھا۔ اس کی دھوتی کی ڈھب میں کمافی دارچا تو بھی رہتا تھا۔ وہ سٹہ بھی لگاتا تھا۔ ہماری دکان میں چاچا امیر نامی ایک ادھیر عمر کا سوکھا لمبا شخص بیٹھا تھا۔ جو پولیس سے چوری چھپے سٹے کی پرچیاں لکھا کرتا۔ سواری فرد کی بکلی مارے وہ بھٹی کی اوٹ میں بوربے پر بیٹھا جو کس آنکھوں سے پولیس کے آدمیوں سے خبردار رہا کرتا۔ سارے محلے والوں کو علم تھا کہ چاچا امیر سٹہ لکھتا ہے چراغ ارائیں بازار میں کسی سپاہی کو آتا دیکھتا تو دکان پر ٹینڈے سے تولتے ہوئے چاچا امیر کو ہوشیار کر دیتا۔

”چاچا! کالا آدمی آیا اکی“

کالا آدمی انہوں نے پولیس کے سپاہی کا نام رکھ چھوڑا تھا۔ چاچا امیر یہ سنتے ہی اپنی چوٹی سی پسل اور سٹے کی پرچیاں فوراً تماشوں والی ٹوکری میں چھپا دیتا اور خود بھٹی کے پاس آکر بڑی ہی بے نیازی سے ہاتھ تاپنے لگتا کبھی کبھی گاما سنگھاڑیا بھی دکان میں آکر کوئی حرف یا ڈرا لگا دیتا۔ سٹے کا گھڑا چوک ملکہ بت میں دسے پٹھان کی بیٹھک پر رات کے نو بجے کھلا کرتا تھا۔ ساڑھے نو بجے چاچا امیر دسے پٹھان کی بیٹھک سے بھگتان لے کر دکان پر آجاتا۔ گاما سنگھاڑیا دور سے آواز لگاتا۔

”چاچا! منڈی داکہ بھا اے آج“

گاما سنگھاڑیئے کا اگر حرف یا ڈرا نکل آتا تو وہ روپے دھوتی کے ڈھب میں سنبھال کر پائے ہندو کی بیٹھک پر شراب پینے اور جوا کھینے چل دیتا۔ اگر حرف نہ لگتا تو مسکرا کر میرے والد سے کہتا۔

”ر خلیفہ! سٹہ بڑا کتا کم اے۔ لاڈ آدھ سیر دودھ ہی پلاؤ۔“

گاما سنگھاڑیا بد معاش تھا۔ کیونکہ وہ جوا کھیلتا تھا۔ شراب پیتا تھا اور کمافی دارچا تو ہر وقت ڈھب میں رکھتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی اس کی زبان سے گالی نہیں سنی تھی۔ محلے میں اس نے کبھی کسی سے لڑائی نہیں کی تھی۔ کبھی شراب پی کر شور نہیں مچایا تھا۔ وہ گلی میں یوں سر جھکا کر گزرتا جیسے اپنے گھر کے آگن میں سے گزر رہا ہو۔ ہر ایک سے نرم اور میٹھے لہجے میں بات کرتا۔ مجھے یاد ہے ایک بار اس نے بہت پی رکھی تھی اور سندھ سنگھ حکیم کی دکان کے

پھٹے پر چوڑی مار کر بیٹھا دیو داس کا یہ گانا کارا تھا۔

بالم آئے بسو مورے من میں

میں اپنی دکان میں دودھ کی کڑا ہی میں کھونچہ پھرتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا گامے سنگھاڑیئے کی آنکھیں شراب کے نشے میں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کی گردن بار بار ڈھلک جاتی تھی رات کے غالباً دس گیارہ بجے تھے۔ گرنی بہت تھی۔ اچانک گاما سنگھاڑیا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی ٹانگوں پر کالے چبوتے چڑھ گئے تھے۔ اس نے بازار میں کھڑے کھڑے اپنی ریشمی دھوتی اتار رکھا اور اسے تھارتے ہوئے ہنسی کر بولا۔

”خلیفہ! کاڈے اسی کاڈے“

میرے والد نے فوراً گدے سے اٹھ کر گامے سنگھاڑیئے کی دھوتی باندھنی اور کہا۔

”گامیا شرم کر“

گاما سنگھاڑیا اور بچوں کی طرح بازار میں کھڑا میرے والد سے دھوتی بند ہوتا رہا۔ پھر وہ گاما اور بڑا کھڑا ہوا پائے ہندو کی بیٹھک کی طرف چلا گیا۔ اگلے روز جب اسے معلوم ہوا کہ اس نے شراب کے نشے میں بازار میں دھوتی اتار دی تھی تو اسے اس قدر ندامت ہوئی کہ وہ تین چار روز تک محلے میں نہ آیا اور بونگھری کی بیٹھک پر ہی رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بعد میں نے گامے سنگھاڑیئے کو کم از کم اپنے محلے میں شرابی حالت میں نہیں دیکھا۔

گاما سنگھاڑیئے کو سانپ پکڑنے میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ میں نے یہ منظر کئی بار دیکھا کہ گاما بازو پھیلائے سانپ کو دم سے پکڑے جھٹکے دیتا گلی یا بازار میں چلا آ رہا ہے پیچھے بچوں کا ہجوم ہے۔ عورتیں کھڑکیوں میں چٹوں کے پیچھے آن کھڑی ہوتی ہیں۔ پھر گاما دو ایک بار سانپ کو دائرے کی شکل میں گھما کر زور سے زمین پر دے مارتا۔ سانپ مرجاتا ہم لوگ اسے سٹلی سے باندھ کر گلی گلی گھیسے پھرتے اور پھر محلے کے باہر پاتھی گراؤنڈ میں جا کر زمین میں دبا دیتے۔ گلی محلے میں کسی کے گھر سانپ نکلتا فوراً گامے سنگھاڑیئے کو بلا لیا جاتا۔ گاما خاص قسم کی سیٹی کی آواز منہ سے نکالتا اور لکڑی زمین پر مارتا کو نے کھدے میں چھپا ہوا سانپ باہر نکل آتا۔ گاما بڑی چابکدستی اور ہوشیاری سے لپک کر اس کی دم پکڑتا اور پلپک چھپکنے میں سے

اٹھا کر جھٹکے دیتا باہر لے آتا ہماری دکان میں رات کو وہ کبھی کبھی سانپوں کی بڑی مزے دار کہانیاں سنایا کرتا۔ اس بات پر اس کا پختہ یقین تھا کہ سانپ سو سال گزر جانے کے بعد جون بدل سکتا ہے۔ یعنی چرند پرند، حیوان، وہ جس شکل میں چاہے نمودار ہو سکتا ہے۔ مستری عبداللہ جو ہر بات پر اعتراض کرتا اپنا فرض سمجھتا تھا کہتا۔

”گامیا! اتنا جھوٹ نہ بولو۔ غلیفے کی دکان کی چھت پہلے ہی کمزور ہے۔“

گاما مسکراتے ہوئے اپنی پنڈلیوں پر ہاتھ پھرتے ہوئے کہتا۔

”مستری! مجھے تو تم بھی سانپ نظر آ رہے ہو۔“

سانپوں کے علاوہ گامے سنگھاڑیئے کو بچرے یعنی بیٹے پالنے کا بھی شوق تھا۔ چیت دساکھ کے دونوں میں وہ بڑے کی مادہ پنجرے میں بند کر کے باغوں میں چلا جاتا اور ایک دو زربڑے پکڑے کر لے آتا۔ وہ انہیں خوب دانہ پانی کھلاتا۔ ان کی بڑی ٹہل سیوا کرتا۔ صبح علوہ پوری کا ناشتہ کرتا تو بچروں کو بھی تھوڑا تھوڑا علوہ ضرور کھلاتا۔ پھر وہ ایک بچرے کو سدھانا شروع کر دیتا۔ اس بچرے کو سدھانا شروع کر دیتا۔ اس بچرے کو وہ اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر بیٹھا کر بازار میں آکر کھڑا ہو جاتا۔ دوسرے ہاتھ میں تھامے ہوئے موتیئے کے سفید پھول کو وہ زور سے ہوا میں اچھالتا بچرے کی مانند لپک کر اوپر اڑتا اور ہوا میں اڑتے ہوئے پھول کو چورچ میں پکڑ کر واپس گانے کی پھلی پر آن بیٹھتا۔ بچے زور زور سے تالیاں بجاتے اور گاما سنگھاڑیئے کا گندنی چہرہ خوشی کی مسکراہٹ سے لال ہو جاتا۔

گرمیوں کے موسم میں گاما سنگھاڑیا کبھی ام لگاتا اور کبھی قلفیاں بیچنے چل نکلتا اس زمانے میں آج کل کی طرح ریڑیوں پر قلفیوں کی بے عزتی نہیں ہوا کرتی تھی۔ رات کو ہی گاما من سوامن دودھ کی بڑی بنا کر انہیں قلفیوں اور گولڈ فلیک یا کپشن کے گرم پانی میں دھلے دھلائے شفاف ڈبوں میں بھرنا شروع کر دیتا ان میں پستہ اور بادام کی ہوائیاں چھوڑتا۔ روح کیوڑہ ڈالتا۔ میں ان بند قلفیوں اور ڈبوں کے کناروں پر گندھا ہوا میدا چپکائے جاتا۔ جب ساری قلفیاں بھر جاتیں تو گاما مٹی کے ایک بڑے سے مٹکے میں برف اور نمک کوٹ کر اسکی ایک تہہ جاتا اور اس کے اوپر قلفیاں جما کر برف کی دوسری تہہ لگا دیتا۔ جب مٹکا بھر جاتا تو وہ اس کا منہ بند کر کے کھل چھت

پر احتیاط سے رکھ دیتا۔ دوسرے دن چھپلاتی دھوپ میں گل کے اخیر میں اس کی آواز سنائی دیتی۔ ”قلنی کھوئے بی دام والی۔“

بوسکی کی قمیض، سلک کی دھوتی اور کالے پمپ شو پہنے، پرنا مونڈھے پر ڈالے گاما سنگھاڑیا دھوتی کا پلو تھانے بڑی شان سے آگے آگے چل رہا ہوتا۔ گلی کی دھوپ میں اس کے گندمی ماتھے پر آیا ہوا پسینہ سر کے تیل لگے بال قمیض کے طلائی ٹن اور پمپ شو کی نوک چمک رہی ہوتی۔ پیچھے پیچھے مزدور سر پر قلفیوں سے بھرا ہوا مٹکا اور چوکی اٹھائے آ رہا ہوتا ہمارے مکان کے باہر آکر وہ آواز لگتا۔

”چل بھی میرے پورن بھگت نے باؤ میرے آجا۔“

مجھے وہ ہمیشہ باؤ میرے کہتا اور میری چھوٹی بہن محمودہ کو جس کی عمر چھ برس کی تھی پورن بھگت کے نام سے پکارتا۔ کیونکہ پورن بھگت کی طرح اس کے کٹے ہوئے بالوں کے پٹے گردن پر پڑے رہتے تھے۔ ہم گامے سنگھاڑیئے کو چاچا کہہ کر بلایا کرتے تھے کیونکہ ہمارے والد سے اس کی دوستی اور پیار بھائیوں سے بھی بڑھ کر تھا۔ میں اور میری چھوٹی بہن محمودہ اس کی آواز سننے ہی اپنی اپنی تھالی لئے بھاگ بھاگ سیڑھیاں اترتے گلی میں آ جاتے۔ گلی میں گاما سنگھاڑیا، چوکی پر بیٹھا، مٹکے میں ہاتھ ڈال کر قلفیاں ٹٹول رہا ہوتا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہنستے ہوئے کہتا۔

”او آگئے میرے پورن بھگت تے میرا باؤ۔“

مٹکے میں سے دو بڑی قلفیاں نکال کر وہ انہیں سادہ پانی کے تیلے میں دو تین ڈبکیاں دیتا۔ پھر بڑی نفاست سے چاقو سے کر قلفیوں کے کناروں پر جا ہوا میدا کھرچتا۔ ایک ہاتھ میں پلیٹ اور دوسرے ہاتھ میں قلفی تمام کر وہ اس مہارت اور نرمی سے اسے دو تین جھٹکے دیتا کہ قلفی اپنے ٹین کے فول سے ثابت کی مہبت نکل کر پلیٹ میں آ جاتی اور روح کیوڑے پستہ بادام کی لپٹیں آرانے لگتی۔ گاما شیشے کے پیام میں سے لچھے نکال کر اس کے اوپر ڈالتا اور پلیٹ ہمارے ہاتھ میں دے کر پیار سے کہتا۔

”کھاؤ میرے پیو پتیرو۔“

گاما سنگھاڑیا اپنی مرضی اور اپنی خوشی کے لئے کام کرتا تھا۔ کام سے اس کا مقصد نہ

تو روزی کمانا ہوتا تھا اور نہ کسی کو خوش کرنا۔ بس یونہی جب کبھی گرمیوں میں طبیعت چاہتی تو تھیں
جالیٹا اور کبھی آم خریدنے منڈی جاتا تھا۔ چوسات روز کام کرنے کے بعد پھر وہی بجز انگور ٹٹے
پر بٹھائے بازار میں آجاتا اور اس کے کرب دکھا دکھا کر خود بھی خوش ہوتا اور بچوں کو بھی خوش
کرتا۔

جس روز وہ آم لگاتا اس روز مجھے اپنے ساتھ میوہ منڈی ضرور لے جاتا میں نیکر قیصر
پہنے ننگے پاؤں بڑا خوش خوش گانے کی انگلی تھامے اس کے ساتھ ہو لیتا۔ میوہ منڈی کا ایک
دروازہ ہال بازار اور دوسرا رام باغ والی پولیس گارد کی طرف لگتا تھا۔ ہم گارد والے دروازے
سے میوہ منڈی میں داخل ہوتے۔ منڈی میں آڑھتیوں اور خریداروں کا شور مچا ہوتا۔ زمین پر کچر دی
کچے ہوئے پھل پڑے ہوتے۔ گندے منڈے پھلوں کی تیز بو کے ساتھ ہی ساتھ کسی وقت
تازہ آموں کی میٹھی اور گرم ہبک بھی آجاتی آڑھتی اپنے اپنے آموں کی کھاریاں کھولے کھڑے چن
بیچ کر بولی بول رہے ہوتے خریدار اور گرو کھڑے کھاری میں ہاتھ ڈال ڈال کر آموں کے دانے
ٹٹولتے۔ ایک آدھ آم چوستے۔ پھر یا تو پرانے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی بول دیتے
اور یا آگے دوسری ٹکڑی کی طرف چل دیتے۔ گاما سنگھاڑ یا بھی ہر ٹکڑی میں کھڑا ہو کر سودے
کی دیکھ بھال کرتا۔ کھاری میں سے وہ ہمیشہ دو آم نکالتا۔ ایک وہ خود چوستا یا چاقو نکال
کر کاٹتا اور دوسرا چپکے سے میرے ہاتھ میں تھا دیتا جسے میں جلدی سے اپنی نیکر کی جیب میں
ٹھونس دیتا مجھے یاد ہے۔ جب میں منڈی سے واپس گھر آتا تو میری نیکر کی جیبیں لال پیلے
چھوٹے بڑے آموں سے بھری ہوتی ہوتیں تھیں۔ گاما مجھے تاکید کرتا۔

”پورن بھگت کو بھی دینا۔“

گامے سنگھاڑ بیٹے کا آم بیچنے کا انداز بھی اپنا تھا۔ منڈی کے بڑے منکے میں وہ پانی
اور برف ڈال کر اسے دسہری اور مال دیو آموں سے بھر دیتا ہماری دکان کے کچے ایک بیچ
پڑا رہتا تھا گاما اس بیچ پر صاف ستھرے کپڑے پہن کر عطر لگا کر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھ
جاتا۔ برف لگے میٹھے آموں سے بھرا ہوا مٹکا اور چینی کی شفاف پٹیش پاس ہی رکھی ہوتی لاکھ
کو وہ اپنی مرضی سے آم نکال کر اسے کاٹ کر پلیٹ میں رکھ کر دیتا دو چار روز میں یہ شوق

بھی پورا ہو جاتا اور گاما پھر بجز اور موتیے کا پھول لے کر چوک میں نکل آتا۔

پھر اچانک محلے میں یہ خبر پھیل گئی کہ گامے سنگھاڑ بیٹے نے شادی کر لی ہے۔ یہ شادی
کیسے ہوئی؟ کہاں ہوئی؟ ان باتوں کا مجھے بالکل علم نہیں ہے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ گامے سنگھاڑ
نے مسجد کے پچھوڑے والی اپنی کوٹھڑی چھوڑ کر بازار میں دھرم سالہ کی بغل میں ایک چوبارہ
کرائے پر لے لیا اور وہاں اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگا۔ میں ان دنوں چھٹی یا ساتویں جماعت
میں پڑھا کرتا تھا اور ہماری دکان کے بالکل سامنے طفیل زرگر کی دکان تھی نوے کی اونچی لمبی
پیٹی کے سامنے وہ سفید چاندنی پر رکھے ہوئے گاؤ تکیے پر بیٹھا حقہ پیتا یا پنکھے سے مکھیوں
کو اڑاتا رہتا تھا۔ میں دن میں ایک گھنٹہ اس سے حساب پڑھتا اور تقریباً سارا دن اس میں
چلیں بھرا کرتا۔ وہ مجھے حلیم دے کر کبھی کا کاغذ کے تنور پر اور کبھی کسی کے گھر آگ لینے بھیج
دیتا۔ ایک روز میں گامے سنگھاڑ بیٹے کے گھر حلیم ہاتھ میں تھا مے آگ لینے گیا تو چوبارے کے
پاس بیٹھی ایک گوری چٹی صحت مند عورت نے مجھے پیار کیا اور خود چٹے سے حلیم میں آگ
دھرنے لگی۔ اس نے نخل کا سواری رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ پاؤں میں کلکتے کے سلیر
تھے۔ گلے میں سونے کا ہار تھا۔ اور لال لال گالوں پر سبز رنگ کے خال کے نشان تھے۔
مجھے وہ بڑی اچھی لگی۔ یہ گامے سنگھاڑ بیٹے کی بیوی تھی۔ اب میں طفیل زرگر کی حلیم تھامے
گامے سنگھاڑ بیٹے کے گھر ہی آگ لینے جاتا۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ گامے سنگھاڑ بیٹے کی بیوی بڑی شان سے ہال کھولے چادر پائی
پر بیٹھی رس لگے کھا رہی ہے اور گاما اس کے سر میں ہادام روغن کی مالش کر رہا ہے جانے کیوں
مجھے اس وقت گاما سنگھاڑ یا اچھا نہ لگا۔ مگر گاما سنگھاڑ یا اب بڑا اچھا ہو گیا تھا محلے
میں ہر آدمی اس کی کایا پلٹ پر حیران اور خوش تھا۔ اس نے جوا اور شراب چھوڑ دی تھی۔

وہ ہر روز بازار میں کوئی نہ کوئی سودا لگاتا۔ کمائی دار چاقو اس نے میرے والد کو دے دیا تھا۔

”خلیفہ! اب اس کا کوئی کام نہیں رہا۔“

آنکھیں وہ پہلے ہی نیچی کر کے لگی ہیں سے گرد تاغاب وہ سر جھکا کر گزرنے لگا۔ اس
نے محلے کی مسجد میں مولوی صاحب سے قرآن پڑھنا بھی شروع کر دیا اور کبھی کبھی نماز بھی پڑھتا

وہ اپنی بیوی کی بے حد خدمت کرتا۔ جو کماتا اُس کے اُگے رکھ دیتا۔ اُسے قسم قسم کی پوشاک پہناتا خود اُس نے بوسکی کی جگہ عام پاپلین وغیرہ پہننی شروع کر دی تھی۔ شادی کے چھ ماہ بعد اُس نے وارھی کا خط بھی بنوایا۔ گاما سنگھاڑیے کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ دن بھر وہ گل گل گھوم پھر کر قلیاں یا پھل بیچتا اور شام کو حلال کی کمائی بیوی کے قدموں پر ڈال دیتا۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ گاما سنگھاڑیا دن بھر کا تھکا ہارا سودا بیچ کر گھر آیا تو چوبارے کی کوٹھڑی اور صندوق چوپٹ کھٹے تھے۔ سارے کپڑے اور زہر غائب تھے۔ اُسکی بیوی گامے سنگھاڑیے کو دغا دے کر محلے کے ایک کوچران کے ساتھ بھاگ گئی تھی دو روز تک گاما سنگھاڑیا اپنے چوبارے سے نیچے نہ اُترا۔ تیسرے روز وہ نیچے بازار میں آیا۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اور آنکھیں سو جی ہوتی تھیں اُس نے بازار کے گرم حمام میں جا کر ڈاڑھی منڈوائی۔ میرے والد سے اکر کمائی دار چا تو لیا پائے ہندو کی بیشک پر جا کر جوئے میں کچھ رقم جیتی۔ ڈٹ کر شراب پی اور امرتسر شہر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کئی سالوں تک میں نے گامے سنگھاڑیے کو امرتسر میں نہ دیکھا۔ والد صاحب ایک بار اپنے دوستوں سے بات کر رہے تھے تو معلوم ہوا کہ گاما بیبی کی طرہ نکل گیا ہے پاکستان بننے کے بعد میں ایک روز ہیرا منڈی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے گامے سنگھاڑیے کو نوادری کی دکان کے آگے بیچ پر بیٹھے دیکھا۔ اُس کے بال سفید ہو چکے تھے چہرہ بکھا بکھا اور کمزور ہو گیا تھا۔ وہ گردن جھکائے سر کو آہستہ آہستہ جھٹک رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا تو اپنی بوجھل پکیں اٹھا کر سرخ نشیلی آنکھیں سکیر کر مجھے ملنے لگا پھر ملکی سی اداس مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”میں تہانوں پہچانیا نہیں باؤ جی“

مجھے ایک دھکا سا لگا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”میں باؤ میدا ہوں چا چا جی“

گاما سنگھاڑیا اتنا س کر ایک پل کے لئے مجھے دیکھتا رہ گیا۔ پھر اچانک بیچ پر سے اٹھا دو تباہیوں بھلا کر مجھے سینے سے چمٹالیا اور سسکیاں بھر کر بچوں کی طرح رونے لگا میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ اگلے ہفتے میں والد صاحب کا پیغام لے کر اُس کے پاس گیا تو پتہ چلا کہ گاما سنگھاڑیا فوت ہو چکا ہے۔ میں اُداس اور بوجھل دل لئے واپس آگیا۔ بچڑا موتیے کے پھول کی تلاش میں کائنات کی دستوں میں کھو گیا تھا۔

امرتسر کا پروفیسر مندری

گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر کے سامنے بیچ تا تھا ہائی سکول کے میدان میں پروفیسر مندری نے زمین پر ایک کافی بڑا دائرہ کھینچا ہے اور خود اُس کے بیچ میں بیٹھا زمین پر رکھی ڈٹی کے اوپر دوٹی کھڑی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیجئے دوٹی کھڑی ہو گئی۔ پروفیسر مندری نے دو تین بار شانے اچکائے ہیں اور آنکھیں بند کر کے ایک ہاتھ اٹھا کر یہ شعر پڑھنا شروع کر دیا۔

آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشا دیکھے

ادھر ادھر سے بچے آکر دائرے کی لکیر پر بیٹھنے لگے ہیں۔ کچھ بڑے بھی ان کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ پروفیسر شعر پر شعر پڑھ رہا ہے۔ کھڑی دوٹی کے ارد گرد چکر لگا رہا ہے۔ کبھی جھک کر دوٹی کے قریب اُننگی لے جاتا ہے اور پھر ”چھو“ کہہ کر یوں پیچھے ہٹتا ہے جیسے دوٹی سانپ ہو۔ اس قسم کی حرکتوں سے وہ لوگوں کے ذوقِ تجسس کو ہوا دے رہا ہے۔ کافی لوگ جمع ہو گئے ہیں ماچناچہ پروفیسر مندری ایک جگہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے پہلے اُننگی سے زمین چھوتا ہے پھر وہی اُننگی کان پر لگا کر کہتا ہے۔

”یا مالک! کسی نیک کے منہ لگانا ——— لو بھی قسم ہے سب کو اپنے ماں باپ کی

ایک بار زور سے تالی بجاؤ۔“

”جمع تالیوں سے گونج اٹھتا ہے۔ پروفیسر مندری کہتا ہے۔

”بچہ لوگ زور سے کہو، شوم جائے۔“

بچے زور سے بولتے ہیں۔ شوم جائے۔“

”یا مولا علی! تیرے نام کا آسرا ہے۔ بھائیو! میرے پاس ٹین کی اس ڈٹی میں سوائے

مندریوں یعنی انگوٹھیوں کے اور کچھ نہیں۔ آپ پوچھیں گے اس مندری میں خاص شے کیا ہے؟ تو بھائیوں، اس مندری میں اور دوسری مندریوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان مندریوں یعنی انگوٹھیوں میں میرے پیر و مرشد کی کرامت ہے۔ کیا کرامت ہے؟ ابھی سب کو معلوم ہو جائے گا۔ بھائیو! میں کوئی بے ایمان آدمی نہیں۔ ایک شریف گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔ مجھے روپے کا لالچ نہیں۔ یہ کام میں صرف خدمتِ خلق کے لئے کر رہا ہوں، کیونکہ میرے پیر و مرشد کا یہی حکم ہے۔ بچہ لوگ ایک بار پھر زور سے تالی بجاؤ۔

ساتھ بچے زور سے تالیاں بجانے لگتے۔ پروفیسر مندری بچوں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔
"بو بھئی، جو لڑکا گھر سے نہا کر آیا ہے وہ میدان میں آجائے۔"

ایک لڑکا میدان میں پروفیسر کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ پروفیسر نے ٹین کی ڈٹی میں سے پتیل کی ایک روپیہ والی انگوٹھی نکالی۔ انگوٹھی میں لال رنگ چمک رہا ہے۔ یہ انگوٹھی اس نے لڑکے کے انگوٹھے میں ڈال کر لڑکے کا ہاتھ اس طرح اس کی آنکھ پر رکھ دیا کہ انگوٹھی کا ٹکینہ اس کی آنکھ کے بالکل سامنے آجائے۔ پروفیسر نے اپنے بائیں ہاتھ کے شکنجے میں لڑکے کا ہاتھ جکڑ لیا ہے۔ اب پروفیسر اور لڑکے کا مکالمہ یوں ہوتا ہے۔

پروفیسر: کچھ نظر آ رہا ہے؟

لڑکا: اپنی آنکھ نظر آ رہی ہے۔

پروفیسر: کہو ہٹ جاؤ۔

لڑکا: ہٹ جاؤ۔

پروفیسر: آنکھ کا عکس ہٹ گیا؟

لڑکا: نہیں۔

پروفیسر: لڑکے کے ہاتھ کو انگلیوں کے شکنجے میں زور سے جکڑتے ہوئے، اب بتاؤ۔

ہٹ گیا؟

لڑکا: (انگلیوں کے شکنجے سے پریشان ہو کر) ہٹ گیا۔

پروفیسر: سو خوش ہو کر، کہو جھاڑو والا آئے۔

لڑکا: جھاڑو والا آئے۔

پروفیسر: جھاڑو والا آگیا؟

لڑکا: (انگلیوں کے شکنجے سے ڈر کر) آگیا۔

پروفیسر: کہو جھاڑو والے صفائی کرو۔

لڑکا: جھاڑو والے صفائی کرو۔

پروفیسر: صفائی کر گیا؟

لڑکا: ہاں۔

پروفیسر: کہو درری والے درری لاؤ۔

لڑکا: درری والے درری لاؤ۔

پروفیسر: درری بچھ گئی؟

لڑکا: ہاں درری بچھ گئی۔

پروفیسر: کہو کرسی والے کرسی لاؤ۔

لڑکا: کرسی والے کرسی لاؤ۔

پروفیسر: کرسی بچھ گئی۔

لڑکا: بچھ گئی۔

پروفیسر: کرسی لوہے کی ہے یا لکڑی کی؟

لڑکا: (ذرا ہچکچاتے ہوئے) جی؟

پروفیسر: (ہاتھ زور سے دبا کر) اب غور سے دیکھ کرسی لکڑی کی ہے یا لوہے کی؟

لڑکا: لکڑی کی۔

پروفیسر: اس میں میرے چمک رہے ہیں نا؟

لڑکا: ہاں چمک رہے ہیں۔

اب پروفیسر مندری لوگوں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔

"ہندو ہو تو سری کرشن جی مہاراج کو، سکھ ہو تو بابا گورو نانک جی کو مسلمان ہو تو حضرت یحییٰ علیہ السلام

کو، اور اچھوت ہو تو سری بالیگ جی کو بلائے۔ لڑکے تیرا نام کیا ہے؟

لڑکا :- غلام حسین۔

پروفیسر :- (ماہنامہ مزید دبا کر) تو کہو یا حضرت سلیمان جی!

لڑکا :- یا حضرت سلیمان جی!

پروفیسر :- مہربانی کر کے تشریف لائیں اور اس کرسی پر اگر بیٹھ جائیں۔

لڑکا :- یا حضرت سلیمان جی! مہربانی کر کے تشریف لائیں اور اس کرسی پر اگر بیٹھ جائیں۔

پروفیسر :- بابا جی آئے ہیں؟

لڑکا :- جی؟

پروفیسر :- (انگلیوں کا ٹکچہ کستے ہوئے) بابا جی آئے ہیں؟

لڑکا :- ہاں جی آگئے ہیں۔

پروفیسر :- کہو یا حضرت سلیمان جی السلام علیکم!

لڑکا :- یا حضرت سلیمان جی السلام علیکم!

اب پروفیسر مندری لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہتا:

”اس بھرے مجمع میں سے کسی کو کوئی بھی سوال پوچھنا ہو۔ شادی نہیں ہو رہی، مقدمہ

جیتوں گا یا ہاروں گا، کاروبار چلے گا یا نہیں، جو بھی سوال پوچھنا ہو ہاتھ کھڑا کر دے۔“

کئی لوگ ہاتھ کھڑے کرتے ہیں۔ پروفیسر بڑے انکسار سے مسکرا کر کہتا ہے: ا، ہاں ہاں

بھائیو! میں حضرت سلیمان جی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔“

پھر وہ ایک آدمی کی طرف ہاتھ اٹھا کر پوچھتا ہے:

”ہاں جی بزرگو! آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ میرا لڑکا بڑے ہسپتال میں بہت سخت بیمار ہے

اُسے آرام آئے گا کہ نہیں؟“

”آپ کا اسم شریف بزرگو!“

”اللہ و تاء۔“

پروفیسر دو تین بار کندھے اچکاتا ہے اور پھر لڑکے کے ماتھے پر انگلیوں کا دباؤ ڈال کر کہتا ہے۔

پروفیسر :- حضرت سلیمان جی سے پوچھو۔ بابا جی!

لڑکا :- بابا جی!

پروفیسر :- اللہ و تاء جی کا لڑکا جو بڑے ہسپتال میں پڑا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا؟

لڑکا :- اللہ و تاء جی کا لڑکا جو بڑے ہسپتال میں پڑا ہے ٹھیک ہو جائے گا؟

پروفیسر :- اگر ٹھیک ہو جائے گا تو بابا جی شہادت کی انگلی کھڑی کر دیں اگر ٹھیک نہیں ہوگا تو

سر ہلا دیں۔

لڑکا :- اگر ٹھیک ہو جائے گا تو بابا جی شہادت کی انگلی کھڑی کر دیں۔ اگر نہیں ٹھیک ہوگا تو

سر ہلا دیں۔

پروفیسر :- دیکھو بابا جی نے شہادت کی انگلی کھڑی کی ہے یا سر ہلا رہے ہیں۔

لڑکا :- شہادت کی انگلی کھڑی کی ہے۔

اس جواب کے ساتھ ہی پروفیسر مندری زور زور سے دو ایک بار کندھے اچکاتا اور

اس بزرگ سے مخاطب ہو کر کہتا:

”ہاؤ بزرگو! بچوں میں مٹھانی بانٹو۔ تمہارا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے تم سے کچھ

لیا تو نہیں نا؟ تم نے مجھ کو کچھ دیا تو کچھ نہیں نا؟“

وہ بزرگ خوشی سے نہال ہو کر کہتا:

”نہیں بیٹا!“

پروفیسر جمع میں چاروں طرف دیکھتا اور کہتا:

”اس بزرگوار کے بچے کی صحت کی خوشی میں سب لوگ زور سے تالی بجاؤ۔“

سارا مجمع زور زور سے تالیاں بجانے لگتا۔ تالیوں کی آواز سن کر کئی راہگیر یہ دیکھنے

کے لئے کھڑے ہو جاتے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ جو ایک بار پروفیسر

مندری کے مجمع میں آکر کھڑا ہو جاتا وہ اُس کی لچھے دار عجز و انکسار سے لبریز باتوں کا اسیر

ہو کر رہ جاتا۔ چار چہ جائزہ مندوں کے سوالوں کے جوابات دینے کے بعد پروفیسر مندر کی اب اس سلیکانی انگوٹھی کے فوائد گنونا شروع کر دیتا۔

”مقتے کا فیصلہ اپنے حق میں کروانا ہو، نئی شادی کرانی ہو۔ محبوبہ کو اپنے قدموں پر جھکانا ہو۔ گھر میں درد ہو، غرض جو بھی حاجت ہو، جو بھی بیماری ہو، یہ انگوٹھی اپنے پاس رکھنے سے دور ہو جائے گی۔ اب آپ اس کی قیمت پوچھیں گے؟ اس کی قیمت کچھ نہیں۔ میں ایسے لوگوں میں ضرورت مندوں میں، حاجت مندوں میں اپنے پیر و مرشد کا نام روشن کرنے کے لئے مفت بانٹتا ہوں اور سب لوگ جانتے ہیں کہ اس جگہ عرصہ پندرہ برس سے کھڑا یہ انگوٹھیاں مفت بانٹ رہا ہوں، لیکن اپنے پیر و مرشد کے پاس کشمیر کی پہاڑیوں میں جا کر مجھے ان انگوٹھیوں پر دم کروانا پڑتا ہے، تو صرف آنے جانے کے کرائے کے لئے میں نے اس کا نذرانہ صرف دو آنے، دو آنے رکھا ہے۔“

اب پروفیسر ڈبئی میں سے ساری انگوٹھیاں نکال کر اپنی ہتھیلی میں ڈال لیتا اور کندھے اچکا اچکا کر کہتا:

”میرے پاس بہت مقوی انگوٹھیاں رہ گئی ہیں۔ جن صاحب کو لینا ہو اور دے کر پکارے۔ جلدی کریں۔ یہ نہ سوچیں کہ وہ لے گا تو میں بول گا۔ دو آنے دو آنے۔ اچھا مہربان لایا۔“

”ایک انگوٹھی مجھے بھی دینا۔“

”لایا مہربان۔“

”ایک مجھے بھی دینا۔“

”لایا چا چا جی۔“

”ایک اور صبر بھی لائیں۔“

”لایا میاں جی۔“

میں ان دنوں گورنمنٹ اسکول امرتسر میں پڑھا کرتا تھا۔ کلاس روم سے کھسک کر میں پروفیسر مندر کے مجھے میں جا کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے بول رہا ہوتا اس

اس کے ہونٹوں کے کونوں میں جھاگ جمع ہوتا۔ ماتھے پر پسینہ، وہ بار بار گے میں لٹکے ہوئے پرنے سے چہرہ پونچھتا۔ وہ ہانسی لگی میں رہتا تھا اور مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے پکڑ کر میدان میں کھڑا کر دیا۔ میرے انگوٹھے میں انگوٹھی ڈالی اور ہٹ جاؤ جھاڑو والے جھاڑو لاؤ۔ درکی والے درکی لاؤ کی گردان شروع کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے مجھے کا ہوں مجھ پر اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی، لیکن میں انتہائی شریر ہوا کرتا تھا۔ اس نے کہا۔

”ہٹ جاؤ۔“

”ہٹ جاؤ۔“

”کیا نظر آ رہا ہے؟“

”آنکھ۔“

”کس کی آنکھ؟“

”میری آنکھ۔“

پروفیسر مندری ذرا سٹپٹایا۔ پھر لوگوں کی طرف دیکھ کر کھسکی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

”ابھی دماغ روشن ہو جائے گا۔“

اس کے بعد اس نے اپنی انگلیوں سے میرا ماتھا بڑے زور سے دبانا شروع کر دیا۔

”اب دیکھو۔“

”دیکھ رہا ہوں۔“

”کیا نظر آ رہا ہے؟“

”آنکھ۔“

”کس کی آنکھ۔“

”میری آنکھ۔“

میں پروفیسر کا مجمع خراب کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا۔ فوراً انگوٹھی میرے ہاتھ سے اتار کر ایک معمول میری گردن پر ماری اور کہا۔

”بھاگ جا خلیفے دے پتر! آج تو نہا کر اسکول نہیں آیا“

میں بھاگ کر مجھے سے باہر آتا اور کہیں نہ کہیں آدمیوں کے بیچ میں سے گھس کر دو بار مجمع میں آکر کھڑا ہو جاتا۔ دیکھتے دیکھتے پروفیسر کی ساری انگوٹھیاں بک جاتیں۔ ڈبئی خالی ہو جاتی اور اُس کی جیب سکوں سے بھر جاتی۔ کئی بار میں نے مجھے میں پروفیسر کے بھائیوں کو بھی۔ انگوٹھیاں خریدتے دیکھا۔ ایک روز جو میں مجمع میں گھسا تو پروفیسر ایک بوڑھے سے پوچھ رہا تھا۔

”باباجی! آپ میری انگوٹھی خرید کر لے گئے تھے نا؟“

”ہاں بیٹا“

”آپ اپنے ایمان سے بتائیں۔ خدا کو جان دینی ہے۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر بتائیں کیا آپ کو فائدہ ہوا؟“

”ہاں جی بڑا فائدہ ہوا“

”میں نے آپ سے کچھ لیا تو نہیں؟ آپ نے مجھے کچھ دیا تو نہیں؟“

”جی نہیں۔“

”خدا آپ کا بھلا کرے۔ تو صاحبان!.....“

وہ بوڑھا، پروفیسر مندری کا والد تھا۔

اوصاف امر تسر جانتا تھا کہ پروفیسر مندری جھوٹ کا دھندلا کرتا ہے۔ جعلی انگوٹھیاں بیچتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے مجمع میں کھڑے لوگوں کو میں نے اُس پر ہنستے دیکھا ہے پھر بھی لوگ اُس سے انگوٹھیاں خریدتے تھے اور اس کے کاروبار میں کبھی فرق نہیں آیا تھا۔ مجمع میں جب کوئی شخص اس پر آوازہ کرتا تو پروفیسر کا آدمی اُس کی گردن پیچھے ہی سے دبوچ کر اُسے نکال باہر لے جاتا۔ اگر کوئی اکڑ جاتا اور لڑائی مار گٹائی پر آمادہ ہو جاتا تو پروفیسر مندری لپک کر اُس کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر انکسار سے کہتا۔

”یار جاؤ ناں! کیوں میری روزی میں لات مار رہے ہو؟“

ہندوؤں کے محلے میں مجمع لگانے وہ ماتھے پر تنک لگا، سر پر گول ہندوانہ ٹوپی پہن

کر جاتا۔ سکھوں کے علاقے میں وہ سر پر گکڑھی باندھ کر جاتا اور گورو بابا نانک کے نام پر بار بار بارہا تھ آنکھوں پر لگا کر چومتا۔ اپنے محلے میں لوگ اُسے فراڈ سمجھتے تھے۔ ہر شخص اُس سے مذاق کرتا۔ اُس کی کسی بات کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ اُسے بیوقوف بنانے کی کوشش کی جاتی۔ جب وہ انگوٹھیوں والی ڈبئی ہاتھ میں لئے گول ہندوانہ ٹوپی پہنے پڑنا گلے میں ڈالے گلی میں سے گزرتا تو محلے کے لڑکے اُس پر آوازیں کتے۔ دکاندار بھی اُس پر ایک آدھ فقرہ حسرت کرنا کبھی نہ بھولتے۔ پروفیسر اُن سب کا جواب ایک بے فہرسی، عاجزانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ دیتا اور کندھے اچکاتا، گردن دابھنے کندھے کی طرف جھکائے گلی میں سے گزر جاتا۔

وہ کشمیری ہاتھوں کی طرح لچیم شحیم تھا۔ دانت چھوٹے چھوٹے تھے، جیسے کسی کسی نے ریتی سے گھسا دیئے ہوں۔ ہمیشہ پرانی سی پتلون اور چٹل پہنتا۔ قمیض پتلون سے باہر رہتی۔ رنگ کھلتا ہوا تھا۔ عمر یہی کوئی چالیس کے قریب ہوگی۔ مگر صحت مند تھا۔ ایک زمانے میں اُس نے ریل گاڑیوں میں گھوم پھر کر زنبور سے لوگوں کے دانت نکالنے کا بھی دھندا کیا، مگر یہ دھندا چل نہ سکا۔ انہی دنوں محلے کے پنواڑی چاند خان کی ڈاڑھ میں شدید درد اٹھا تو پروفیسر نے اُس کی ڈاڑھ نکالنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ چاند خان مان گیا۔ پروفیسر فوراً گھر سے اپنا زنگ آلو زنبور لے آیا اور چاند خان سے بولا۔

”منہ کھولو چاند خان۔“

بوڑھے اور ہڈیوں کے ڈھانچ مراد آبادی پنواڑی نے منہ کھول دیا۔

”اور کھولو۔“

چاند خان نے اور منہ کھول دیا۔

”اور کھولو۔“

چاند خان منہ کھولے ہی کھولے آؤں آؤں کیا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ اس سے زیادہ

منہ نہیں کھول سکتا۔ پروفیسر نے کہا۔

”خیر کوئی بات نہیں۔ مجھے دشمن نظر آ گیا ہے۔“

چنانچہ پروفیسر مندری زبور والا ہاتھ لے کر چاند خاں کے کھلے منہ میں گھس گیا اور ایک زبردست دھچکے سے ڈاڑھ اکھاڑ پھینکی۔ چاند خاں بلبلا اٹھا۔ پروفیسر نے کہا۔

”دشمن مارا گیا۔ منہ بند کر لو چاند خاں“

مگر چاند خاں کا منہ دوبارہ بند نہ ہو سکا۔ جانے جبر سے کی کوئی ہڈی کس ہڈی پر چڑھ گئی تھی کہ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پروفیسر وہاں سے بھاگ گیا اور چاند خاں کو محلے والے تلنگے میں ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ پروفیسر ایک لارکی میں بیٹھ کر جان بھر کی طرف نکل گیا اور کئی روز محلے سے غائب رہا۔ ایک روز میں شہر کی ہندو آبادی میں اپنے ایک دوست ثنائی سروپ سے ملنے گیا تو میں نے پروفیسر کو ایک مندر کے باہر جمع لگائے دیکھا۔ ماتھے پر تلک تھا۔ سر پر ہندوانہ ٹوپی تھی اور وہ بار بار شری رام شری رام کرشن جی مہاراج کا نام لے رہا تھا اور ہر بار ان کے نام پر ہاتھ چوم چوم کر آنکھوں کو لگا رہا تھا۔ میں اس کے مجمع میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑے زور شور سے بول رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے جھاگ اڑ رہا تھا۔ ماتھا اور گنجا سر پسینے میں شرابور تھا۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ فوراً میرے قریب آیا اور سر پر ہاتھ پھر کر بولا۔

”گوپال پتر! جاؤ تمہاری ماما جی یاد کر رہی ہیں“

مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں کہنے ہی لگا تھا میں گوپال نہیں حمید ہوں کہ پروفیسر نے مجھے آنکھ ماری اور دوبارہ ہندوؤں کو اپنی لچھے دار باتیں سنائی شروع کر دیں۔ میں وہاں سے چل دیا۔

چاند خاں ہسپتال سے ٹھیک ہو کر یعنی اپنا منہ بند کر کر آیا تو پروفیسر اس کی دکان پر خود گیا اور ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگ لی۔ چاند خاں بڑی تنک مزاجی سے اس پر برتا رہا۔ پروفیسر ہاتھ باندھے کھڑا رہا اور عاجزانہ انداز میں یہی کہتا رہا۔

”معاف بزرگو! معافی“

یہ سب یہ انجسار پروفیسر مندری کے کردار کا جزو اعظم تھا۔ ایک عاجزانہ سی، کھسیانی

سی ہنسی ہر وقت اس کے چہرے پر رہی۔ آج میں پروفیسر کا چہرہ اپنی آنکھوں کے سامنے لاتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ اس کی عاجزی میں بے جا رگی نہیں تھی، بلکہ ایک قسم کی بے نیازی اور سکون سا تھا۔ ایک جوگی، ایک سنیاسی کا سکون جو مٹی کو سونا کے بھید سے واقف ہو گیا ہو اور جس کے نزدیک اب سونا مٹی بن کر رہ گیا ہو۔ محلے والے اسے بے وقوف بناتے اور وہ فوراً بے وقوف بن جاتا، بلکہ اپنی کچی اور کھسیانی باتوں سے دوسروں کو شہ دیتا کہ اسے احمق بنایا جائے۔ کوئی بڑا بوڑھا اسے اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ کسی بھی گھریلو یا معاشرتی مسئلے پر اس کی رائے لی جائے۔ گلی کا کوئی وزری، عطار، حلوائی یا کھرک پروفیسر پر پھبتی کستا تو جواب میں پروفیسر ہنس دیتا۔ اگر کچھ کہتا تو بلس اتنا۔

”خوش رو یار توں“

اس کی زبان پر اپنے اور غیروں کے لیے ہمیشہ کلمہ خیر ہوتا۔ میں نے اسے کبھی کسی کو گالی دیتے یا بدعما نہیں سنا۔ میں نے کبھی اسے کسی پر ناراض ہوتے یا غصے میں آگ بگولا ہوتے نہیں دیکھا، حالانکہ اس کا دھندا ایسا تھا کہ اسے لوگوں کی پھبتیاں اور آوازے دن میں کئی بار سننے پڑتے۔ کبھی کبھی میں اسکول جا رہا ہوتا یا اسکول سے واپس آ رہا ہوتا تو پروفیسر سر پر ہندووانہ ٹوپی رکھے، ہاتھ میں ٹین کی ڈبیا لیے مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیتا میرے قریب سے گزرتے ہوتے وہ مسکرا کر کہتا۔

”یار حمیدے۔ خوب پڑھانی ہو رہی ہے پھر“

نماز پڑھتے وہ کبھی مسجد میں نہیں گیا تھا۔ گلی میں وہ ہمیشہ سر جھکائے داخل ہوتا اور سر جھکائے نکل جاتا۔ ایک برس لاہور میں حضرت داتا گنج بخشؒ کا عرس ہوا تو پروفیسر میلے میں مجمع لگانے کے خیال سے ریل میں بیٹھ کر لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ آدھے راستے یعنی اٹاری کے سٹیشن پر پکوڑے خریدنے پلیٹ فارم پر اتر رہا تھا کہ انگوٹھا ڈبے کے دروازے میں آکر آدھا کٹ گیا۔ فوراً عرس مبارک پر جا کر مجمع لگانے کا خیال ترک کیا اور بس تک بیٹھ کر واپس امرتسر آ گیا۔ میرے والد نے وجہ پوچھی تو کندھا اچکا کر بولا۔

”خلیفہ! سوچا جائے تو میں لوگوں کو دھوکا دینے عرس مبارک پر چارہا تھا۔ قدرت

نے مجھے وہیں روک دیا۔

اس حادثے کے بعد پروفیسر نے زندگی بھر کی ذاتا صاحب کے عرس پر جمع نہ لگایا۔ ایک دفعہ ہماری گلی میں محلے کے ایک مالدار شخص کے بیٹے نے کسی بات پر خفا ہو کر ایک جولاہے کے لڑکے کو اس زور کا مارا کہ اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور خون جاری ہو گیا۔ پروفیسر گلی میں سے گزر رہا تھا۔ اُس سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ جھٹ آگے بڑھا اور زخمی غریب لڑکے کو پیار کرنے اور اپنا پرنا گیل کر کے اُس کا خون صاف کرتے لگا۔ امیر لڑکے سے صرف اتنا کہا،

”یار لڑائی جھگڑا نہ کیا کرو۔“

امیر زادہ تنک کر بولا،

”تم کون ہوتے ہو گنبے پروفیسر؟“

پروفیسر عاجزی سے بولا،

”یار مجھے چاہیے جو کچھ کہہ لو اس لڑکے کو کچھ نہ کہو۔ یہ تو بے چارہ غریب ماں باپ

کا بیٹا ہے۔“

امیر لڑکے کا مالدار باپ بھی اپنے دیوان خانے کی کھڑکی میں بیٹھا یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ غصہ کھا کر باہر آیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ دھڑا دھڑا پروفیسر کے منہ پر طمانچے مارنے شروع کر دیئے۔ پروفیسر کے دانتوں میں سے خون بہنے لگا۔ وہ کیلے پرنے سے خون پونچھتا جاتا تھا اور کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہے جاتا تھا۔

”معاف کر دیو بزرگو! معاف کر دیو۔۔۔۔۔“

نسبیت کے قیامت خیز دنوں میں اسی مالدار شخص کے بڑے بیٹے کو گولی لگی تو محلے میں سے کوئی بھی اُسے برستی گولیوں میں ہسپتال لے جانے کو تیار نہ ہوا۔ پروفیسر نے شدید زخمی نوجوان کو تانگے میں ڈالا اور اپنی جان پر کھیل کر اُسے ہسپتال لے گیا۔ اُس کے چھوٹے بھائی نے مجھے بتایا کہ وہ گھر میں اپنے ماں باپ کا بڑا ادب کرتا تھا۔ کبھی اُن کے سامنے اونچی آواز میں نہیں بولتا تھا۔ اُسے کوئی نشہ بھی نہیں لگا تھا۔

نہ پان تمباکو نہ جوانہ شراب۔ دن میں ایک مرتبہ دوپہر کو روکھی سوکھی کھا لیتا۔ جو کچھ کما کر لاتا اپنی ماں کے قدموں میں لا کر ڈال دیتا۔ باپ بوڑھا ہو گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بہن بھائی تھے۔ پروفیسر نے لوگوں کی پھبتیاں سنیں، طعنے سہے، آواز سے سننے، مگر بہن بھائیوں سے۔ پرورش کی۔ بہنوں کی اچھی جگہ شادیاں کیں، اور اب وہ اپنے اپنے گھر خوش و خرم ہیں۔ دو بھائی اور ایک بہن لندن میں ہے۔ پروفیسر مندر کی نے خود زندگی بھر شادی نہ کی۔

پاکستان بن جانے کے بعد وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ لاہور آ گیا۔ لاہور میں وہ جب کبھی مجھے بھائی یا نسبت روڈ یا میکورڈ روڈ پر ملتا، سب گھر والوں کی خیر و عافیت دریافت کرتا۔ محلے والوں کی بابت پوچھتا۔

”یار ہماری گلی کے سب لوگ آگئے تھے نا؟“

اُسے اپنے محلے کے سب لوگوں کی فکر تھی۔ اُن لوگوں کی بھی جو اُس پر آوازے کستے تھے۔ اُن لوگوں کی بھی جو اُسے احمق بنایا کرتے تھے۔ اُن لوگوں کی بھی جو بیچ بازار میں اُس کی بے عزتی کر دیا کرتے تھے۔ اُسے کسی کی نفرت یا نہ تھی۔ وہ سب سے محبت کرتا تھا اور سب کی خیر کا طالب تھا۔

لاہور آکر اس نے ابتدا میں جمع لگایا، انگوٹھیاں بیچتا رہا۔ اس کے بعد جمع لگانا چھوڑ دیا۔ اب اُس کے چھوٹے بھائی جوان ہو گئے تھے اور کمانے لگے تھے۔ بہنیں اپنے اپنے گھر آباد ہو گئی تھیں۔

ایک روز میں سرما کی چکیلی دھوپ میں بارغ جناح میں اپنے دوستوں کے ساتھ گھوم رہا تھا کہ میں نے پروفیسر کو ایک پلاٹ میں بیٹھے دیکھا۔ وہ روٹی کے چھوٹے چھوٹے بڑے کر کے چڑیوں کو ڈال رہا تھا۔ چڑیاں ہری ہری گھاس پر خوشی سے چبک چبک کر بڑے چبک رہی تھیں۔ پروفیسر چڑیوں کو دیکھ دیکھ کر بڑا خوش ہو رہا تھا۔ کبھی کوئی چڑیا اُس کے ذرا قریب آ کر اپنی چونچ اٹھا کر اُسے تنکے لگتی تو وہ اُس کی طرف گردش جھکا کر پچکارتے ہوئے باتیں کرنے لگتا۔ مجھے اُس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، مگر اُس کی جھکی ہوئی گردن، مسکراتا ہوا چہرہ اور ہلے ہوئے ہونٹ صاف نظر آ رہے

تھے۔ مجھے یقین ہے وہ چڑیوں سے یہی پوچھ رہا ہوگا۔

”کیوں بھئی ننھی متی چڑیو! کیا حال چال ہے؟“

آخری بار میں نے پروفیسر کو انارکلی سے گزرتے دیکھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ انارکلی بڑا رش تھا۔ پروفیسر لوہاری دروازے سے نیلے گنبد کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کی گردن ہائیں کندھے پر ذرا جھکی ہوئی تھی۔ چہرے پر وہی بھولی بھالی پُرسکون سی مسکراہٹ تھی اور وہ لوگوں کے شور و غل اور ہجوم سے بے نیاز یوں چلا جا رہا تھا جیسے بارغ جناح کی کسی سایہ دار سُنسان رُوش پر سے گزر رہا ہو۔ پروفیسر لاغر اور بوڑھا ہو گیا تھا۔ اُس نے مجھے نہیں دیکھا اور اپنی دنیا میں مگن میرے قریب سے ہو کر نکل گیا۔ میں اُس کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرا دیا۔ وہ مجھے بڑا اچھا لگا۔ وہ مجھے ہمیشہ بڑا اچھا لگا تھا۔ وہ نقلی پروفیسر تھا اس کے پاس کسی سکول، کسی کالج، کسی یونیورسٹی کے سرٹیفکیٹ نہیں تھے۔ وہ اُن پڑھو تھا اُس نے کبھی کسی کالج کے کلاس روم میں لیکچر نہیں دیا تھا، اُس نے کالجوں اور سکولوں کے باہر جمع ضرور لگایا تھا۔ میرے خیال میں اُس نے اپنے مجمعوں میں جو لیکچر دیئے وہ آج کے پروفیسر کے لیکچروں کے مقابلے میں زندگی سے زیادہ قریب تھے۔ اس لئے کہ آج کے پروفیسر کو لائبریری نے جنم دیا ہے اور وہ پروفیسر بھوک، افلاس، معاشرتی نا انصافی اور مردم آزاری کی دلدلوں میں پیدا ہوا۔ آج کے پروفیسر کے اصلی سرٹیفکیٹ جھوٹے ہیں اور کل کے پروفیسر کے جھوٹے تمنے سچے تھے۔ اُس نے اپنے لیکچروں سے کسی طالب علم کی تربیت نہیں کی۔ وہ خود ہی مرتب ہو گیا۔ وہ ایک ایسا عجیب و غریب پارس پتھر بن گیا جو اپنی اجزائی کمی بیشی کے باعث کسی کو سونا تو نہ بنا سکا، لیکن خود سونا ہو گیا۔

آج سے چند برس پہلے مجھے کسی نے بتایا کہ پروفیسر مر گیا۔ جانے کیوں یہ خبر سننے ہی میرے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ وہی مسکراہٹ جو ایک دوپہر پروفیسر کو انارکلی میں سے گزرتے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر آئی تھی۔ اور

پھر میں نے ایک منظر دیکھا۔ سنہری دھوپ میں زمر کی طرح دمکتا، سرخ گلابوں سے بھرا ہوا خوشبودار بارغ۔ اور اس بارغ کے شفاف پانیوں والی نہر کے کنارے پروفیسر

گھاس پر بیٹھا نیلی آنکھوں والی سبز چڑیوں کو دانہ ڈال رہا ہے۔ ایک بھولی بھالی چڑیا اپنی سرخ چونچ اٹھا کر پروفیسر کو دیکھتی ہے اور پروفیسر اُسے پچکارے ہوئے ذرا سا مسکرا کر پوچھتا ہے۔

”کیوں بھئی ننھی متی چڑیو! کیا حال چال ہے؟“

امرتسر کے جن اور بھوت

دیے تو امرتسر کا ہر مسلمان اپنی جگہ پر جن تھا پھر بھی شہروں کے اپنے بھوت پریت ہوتے ہیں ان کی اپنی کہانیاں ہوتی ہیں، ہر کہانی کو سچا واقعہ کہہ کر سنایا جاتا ہے۔ سنانے والا اپنی بساط کے مطابق اس کے گرد آسیب اور دہشت کے آلے بناتا چلا جاتا ہے۔ یہ آسیبی کہانیاں سینہ بہ سینہ چلتی ہوئی خاص شہر کی معاشرتی زندگی کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔

امرتسر کی ایک چڑیل میان پوترو کی کہانی میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ آج آپ کو کچھ اور بھوت پریت کے واقعات سناؤں گا۔ یہ سارے جن بھوت پاکستان بننے کے بعد امرتسر میں ہی رہ گئے اور اگر پاکستان چلے آئے ہیں تو ان سے پھر کبھی یہاں ملاقات نہیں ہوئی۔

دادا جان سنایا کرتے تھے کہ جب پہلی بار ریل گاڑی چلی تو امرتسر کے چاروں طرف پھلدار باغ اور ٹاہلیاں ہی ٹاہلیاں ہوا کرتی تھیں اور وہاں دن میں جاتے ہوئے بھی آدھی گھبراتا تھا۔ باغوں کے راکھے بلند آواز میں چڑیاں طوطے اڑا کر اپنے دل کا خوف کسی حد تک دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں ایک درخت آسیب زدہ تھا۔ دادا جان کہتے ہیں کہ اس درخت پر کبھی کبھی راتوں کو آگ کی چٹکائیاں اڑا کرتی تھیں ایک بار ایسا ہوا کہ رات کو باغ کے راکھے کی آنکھ کھل گئی۔ پھلوں کا موسم تھا۔ سارا باغ گول گول سفید امرودوں سے لدا ہوا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی امرود توڑنے باغ میں گھس آیا ہے۔

وہ اپنی چھوڑی سے نکل کر باہر آیا تو اسے ستاروں کی دھیمی روشنی میں آسیبی درخت کے نیچے ایک آدمی دکھائی دیا جو ٹوکری امرود بھر رہا تھا رکھا وہیں سے لگا کر اس کی طرف بڑھا اور سونٹیا لگا کر اس کی ٹانگوں پر مارنا چاہتا تھا کہ وہ آدمی غائب ہو گیا۔ راکھے کا سونٹا اوپر کا اوپر ہی رہ گیا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ درخت کی شاخوں سے کوئی شے دھپ سے زمین پر گر گئی اور بڑھکتی ہوئی

راکھے کے پاؤں کے ساتھ اگر لگ گئی راکھے نے جھک کر دیکھا۔ وہ کسی انسان کا تانہ کٹا ہوا سر تھا۔ اگلے روز راکھے کی لاش اسی درخت کے ساتھ لٹکتی پائی گئی۔ اس کے بعد کوئی اس طرف نہیں جاتا تھا جس شخص نے امرودوں کا ٹھیکہ لیا تھا اس کے مزدور بھاگ گئے۔ میں نے امرتسر میں ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ گھروں میں ایک طاق مزدور ہوتا جہاں جمعرات کی جمعرات دیا جلاتا جاتا۔ ہمارے گھر کی پھلی کوٹھڑی میں بھی ایک طاق تھا میری نانی یہاں پر جمعرات کی شام کو دیا جلاتا کرتی۔ دہلی پتلی سفید سی بوڑھی عورت تھی، لگتا روٹی سے بنائی گئی ہے۔ کشمیری زبان بڑی روانی سے بول لیتی تھی۔ ایک روز میرے پوچھنے پر نانی نے بتایا کہ طاق میں بابا جی رہتے ہیں میں اس کوٹھڑی میں جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ایک روز نانی دیا جلا کر گئی تو میں نے کیواڑ کی درز سے آنکھ لگا کر دیکھا کہ ایک سفید ریش بزرگ کا چہرہ دیے کی نوک کے ساتھ لگا مسکرا رہا ہے میں پیچھے مڑ کر اٹھ بھاگا اور جا کر نانی سے پوچھا اس نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

• بابا جی اتم سے بڑا پیار کرتے ہیں۔ اسے تو ان کی دعاؤں سے تو اس دنیا میں آیا ہے۔

میرا خیال تھا کہ یہ میرا وہم تھا۔ لیکن اس عہد کے لوگ ان باتوں پر بڑا پکا یقین رکھتے تھے۔

میری آپو جی نے مجھے ایک کہانی سنائی کہ ایک جن تھا جو سمرقند سے امرتسر کی ایک مسجد میں مؤذن بن کر آیا۔ وہ دبلا اور لمبا تھا۔ جب اذان دیتا تو اتنا لمبا ہو جاتا کہ گردن نیچی کر کے سارے امرتسر شہر کا نظارہ کر لیتا ہماری گلی میں ایک لمبا ترنگ آدمی تھا کا کے قائد رو یعنی نان ہائی کی دکان پر رات کو خیر گو نہا کرتا تھا اس کی گردن اونٹ کی طرح لمبی تھی اور جھک کر چلا کرتا۔ رات کو کا کے کی دکان میں خیر گو نہا تھا اور دن شہر سے باہر کسی تالاب پر مچھلیاں پکڑنے میں گزار دیتا۔ مجھے یقین تھا کہ یہی وہ سمرقند کا جن ہے جس کی کہانی آپو جی نے سنائی تھی۔ وہ جب مچھلیاں پکڑنے والی لمبی چھڑی کندھے پر رکھے، بغل میں تھیلہ لٹکائے گی میں سے گزرتا تو میں بھاگ کر مکان کی سیڑھیوں میں چھپ جاتا۔

لکا کے نانہائی کی دکان میں ایک کتا بھورا آدمی تھا جو قچے گھر ڈاکڑا تھا وہ سارے کا سارا بھورا تھا۔ پلکیں بھی بھوری تھیں اور آنکھیں میچ کر دیکھا کرتا۔ بالکل ان پڑھ تھا اس کے سر پر جن کا سایہ تھا۔ جب کبھی اسے دور پڑتا تو اس کی آواز بھاری ہو جاتی۔ وہ پوری آنکھیں کھول لیتا اور فر فر فارسی بولنی شروع کر دیتا۔ احمد رفوگر کو آدمی سے زیادہ مثنوی مولانا روم یاد تھی۔ اس نے ایک بار جن کی فارسی کا امتحان لیا اس نے بھورے سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے؟ بھورے نے کہا۔

”میرا نام سلیمان جن ہے اور میں ایران سے آتا ہوں۔“

”کیا تم ہمیں مولانا روم کی مثنوی کے شعر سناسکتے ہو؟“

سلیمان جن نے ترنم سے مثنوی رومی سنائی شروع کر دی۔ دکان پر محلے والوں کا جھگڑا لگا تھا۔ مولوی سلام بابا پر قورقت طاری ہو گئی۔ احمد رفوگر بھی سر جھکائے جھوم رہا تھا۔ سلیمان جن نے کہا:

”اب بتاؤ کون سا پہل کھاؤ گے؟“

احمد رفوگر نے کہا۔

”کوئی بے موسمی پہل آنا چاہیے۔“

بھورے نے اپنے جسم کو سمیٹ کر ماتہ واسکٹ کے اندر ڈالا اور ایک سرخ قندھاری اناڑ نکال کر تخت پوش پر رکھ دیا حالانکہ وہ موسم اتاروں کا نہیں تھا۔ لوگوں نے فرط عقیدت سے اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر بعد سلیمان جن نے کہا:

”اچھا اب ہم جلتے ہیں، پھر ملیں گے۔“

یہ ساری گفتگو وہ فارسی زبان میں کر رہا تھا جس کا ترجمہ ساتھ ہی ساتھ احمد رفوگر لوگوں کو سناتے جاتا تھا جن چلا گیا تو بھورا نیم جان سا ہو کر تخت پوش پر لیٹ گیا۔ جب ہوش آیا تو وہ ویسے کا دلیا آن پڑھ تھا اور وہ فارسی کی الف ب سے بھی ناواقف تھا، ضعیف الاعتقاد عورتیں اور مردوں نے بھورے کو اپنا پیرو بنا لیا اور منتیں ماننے کے بعد پھر کبھی اس کی شکل نہ دیکھی۔

بھاری ساتھ والی گلی میں ایک سیکہ پر بھی جن آتا تھا۔ ظاہر ہے اس کا جن بھی کوئی سکھ ہی ہو گا یا اگر سکھ نہیں تھا تو دو تین بار اس سیکہ پر آنے کے بعد خود بھی سکھ ہو گیا ہو گا ویسے بھی اس جن کے سکھ ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے جو ایک سکھ پر آجائے۔ میرا خیال ہے جن لوگوں نے اس سر کے سکھ دیکھے ہیں انہیں جن دیکھنے کی حاجت نہیں ہو گی۔ یہ سیکہ جو بھاری ساتھ والی گلی میں رہتا تھا۔ ایک ترکھان تھا اور نہایت شریف آدمی تھا۔ وہ لوگ جن کو مسان کہتے تھے۔

جس وقت سکھ کو دورہ پڑتا تو وہ پتے سر کو اس زور سے جھٹکا دیتا کہ گڑھی اچھل کر دور جا پڑتی اور کیس کھل جاتے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بالوں کا سوٹ کیس کھل جاتا اس کے سر کے بال مونچھوں کے بال ڈاڑھی کے بالوں میں الجھ جاتے اور وہ ایک ٹانگ پر رقص کرنا شروع کر دیتا۔ اس سے پہلے

میں نے اتنا زیادہ کھلا سکھ کبھی نہیں دیکھا تھا اس کے گھروں کے سامنے والی ٹولی کو بلا لیتے جو سارا سارا دن اور ساری ساری رات ڈھول کا کھڑکا اور چھینے بجا بجا کر محلے والوں کا ناک میں دم کر دیتے۔ سکھ بے چارے کو ہرل کی دھونی دیتے مگر جن اس بے چارے سکھ کو بچائے چلا جاتا۔ بھلا جو جن سکھ کو برداشت کر سکتا تھا۔ ہرل کی دھونی اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتی تھی۔

سان عام طور پر ہندو سکھوں کے گھروں میں آتے تھے اور جن مسلمانوں پر سوار ہوتے تھے۔ چیللیں اجاڑ باغوں، اور ویران، پرانی حویلیوں میں ڈیرہ لگاتی تھیں۔ چیلڈرے درختوں میں بیٹھ کر تے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی شکل میں آدھی رات کے وقت مسافروں کو ملتے۔ ان کا راستہ روکتے، قہقہے لگاتے اور پھر انہیں بے ہوش کر کے غائب ہو جاتے۔ ان کے رنگ کالے ہوتے اور منڈے ہوئے سروں پر لمبی بودیاں ہوتی تھیں۔ ہماری گلی میں پور بیٹے کا لڑکا کلا تھا اور اس کی لمبی بودی تھی ہم اسے چھیڑا کہہ کر روڑے مارا کرتے تھے۔

ہمارے محلے میں ہی ایک دائی رہتی تھی جس کا ہم مجھے معلوم نہیں کیا تھا لیکن محلے میں وہ اپنی ڈب ڈبی کے نام سے مشہور تھی۔ محلے کی ایک پوری نسل کی دایہ گری اسی نے کی تھی۔ سرخ و سفید بھاری بھر کم بڑی رعب داب والی کٹھیری عورت تھی۔ اس کے بارے میں ایک دلچسپ کہانی مشہور تھی۔

کہتے ہیں کہ سردیوں کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ اس سر شہر سنان پڑا تھا۔ آپنی ڈب ڈبی کا گلی لیے لحاف میں گہری نیند سو رہی تھی کہ اچانک کسی نے دھڑ دھڑ دروازہ پٹیا شروع کر دیا۔ آپنی ڈب ڈبی کی آنکھ کھل گئی۔ کمرہ پر مڑ کر منہ پر ماتھ پھیرا۔ نیچے کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا کھڑکی کھول کر چپ اٹھا کر گلی میں جھانکا۔

”کون ہے؟“

سمجھ گئی کہ کوئی ارجنٹ کیس آیا ہے۔ نیچے سے کسی مرد نے آواز دی۔

”بہن جی! جلدی چلیے۔ زچہ کی حالت بہت خراب ہے۔“

آپا ڈب ڈبی نے اپنے جوان بیٹے کو جگایا۔ نیچے آئی۔ دیکھا کہ ایک نورانی چہرے والا آدمی کھڑا ہے کہنے لگا۔

”بہن جی! میری بہو کے بچہ ہونے والا ہے میرے ساتھ چلے۔“

”اومی رات سخت سردی، ایک اجنبی کوئی۔ اپنی ڈب ڈبی نے کہا:“

”بھائی جان آپ کو میں نے پہلے یہاں نہیں دیکھا۔ آپ کس محلے سے آئے ہیں؟“

اس آدمی نے کہا:

”بہن! ہم اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ آپ کی بڑی تعریف سنی ہے سوچا تھا۔ بہو کو بچہ

ہونے والا ہوگا تو آپ ہی کو بلائیں گے۔ آج خدارہ دل لے آیا ہے۔ سو آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں،

برائے مہربانی جلدی چلے۔ آپ جتنی رقم کہیں گی میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔“

اپنی ڈب ڈبی نے کہا۔

”جانا کہاں ہوگا؟“

وہ آدمی بولا۔

”زیادہ دور نہیں۔ بس یہی کوئی دو محلے چھوڑ کر ہی اپنا گھر ہے۔ خدارا دیر نہ کریں۔ میری بہو کو اس

وقت آپ کی سخت ضرورت ہے۔“

اپنی ڈب ڈبی نے کہا:

”میں سو روپے لوں گی؟“

اس نورانی چہرے والے آدمی نے کہا:

”میں آپ کو دو سو روپے دوں گا۔ آپ میرے ساتھ چلے جائیں۔“

دو سو روپے آج سے پچاس برس پہلے پانچ ہزار سے کچھ زیادہ ہی قیمت رکھتے تھے۔ اپنی

ڈب ڈبی لالچی عورت تھی فوراً تیار ہو گئی۔ اس نے گرم شال جسے ہم امرتسری کشمیری فرد کہا کرتے تھے لٹھی

کا گٹری میں تھے کوٹے ڈال کر ساتھ لیا اور گئی۔ باہر آگئی۔ بازار سناٹا تھا۔ سخت سردی تھی ایک

تانگہ کھڑا تھا۔ بڑا خوبصورت تانگہ تھا۔ سفید گھوڑا جتنا تھا جس کا ساز چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔

کوچوں خاموش بیٹھا تھا۔ اپنی ڈب ڈبی تلنگے میں سوار ہو گئی۔ وہ نورانی صورت والا آدمی بھی آگے بیٹھ

گیا اور تانگہ ہوا سے باتیں کرنے لگا بازار ختم ہو گیا۔ تانگہ گوالی گیٹ سے باہر نکل آیا۔ اور ٹھٹھری رات

کی خاموشی میں ایک ویران سڑک پر موڑنے لگا۔ اپنی ڈب ڈبی نے پوچھا کہ بھائی صاحب آپ کہاں جاتے

ہیں؟

اس آدمی نے بڑی ملائمت سے کہا۔

”بہن! ہمارا مکان ذرا شہر سے باہر ہے آپ گھبراہٹیں نہیں۔ ہمارا آدمی آپ کو واپس گھر چھوڑ کر

آئے گا۔“

تانگہ اب جرنیلی سڑک پر آگیا تھا اور بڑی برق رفتاری سے اڑا چلا جا رہا تھا۔ اپنی ڈب ڈبی کو اپنی

کا گٹری سنبھالنی مشکل ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ اسے تیز ہوا میں بھی

نہیں لگ رہی۔ جب تانگے نے بجلی والی نہر کا پل عبور کیا تو وہ گھبرا گئی اس نے کہا:

”تانگہ روک دیں میں آگے نہیں جاؤں گی۔“

اس آدمی نے کہا۔

”بہن پریشان نہ ہوں۔ ہم غریب لوگ ہیں بڑے شریف ہیں۔ یہو بیٹیوں والے ہیں بس مکان

آنے ہی والا ہے۔“

اور پھر بجلی والی نہر سے کوئی آدمی مل آگے جا کر تانگہ دانیں جانب کھینچوں میں گھوم گیا اور تھوڑی

دور جا کر کھڑا ہو گیا۔

”تشریف لائیے۔“

آپا ڈب ڈبی نے دیکھا سامنے ایک جھونپڑا تھا وہ آدمی اسے ساتھ لے کر جھونپڑے میں

آگیا۔ وہاں ایک چراغ جل رہا تھا جس کی مدد سے روشنی میں ایک عورت چار پائی پر لیٹی دروازہ میں مبتلا

تھی۔ اپنی ڈب ڈبی فوراً اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جھونپڑے میں ایک فونائیدہ بچے کے

رونے کی آواز بند ہوئی۔ لڑکا پیدا ہوا تھا۔ نورانی صورت والے بزرگ نے اپنی ڈب ڈبی کا شکریہ ادا

کرتے ہوئے کونے میں سے کچھ کچے کوٹے اٹھا کر اس کی کا گٹری میں ڈالے اور کہا:

”ہماری طرف سے یہ حقیر تحفہ قبول کر دیجئے۔“

اپنی ڈب ڈبی کو سخت غصہ آیا کہ یہ لوگ آدمی رات کو اسے اٹھا کر لائے اور اب اسے کوٹے

النعام میں دے رہے ہیں۔ ویسے وہ کچھ ڈر بھی گئی تھی اور وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ ان لوگوں کا ایک

آدمی اسے تانگے میں بٹھا کر گھر چھوڑ گیا۔ اپنی ڈب ڈبی نے غصے میں اگر ان کے دیئے ہوئے کوٹے راستے

میں پھینک دیئے۔ رات تین بجے وہ گھر پہنچی۔ خدا کا شکر ادا کی کہ جان بچا کر آئی۔ صبح اٹھ کر کالگوسی کو دیکھا تو وہاں رات کے بچے ہوئے جو دو ایک کوٹے رہ گئے تھے وہ سونے کی ڈلیوں میں تبدیل ہو چکے تھے آپنی ڈب ڈبی سرپیٹ کر رہ گئی۔ اصل میں وہ لوگ جن تھے اور انہوں نے اسے کوٹے کی شکل میں سونے کی ڈلیاں انعام کے طور پر دی تھیں۔ صبح آپنی ڈب ڈبی اپنے لڑکے کو لے کر رات والی جگہ کی طرف گئی مگر وہاں اب نہ وہ جھونپڑی تھی اور نہ وہ لوگ۔

چھ ہرٹہ کی طرف جاتے ہوئے خالصہ کلچ کے عقب میں رام تیرتھ روڈ تھی۔ اس سڑک پر ایک پرانا مندر تھا جہاں ایک زمین دوز کھڈ تھا جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔ اس کھڈ کے بارے میں مشہور تھا کہ بن باس کے دنوں میں سینا اپنے کپڑے یہاں دھویا کرتی تھی۔ اس کھڈ کے اوپر لکیر کا درخت تھا جس میں ایک چڑیل کا بیرا تھا۔ لوگ اس طرف نہیں جاتے تھے۔ شریف پورے کا ایک درزی چھ ہرٹہ کھڈنگ فیکٹری میں ڈیوٹی دے کر واپس آتا تھا کہ رام تیرتھ روڈ پر مندر کے پاس آندھی شروع ہو گئی۔ آسمان ہلکی کے رنگ کا سا ہو گیا۔ ہوا کا اتنا زور تھا کہ درخت دھیرے دھیرے جارہے تھے۔ درزی ایک درخت کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس تیز آندھی میں مندر کی طرف سے ایک کھلے بالوں والی عورت ہاتھ پر چراغ رکھے اس کی طرف چلی آرہی ہے۔ اس قدر برق رفتار ہوا میں بھی چراغ کی لو بالکل سیدھی تھی۔ درزی کو ایک دم رام تیرتھ کی چڑیل کا خیال آ گیا۔ عورت اب قریب آگئی تھی اور اس کے باہر نکلتے ہوئے دو لمبے دانت درزی کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔

وہ ایک دم اٹھا اور شریف پورے کی طرف دوڑا گھر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے گھبرہٹ میں زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

”دروازہ کھولو ماں! دروازہ کھولو“

”کھولتی ہوں۔“

اندر سے ماں کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھل گیا اور درزی ایک بھیاںکے صبح مار کر سیرھیلوں میں بیٹھ بیٹھ ہو گیا کیونکہ دروازہ رام تیرتھ کی چڑیل ہی نے کھولا تھا۔

ہمارے خالوجان فرصت کے اوقات میں بچوں کو قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ ایک بار وہ اپنی کوٹھڑی میں اپنے ایک شاگرد سے پاؤں دہوارہ ہے تھے انہوں نے کہا۔

”عبدالرحمان! بیٹا چراغ کی لو اونچی کر دو۔“

کوئی پندرہ فٹ کے فاصلے پر طاق میں دیا جل رہا تھا۔ عبدالرحمان نے چار پائی پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر پندرہ فٹ لمبا کیا اور دیکھے کی لو اونچی کر دی۔ خالوجان نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

”پچ پچ بتاؤ کون ہے؟“

لڑکے نے ادب سے کہا:

”پیر جی! میں عبدالرحمان جن ہوں اور کابل سے آپ سے قرآن شریف پڑھنے آیا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں نے اپنا آپ ظاہر کر دیا۔ مجھے معاف کر دیں اور قرآن شریف مزور پڑھائیں۔“

خالوجان نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ بھرا اور کہا۔

”بیٹے عبدالرحمن! ہم تمہیں پورا قرآن پڑھائیں گے لیکن ذرا دو چار قندھاری اٹار تو کابل سے لاؤ۔“

عبدالرحمن جن نے ہاتھ جیب میں ڈال کر چار قندھاری اٹار باری باری نکالے اور خالوجان کو پیش کئے۔

”سبحان اللہ! بس میاں ہمیں دو چار قندھاری اٹار روز لا کر کھلا دیا کرو۔“

خالوجان نے کہیں ایک محفل میں یہ کہہ دیا کہ کابل کا عبدالرحمن نامی مسلمان جن ان سے قرآن شریف پڑھتا ہے ایک آدمی نے مذاق اڑتے ہوئے کہا کہ وہ کسی جن بھوت کو نہیں مانتا۔ یہ سب باتیں جھوٹ ہوتی ہیں۔ دوسرے روز صبح لوگوں نے دیکھا کہ وہ آدمی مسجد کے کنوئیں میں رہنے کے ساتھ اٹاٹا ہوا ہے، وہ دبائی دے رہا تھا کہ مجھے عبدالرحمن سے بچاؤ۔ میں اب کبھی مذاق نہیں اڑاؤں گا۔ خالوجان نے عبدالرحمان سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ کام اسی نے کیا ہے اس کے بعد عبدالرحمن جن صرف رات کے وقت خالوجان سے قرآن پڑھنے آتا تھا۔ جب پورا قرآن ختم ہو گیا تو وہ غائب ہو گیا۔ خالوجان کہا کرتے تھے کہ عبدالرحمان جن جاتے وقت انہیں سونا بنانے کا نسخہ بتا گیا تھا لیکن ہم نے کبھی خالوجان کے ہاتھوں سونا بننے نہیں دیکھا۔

تیز دھوپ اور گرم لومیں سکتری باغ سنان تھا ایک نوجوان مانی جیواں کی خانقاہ کی طرف چلا آ رہا تھا اس نے دیکھا سرو کے ایک درخت کے پاس سبز لیشی کپڑوں میں ملبوس ایک نہایت حسین عورت جو اہر ت بیٹے کھڑی ہے اتنی حسین عورت اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی جب وہ اس کے

قریب سے گزرا تو عورت نے پوچھا۔

”بڑی نہر کو کون سی سڑک جاتی ہے؟“

نوجوان نے دیکھا کہ عورت کی آنکھوں سے شعاںیں پھوٹ رہی تھیں اور اس کا جسم گویا شیشے کا تھا اور نظر جسم سے اکر پار جا رہی تھی۔ وہ ڈر گیا اس نے سن رکھا تھا کہ وہ پہلوں میں بارغ میں چڑیلیں شہزادیوں کا روپ دھار کر مٹی ہیں۔ وہ بھاگنے لگا تو اس کے پاؤں گویا پتھر بن گئے۔ حسین عورت نے اس کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس حسین چڑیل نے نوجوان کا ہاتھ تھاما اور اسے ساتھ لے کر بڑی نہر والے پل کی طرف روانہ ہو گئی اس کے چمنے سے چمن چمن کر آواز پیدا ہو رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ نوجوان دکھائی نہیں دیا۔ کتنی رومانٹک تھیں امرتسر کی چڑیلیں بھی! اب تو نہ سرو کے درخت ہیں اور نہ بڑی نہر کو جانے والی سڑکیں ہیں اور نہ وہ رومانٹک چڑیلیں ہیں جو حسین شہزادیوں کا روپ دھار کر مٹی تھیں اور باتہ تمام کر اپنے ساتھ لے جا کر گم کر دیا کرتی تھیں۔ اب تو ہر سڑک کسی دفتر یا کسی کارخانے کو جاتی ہے اور ایک کارخانے سے نکل کر دوسرے کارخانے کی طرف چل پڑتی ہے۔ سرو کے درخت کارخانوں کے کیمیکلز کے نسواری دھوئیں سے مر جھا گئے ہیں اور نہزوں میں کارخانوں کا تیل مل گیا ہے۔ قرآن شریف پڑھنے والے جن شہر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور چڑیلیں ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں سو رہی ہیں۔

جی میں آتا ہے کہ کسی جھستی لو والی گرم دوپہر میں امتاس کے زرد پھول لے کر چڑیل کی تلاش میں نکلے اور جب وہ کسی سرو کے درخت سے حسین شہزادیوں کے ریشمی سبز لباس میں کھڑی مجھ سے بڑی نہر کا راستہ پوچھے تو میں اس کی طرف بڑھوں، اس کا ہاتھ تھاموں اور اسے ساتھ لے کر الیا جاؤں کہ پھر کبھی واپس نہ آؤں۔

نور بھی ہانی جیک نہیں ہوتا

مولوی حسن اپنے چیل منڈی والے مکان کی میٹھک میں انگلیٹھی پر نیلی کیتلی رکھے پائے اُبال رہا تھا کہ ہم کا دھماکہ ہوا۔ برج پھولا سنگھ کے اکالی سکھوں نے دروازہ مہاں سنگھ پر حملہ کر دیا تھا۔ مولوی حسن ہانکی لے کر دروازے کی طرف بھاگا۔ رزاق رفوگر چارپائی کی پٹی لے کر اٹھ دوڑا چوٹی بد معاش کے ہاتھ میں سر یا تھا۔ رفیق گاڈی خالی ہاتھ اکالیوں کی کرپاؤں اور انفلوں کا مقابلہ کرنے جا رہا تھا میں اس زمانے کی نیگر جنریشن تھا۔ میں ان کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ میرے اور ان لوگوں کے درمیان کوئی چیز نہیں گپ نہیں تھا۔ جہاں مولوی حسن کے قدم اٹھتے تھے وہاں میرے قدم پڑتے تھے۔ جنریشن کیپ وہاں نمودار ہوتا ہے جہاں نہ پرانی نسل کا ہو اور نہ نئی نسل کا ہو۔ لیکن مارچ ۱۹۴۷ء کی اس دوپہر کو ہمارے سامنے زندگی کا مقصد موجود تھا۔ پرانی نسل کے سامنے بھی اور نئی نسل کے سامنے بھی۔ اور یہ مقصد تھا پاکستان۔ ایک ایسی جنت جہاں ہیں مہندو زمین پر بٹھا کر جانوروں کی طرح پانی نہیں پلائے گا۔ جہاں وہ ہولی کے تہوار پر نیم غریاں ہو کر فحش گیت گاتا، رقص کرتا۔ ہمارے گلی محلوں سے نہیں گزرے گا اور ہمارے تعزیوں پر گندگی نہیں پھینکے گا اور خود روپوں سے بھری ہوئی تجویزوں کے آگے گاؤں کیوں پر بیٹھ کر مسلمان نوکروں سے چلیں نہیں بھروائے گا اور جہاں ہماری مسجدوں کی اذانیں بھند سکھوں کی براتوں کے بینڈ کے شور میں گم نہیں ہوں گی اور جہاں کوئی شدھی اور سنگٹن کی تحریک نہیں چلائی جا سکے گی اور جہاں ایک خدا، ایک رسول، ایک قرآن کو ماننے والے اپنے دینی تقاضوں کے مطابق آزادی عزت و نفس اور امن و سلامتی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گے۔ یہ ہمارا مقصد حیات تھا یہ ہماری منزل تھی اور یہ ہمارے سفر نور کا آغاز تھا جنریشن کیپ کا لفظ ہمارے لئے لغت غریب تھا۔ اور پھر کیا ہوا؟ مولوی حسن شہید ہو گیا۔ رفیق گاڈی کی ایک ٹانگ کٹ گئی۔ رزاق رفوگر

آنکھوں میں بندوق کے چہرے کھا کر گر پڑا۔ چوٹی بد معاش نے کے رہیں گے پاکستان کے نعرے لگاتے رہیں گے۔
 مچھلا سنگھ کی دیوار پھلانگ کر کالی سکھوں کے اوپر جاگرا اور پھر واپس نہ آیا۔ مولوی حسن رفیق گاڈی، رزاق رتوگر
 اور چوٹی بد معاش مشرقی پنجاب کے ہر شہر ہر گاؤں ہر گلی میں تھے۔ وہ زخمی ہوئے شہید ہوئے لیکن نور
 کا سفر جاری رہا۔ جالندھر سے قافلے چلے، سو شیار پور، گورداسپور، روہتک، پانی پت، سونی پت
 انبالہ، لدھیانہ اور پٹھانکوٹ سے نور کے مسافروں کے قافلے چلے اور ایک سنگ میل سے دوسرے
 سنگ میل تک اپنے جگر کے ٹکڑوں کی لاشیں ڈالتے آگے بڑھتے رہے۔ دلی سے مہاجرین کی بھری
 ہوئی ٹرینیں چلیں جالندھر، فیروز پور سے ریلیں روانہ ہوئیں اور لاہور ریلوے سٹیشن پر ان خون سے بھری ہوئی
 ریلوں سے نور کے مسافروں کی کٹی ہوئی لاشیں باہر نکالی گئیں۔ لاکھوں زندہ لاشیں اغواء کر لی گئیں ان لاشوں
 کے بھائی ان لاشوں کے خاوند اور ان لاشوں کے باپ مہاجرین کی پیوں اور بازیاختہ خواتین کے کیوں کی خاک
 اڑاتے مر گئے۔ ایک نور کے مسافر نے واگہ باڈر پر پاکستان کا لہراتا جھنڈا دیکھ کر کلمہ پڑھا اور جان پاک
 مر زمین پر نچا کر دی۔ دوسرے نے لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اپنے آدھے کتے ہوئے
 سینے پر ہاتھ رکھ کر پاکستان کے نیلے چمکے نورانی آسمان کو دیکھا اور شہید ہو گیا۔ کوئی راستے میں گرا اور پھر
 نہ اٹھ سکا۔ کوئی منزل نور پر اکر دم توڑ گیا۔ نہ ماں نہ بہن نہ بھائی نہ گھر نہ ہار نہ آسمان۔ سب کچھ خون کی لال
 آندھی میں گم ہو گیا شعلوں میں جل کر رکھ ہو گیا۔ مگر نور کی پہلی سیڑھی مل گئی۔

اندلس میں ڈوبا ہوا آفتاب پاکستان کے افق سے طلوع ہو گیا۔ بادِ سحر میں اذان کی آواز گونج
 اٹھی۔ مسجدوں اور گھروں کی فضائیں درود و سلام اور تلاوت کلام پاک سے معمور ہو گئیں۔ معرکہ بدر کے
 بعد حق اور باطل کے درمیان کیر کچھ گئی۔ رات بھی بہت اندھیری تھی۔ دن بھی بہت روشن نہکل آیا۔ جتنی
 عظیم قربانی تھی۔ اتنا ہی عظیم انعام ملا۔ شرف ملا۔ عزت نفس ملی۔ اپنے دین کی راہ پر چلنے کا حق حاصل
 ہوا۔ بحرِ طلمات سے نکل کر نور کی منزل کا سفر شروع ہوا۔ اس سفر میں خود غرضی، حسد، منافقت اور خویش
 پروری کی آندھیاں بھی چلیں مگر نور کا چراغ روشن رہا۔ نور کا سفر جاری رہا۔ اس لئے کہ نور کے چراغ میں
 شہیدوں کے خون کا روغن تھا۔ یہ صدقہ جاریہ تھا اور اس نور میں کاسر چشمہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور
 مکی تھا اور خدا کا نور علی نور تھا۔ اس نشاۃ الثانیہ کے نورانی سفر کی تیس منزلیں گزر گئیں۔ ایک نئی نسل
 جو ان ہو کر سامنے آگئی۔ ہم ہر منزل پر اپنے صیہوں پر سونے چاندی کے قول چڑھانے لگے رہے

اور نئی نسل رنگ کی جیسے پہن کر ڈونا سمر اور اینڈی گب کے پاپ میوزک کی تیز لے پر تھرکتی ہمارے سامنے
 آگئی۔ ہمارے مسئلہ یہ رہا کہ کوٹھی کارینک پلیس کہاں سے آئے۔ اور نئی نسل کا مسکہ یہ تھا کہ ساٹھ میل کی
 رفتار پر سکو ترے کر لبرٹی میں کس لڑکی کے ساتھ بیٹھ کر سو روپے کا چائینز پنچ کھایا جائے ہم نئی نسل سے
 نفرت کرنے لگے۔ نئی نسل ہم سے نفرت کرنے لگی۔ ہم نے انہیں یہ سکھایا کہ انسان کی عزت کار، کوٹھی
 عہدے اور دولت سے ہوتی ہے۔ اقبال کی خودی کو ہم نے سونے کی ڈوری سے باندھ کر اپنی مرید پڑکار
 کے پچھلے شیشے پر لٹکا دیا نئی نسل سوالیہ نشان بن کر کبھی کبھی ہماری طرف دیکھتی ہے اور پوچھتی ہے کہ ہم نے
 انہیں کیا دیا؟ پاکستان کیوں بنا تھا؟ لوگ شہید کیوں ہوئے تھے؟ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کی کوٹھی
 ہوئی ریل گاڑیاں کیوں آتی تھیں؟ اور ہم نئی نسل کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ رکھ کر اسے لبرٹی کی طرف
 کڑا ہی گوشت کھانے بھیج دیتے ہیں۔ ہم نے انہیں کبھی یہ نہیں کہا کہ واگہ باڈر پر بی آر بی نہر کے کنارے
 بھی ایک لبرٹی ہے۔ فریڈم ہے آزادی وطن کے پر نور مینار ہیں جہاں عزیز بھٹی شہید اور سوار محمد حسین
 شہید ہماری نشاۃ الثانیہ کی منزل کی تاریکیوں کو اپنے خون رنگ آجالوں سے منور کر رہے ہیں۔ ہماری یہ کوتاہی
 یہ چشم پوشی یہ تن آسانی ہمیں ہلاک کر دینے کے لیے کافی ہے لیکن ہمارے اجداد کی قربانیاں اتنی عظیم
 ہیں کہ ہماری کشتی ہر طوفان سے صحیح و سلامت نکل آتی ہے۔ زبر اگر ہلاکت خیز ہے تو تریاق اس
 سے زیادہ زندگی بخش ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہماری نئی نسل بے راہ نہیں۔ بے ذوق نہیں
 وہ جانتا چاہتی ہے۔ سمجھنا چاہتی ہے۔ ہمارے قدم سے قدم ملا کر منزل نور کی طرف بڑھنا چاہتی
 ہے۔ وہ ہم سے سوال کرتی ہے کہ سر سید احمد خاں نے کتاب اسباب بغاوت ہند کیوں لکھی تھی۔ اور
 علامہ اقبال نے الہ آباد میں ایک الگ اسلامی مملکت کا تصور کیوں پیش کیا تھا۔ اور قائد اعظم نے کیوں
 کہا تھا کہ ہم ایک علیحدہ اسلامی ملک چاہتے ہیں؟ ہم ان سوالوں کا حجاب دینے کی بجائے نئی نسل کو
 اینڈی گب کے پاپ میوزک کی نئی کیسٹ دے کر لبرٹی کی طرف سکوٹر پر روانہ کر دیتے ہیں۔ لیکن
 اب ہیں ایسا نہیں کرنا ہوگا۔ جیں چکیلی کاروں کے ریس کورس سے باہر نکل کر نئی نسل کا ہاتھ مقام کراے
 بتانا ہوگا کہ سر سید کون تھا۔ چودھری رحمت علی کون تھا۔ سید احمد شہید کیوں شہید ہوئے۔ گاندھی
 جی اور پٹیل نے کیوں کہا تھا کہ قائد اعظم فریبے نہیں جاسکتے۔ علامہ اقبال کے الہ آباد والے خطبے کا
 متن کیا تھا۔ اور عزیز بھٹی شہید بی آر بی کے کنارے تیر دن بغیر کچھ کھائے پیئے کیوں اپنے مورچے

میں ڈنارہ اور سوار محمد حسین شہید المومنین کا کبس لئے برستی گولیوں میں کیوں نکل پڑا تھا اور مینار پاکستان چاندنی راتوں میں فضا نے بیٹھ کی رفتوں میں کن روشن ستاروں سے باتیں کرتا ہے؟ ہمیں انہیں بتانا ہو گا کہ لاہور شہر کے سبھی راستے میوزک کی دکانوں سپر مارکیٹوں اور پلازوں کی طرف نہیں جاتے۔ ایک راستہ علامہ اقبال کے مزار کو اور ۶۵ کی جنگ کے شہیدوں کی یادگاروں اور مینار پاکستان کو بھی جاتا ہے۔ یہ تہی نسل کا ہم پر قرض ہے۔ جو ہمیں ادا کرنا ہے۔ اگر ہم نے یہ قرض، یہ قرض ادا نہ کیا تو پاکستان تو سلامت رہے گا۔ لیکن آنے والی نسلیں ہمارے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔

میں پھولوں درختوں گرتے پتوں اور وطن پاک کی نرم خیز صبحوں اور سنہری چائے کی خوشبوؤں کا افانہ نگاہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ میرے سارے پھول، سارے درخت اور درختوں سے گرتے پتے اور طلوع ہوتی۔ صبحوں کے اُجالے اور سنہری چائے کی خوشبوئیں پاکستان کی مٹی سے پیوستہ ہیں میرے باغوں میں پھول اس لئے کھلتے ہیں کہ میں پاکستان میں ہوں۔ سنہری چائے میں نہک اس لئے ہے کہ اس میں وطن پاک کی بہادری کی خوشبو شامل ہے۔ میں فقیر ہو کر بھی یہاں بادشاہ ہوں۔ کیونکہ یہاں میری عزت نفس اور میری آنے والی نسل کا مستقبل محفوظ ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس سرزمین کو ہواؤں میں مولوی حسن ایسے تحریک پاکستان کے لاکھوں شہیدوں کی نہک زچی ہے اور لاکھوں ماؤں بہنوں کی ناقابل فراموش قربانیوں کے سورج اس سرزمین کے ذرے ذرے میں جگمگا رہے ہیں۔ یہ ملک اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے لیے شہیدوں کے خون رنگ شفق سے لازوال سورجوں کی روشنیاں لے کر طلوع ہوا ہے۔ یہ زندہ رہنے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ ہمیں اپنے کردار دین کے بتائے ہوئے اصولوں کے سانچے میں ڈھال کرنی نسل کے لئے ایک مثال بننا ہو گا۔ اسی میں ہماری نئی نسل اور آنے والی نسل کی بقا ہے۔ پاکستان ایک طرز فکر ہے۔ ایک رویہ ہے ایک سفر ہے روحانی ارتقا کا دین مبین کے نور کا۔ اور نور کبھی ہانی جیک نہیں ہوا کرتا۔

الوداع مسجد کے مینارو

گلی کے دروازے پر ہم پھٹا تو ایک کہرام مچ گیا۔ کوئی دروازہ میاں سنگھ کی طرف، کوئی لال چوٹی کی طرف اور کوئی الہی گوجر والی گلی کی طرف۔ جدھر جس کا منہ اٹھا دوڑ پڑا۔ لوگوں نے اپنا اپنا سامان ہاندھ کر رکھا تھا کہ مسلم لیگ کے ٹرک انہیں گے تو اس میں لاؤ کر شریف پورہ کیمپ پہنچ جائیں گے۔ ٹرک آنے سے پہلے ہندو فوج آگئی۔ اور انہوں نے ہم مار کر گلی کا آہنی دروازہ اٹا دیا۔ ہماری گلی میں دوسرے محلوں کے مسلمانوں نے بھی اگر پناہ لے رکھی تھی۔ ان میں عورتیں بچے بوڑھے جوان تھے۔ ہم کا دھماکہ ہوا تو ہر کوئی سامان وہیں چھوڑ کر دوسری طرف کو بھاگا۔ گلی کی دوسری طرف سے دو تین راستے باہر جی ٹی روڈ کی طرف جاتے تھے جی ٹی روڈ سے آگے بائیں گراؤنڈ تھی اور سامنے شریف پورہ تھا۔ شریف پورے کے باہر بلوچ رجمنٹ کے جوان کیمپ کے مسلمانوں کی حفاظت پر مامور تھے۔ گلی میں بھگدڑ مچی تو مسلمان بھاگ کر جی ٹی روڈ پر آ گئے۔ ایک طرف سے سکھ اور دوسری طرف سے ہندو فوج فائرنگ کر رہی تھی۔ کئی عورتیں، بچے اور جوان شہید ہو کر گرے۔ کوئی خانقاہ کی لائبریری کے باہر اور کوئی بدرو میں اور کوئی تاروں والے بارغ میں۔ اس قسمی مسلمان شریف پورے کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ شاید کسی نے بھی زندگی میں نہیں سوچا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا۔ ایک دن ایسا بھی آ سکتا ہے کہ وہ آگے آگے ہوں گے اور پیچھے ہندو سکھ ان پر گولیاں برسا رہے ہوں گے۔ شاید ہندو سکھوں نے ایسا سوچ رکھا تھا۔ کاش مسلمان بھی کچھ سوچتے، کچھ فکر کرتے، کچھ آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر دیکھنے کی کوشش کرتے۔

جب یہ پریشان حال عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے شریف پورے کے قریب پہنچے تو بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے انہیں مشین گنوں کا تحفظ دیا۔ یہاں تک جو مسلمان اپنی جانیں بچا کر

آئے تھے وہ شریف پور سے پہنچ گئے۔ شریف پور میں امرتسر شہر کے مشرقی حصے کے ہزاروں مسلمان جمع تھے۔ دکانداروں نے سارا مال باہر لاکر رکھ دیا تھا اور انہوں نے اپنے بیچ رہے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اب وہ وہاں سے ہمیشہ کے لیے کوچ کرنے والے ہیں۔ پتہ نہیں زندگی میں انسان کیوں ذلیل ہو کر رہتا ہے۔ بلیک مارکیٹ کرتا ہے۔ چیزوں کو مہنگے سے مہنگے داموں میں فروخت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ ایک دن یہاں سے بھی اسے کوچ کرنا ہے۔ زندگی کا شریف پور بھی اسے کوچ کرنا ہے اور پھر کبھی لوٹ کر واپس نہیں آنا۔

پچھلے ہماری گلی کے مکانوں کو لوٹ کر بند و سکون نے آگ لگا دی۔ دیکھتے دیکھتے جی ٹی روڈ پار کے ہماری گلی کے مکانوں سے دھواں اٹھنے لگا۔ دھواں آگ اور لاشیں۔ یہ ان دنوں کے معمولات میں تھا ایک عجیب ناخوش سی جلی ہوئی بو تھی جس نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ نہ مکانوں سے اٹھتے شعلے دیکھ کر کسی کو حیرت ہوتی تھی اور نہ سڑک پر پڑی ہوئی لاش دیکھ کر کوئی رکتا تھا۔ شہر کے درختوں پر سے چڑیا، بلیں اور فاختائیں غائب ہو گئی تھیں۔ سارا سارا دن گدھیں منڈلایا کرتی تھیں اب امرتسر سارے کا سارا خالی ہو چکا تھا۔ شریف پور سے کی دوسری جانب ریلوے لائن گورتی تھی۔ اس لائن پر مال گاڑی کے چند ایک خالی ڈبے آگے گئے اور مسلمان مہاجرین سے دیکھتے دیکھتے بھر جاتے بلکہ ابل پڑتے اور پھر بولے بولے ریگتے ہوئے امرتسر ریلوے سٹیشن سے نکل کر لاہور کی جانب روانہ ہو جاتے ابھی پاکستان پہنچنا اتنا آسان نہیں تھا۔ راستے میں امرتسر سٹیشن تھا جہاں سکھ تواریں لے گھوم رہے تھے۔ آگے چھ مہلے کا سٹیشن تھا جہاں سکھوں کا بہت بڑا گودا رہا تھا اور جہاں کے نہنگ اور اکالی مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ گاڑیاں کٹ بھی رہی تھیں۔ لاشیں ریلوے لائنوں پر بکھر بھی رہی تھیں اور پاکستان کی منزل کا سفر بھی جلدی تھا۔

شریف پور سے کے جنوب میں تحصیل پورے کی آبادی تھی۔ یہاں سے ایک کچا راستہ لوکاٹ کے باغ میں سے ہو کر اوپر ریلوے لائن پر چلا جاتا تھا۔ میں نے اس کچے راستے کا ذکر اپنے امرتسر کے بد سے میں لکھے گئے افسانوں میں خاص طور پر کیا ہے اس راسے پر کھٹے کے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا اور مارچ اپریل میں جب ان درختوں پر سفید پھول کھلتے تو سارا راستہ خوشبو کی سرنگ بن جاتا تھا۔ منہ اندھیرے سیر کو جانے ہوئے میں خوشبو کی اس سرنگ میں سے بہت بہتہ بہتہ

گورا کرتا۔ یہاں کھٹے کے پھولوں کی اس قدر خوشبو ہوتی کہ سانس اندر کھینچنے کے بعد باہر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ سانس کے ساتھ جسم کے رگ و پے میں خوشبو کا ایک چکر بندھ جاتا تھا۔ سانس اور خوشبو کا فرق مٹ جاتا۔ کچھ پتہ نہ چلتا کہ سانس کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور خوشبو کہاں سے ختم ہو رہی ہے۔ ان دنوں میں سوچا کرتا تھا کہ جنت کو جانے والا راستہ بھی شاید اسی طرح کا ہوگا۔ منہ اندھیرے کے نور میں درختوں کی شاخوں پر سفید پھول نسیم صبح کے جھونکوں کے ساتھ گرا کرتے اور جب میں سیر سے واپس آتا تو یہ کچا راستہ سفید پھولوں سے بھرا ہوتا جیسے درختوں نے عبادت کرنے کے لئے سفید پاکیزہ چادر بچھا رکھی ہو۔ مجھے یاد ہے اس راستے پر پاؤں لے کر نہیں جاتا تھا اور باغ میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ آج یہ راستہ ویران تھا اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کھٹے کے درختوں پر کوئی پھول نہیں تھا خوشبو کی سرنگ میں سوختہ مکانوں اور جلی ہوئی لاشوں کی بو تھی۔

شریف پور خالی ہو رہا تھا مسلمان ٹرینوں میں بھر بھر کر پاکستان کی طرف کوچ کر رہے تھے راستے میں ان پر حملے بھی ہو رہے تھے مگر پاکستان کی طرف مہاجرین کا سفر جاری تھا۔ شریف پور کے سامنے لائن پار امرودوں کے بڑے وسیع اور ہرے بھرے باغ تھے۔ بڑے میٹھے اور گورے گورے امرود لگا کرتے تھے ان درختوں پر اور بڑے ظالم راکھے ان درختوں کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ اب یہ باغ بھی ویران تھے۔ امرود پک پک کر درختوں سے گر رہے تھے جگہ جگہ امرودوں کے ڈھیر لگے تھے کوئی راکھا نہیں تھا، کوئی مالک نہیں تھا کوئی ٹوکر نہیں تھا۔ امرودوں کے ڈھیر تھے جو گل سڑ رہے تھے مگر پھر بھی ان میں سے ہلکی ہلکی خوشبو نکل رہی تھی۔ پھل مر کر بھی خوشبو دیتا ہے اور انسان زندگی میں بھی کوئی خوشبو دیتا ہے انسان کے اندر کا امرود شاید مر گیا ہے۔

آخر ہم بھی ایک مال گاڑی میں بیٹھ کر شریف پور سے، امرتسر سے، کپنی باغ اور مسجد خیر الدین کے امرتسر سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ امرتسر ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر چار پر اگر گاڑی رگ گئی ایک دہشت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بلوچ رجمنٹ کے جوان سٹیشن کی چھت پر لیٹے میٹلا مندر کی طرف سے آنے والی ہندوؤں کی فائرنگ کا جواب دے رہے تھے۔ جب تک گاڑی امرتسر کے سٹیشن پر کھڑی رہی لوگوں کا دم خشک رہا۔ خدا خدا کر کے ٹرین نے بولے بولے کھٹنا شروع کیا۔ ریلوے یارڈ گزرا، اگیو برج گزر گیا۔ امرتسر شہر پر نگاہ ڈالی۔ ایک غبار سا دکھائی دیا۔

خاک آلود، ویران ویران، جس میں آگ اور موت کی دہشت تھی، جگہ جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ چہرے ہرٹریوے سٹیشن پر پھر گاڑی کھڑی ہو گئی۔ بوچ رہنٹ کے جوان ڈبلوں سے اتر کر پہرہ دینے لگے۔ سکھ دور کھڑے نعرے لگا رہے تھے اور تواریں لہرا رہے تھے مگر کسی کو گے آنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ گاڑی آگے روانہ ہوئی۔ خاصہ سٹیشن بھی گزر گیا پھر گوروسہ ستانی بھی گزر گیا۔ اردگرد مسلمانوں کے بڑے گاؤں ہوا کرتے تھے۔ یہ ویران پڑے تھے، اور مسجدوں کے سفید مینار خاموش تھے، ہنسان تھے۔ دل گرفتہ تھے۔ یہ سوچ کر کہ اب ان میناروں سے کبھی اذان کی صدا بلند نہ ہوگی، پھر ٹاری بھی گزر گیا اور گاڑی واپس پلٹ گئی۔

یہاں پہلی بار ایک درخت کے ساتھ لہراتا ہوا پاکستانی سبز پرچم دیکھ کر چہرے کھل گئے۔ مسلمانوں نے فلک شکاف نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ منزل پر پہنچ کر راستے کی ساری مصیبتیں، تکلیفیں اور اذیتیں بھول گئیں۔ ٹرین اب پاکستان کی آزاد اور خوبصورت فضاؤں میں سفر کر رہی تھی دور مغلیہ ورکشاپ کی بلند چینی نظرائی۔ مغلیہ پر ٹرین رکی تو مسلمان روٹیاں، پانی اور اچار لے کر ٹرین کی طرف دوڑے، زخمیوں کو اتار کر ان کی مرہم پٹی کی گئی۔

لاہور ریلوے سٹیشن پر ہر طرف ہجوم ہی ہجوم تھا۔ ٹرین رکی تو مسلم لیگ کے رضا کار پانی، روٹیاں اور اچار لے کر تقسیم کرنے لگے۔ وہ ہر ایک سے پوچھ رہے تھے کہ کون والٹن کیمپ جائیں گے اور کون لاہور اپنے رشتہ داروں کے ہاں جاتا پڑ کریں گے۔ سٹیشن سے باہر چھ سات مہاجر کیمپ لگے تھے جہاں سے مہاجرین کو بسوں اور ٹرکوں میں بٹھا کر والٹن یا ان کے رشتہ دار کے ہاں پہنچایا جا رہا تھا۔ ریلوے سٹیشن کی عمارت میں بار بار پاکستان زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے فیروز پور سے مسلمانوں کی کٹی ہوئی گاڑیاں بھی آرہی تھیں لیکن ہر مہاجر کے سینے میں ایک نئے عزم ایک نئے ولولے کی شمع بھی روشن تھی، نیا وطن اور درو دیوار سامنے تھے۔ اس نئے وطن کے آئینے کو بھولوں سے سبانا تھا۔ ہر گھر میں نئی آرزوں کی نئی شمع روشن کرنی تھی جسم گرواؤد تھے، پاؤں میں ابلے تھے، زخموں سے خون بہہ رہا تھا مگر دل میں ایک ولولہ تازہ تھا، تعمیر وطن تھا، اک احساس عظیم تھا تحت عزت و اکبر و کا۔

امرتسر کی آخری بھٹک

امرتسر میں ایک دروازہ مہان سنگھ تھا۔ اسی دروازے سے ایک چھوٹی سڑک تحصیل پورے کو جاتی تھی اس سڑک پر ٹاٹلیوں کی گھنٹی جھاڑ تھی اس کی ایک جانب آرٹ سکول تھا جہاں میں دوسری سے چوتھی جماعت تک پڑھا تھا۔ دوسری جانب متعدد امراض کا چھوٹا سا ڈسپنسری ٹائپ کالمینوسل ہسپتال تھا ٹاٹلیوں میں گھری ہوئی یہ چھوٹی سی کچی سڑک آگے جی ٹی روڈ کو کراس کرتی ہوئی تحصیل پورے کے مختصر سے میدان میں اتر جاتی تھی اس میدان میں ایک جانب کچا کوٹھا تھا جس کی چار دیواری کے اندر سواری رنگ کے بڑے بیروں والا ایک گھنا دھت تھا ہم اس درخت پر پتھر مار کر بیر جھاڑتے تو اندر سے ایک بوڑھی عورت سوٹالے کر ہمیں مارنے نکلا کرتی تھی اس کے بالمقابل تحصیل کا دفتر تھا جو کسی پرانے قلعے کی یاد دلاتا تھا۔ یہاں سے آگے تحصیل پورے کی آبادی کا جنوبی کنارہ شروع ہو جاتا تحصیل پورہ اصل میں شریف پورے کا ایک حصہ تھا۔ یہ ساری آبادی امرتسر مسلمانوں پر مشتمل تھا مگر تحصیل پورے کا ایک حصہ تھا۔ یہ ساری آبادی امرتسر مسلمانوں پر مشتمل تھی مگر تحصیل پورے کی جنوبی پٹی میں کچھ ہندو اور سکھ آباد تھے۔ ان کی دو تین گلیاں ہی تھیں۔ ایک چھتا ہوا کنواں بھی تھا میں صبح صبح چالیس کھوہ اور ریلوے لائن کی طرف سیر کرنے کو جاتا تو اس کنوئیں پر ہندو اور سکھ نہا رہے ہوتے تھے۔ دوسری طرف ہندو سکھ عورتیں کانسی کے گھردوں میں پانی بھر رہی ہوتیں جہاں تحصیل پورے کی آبادی ختم ہوتی وہاں سے لوکاٹ اور آکوپے کے باغ شروع ہو جاتے۔ ان باغوں کے درمیان سے ایک کچی پگ ڈنڈی ریلوے لائن تک جاتی تھی۔ اس پگ ڈنڈی کی دونوں جانب کھٹے کے درخت تھے جو اوپر جا کر آپس میں مل گئے تھے بہار کے دنوں میں ان پر سفید کلیاں کھلتیں تو سارا راستہ خوشبو سے مٹک جاتا تھا۔ اسی تحصیل پورے میں میرا ایک دوست رہتا تھا سانا رنگ

دریاد قد آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک پیچھے کوگرے ہوئے سیدھے بال ہم دونوں کبھی کبھی کمپنی باغ میں کرنے جاتے تو وہ مجھے اپنی اردو کی نظمیں سنایا کرتا تھا میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا اس کی نظموں میں عربی فارسی کے بے شمار لفظ ہوتے تھے وہ مجھے ان الفاظ کے معنی بھی سمجھایا کرتا اس نے عربی فارسی کچھ کے حوالے سے اسلامی رنگ غالب تھا۔ مسلمانوں کے کھانے شوق سے کھاتا اور لباس بھی ہندو نہیں پہنتا تھا۔ پتلون قمیض اور شور قمیض اسے بہت پسند تھی اب مجھے اس کی باتیں یاد آ رہی ہیں وہ سگریٹ بہت پیتا تھا مجھے یاد ہے ایک روز شام کے وقت ہم کمپنی باغ میں ٹھنڈی کھوٹی کے سامنے والے پلاٹ میں بیٹھے تھے۔ وہ ویدک عہد پر باتیں کر رہا تھا کہنے لگا۔

”اے ہندو نہیں تھے۔ یہ ہندو تو برہمن دور کے بعد کی پیداوار ہیں میں بھی ہندو ہوں کیرنگ میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہوں مگر مجھ میں وہ تنگ نظری اور تعصب نہیں۔ جو تم ہر ہندو میں پاؤ گے۔ ہندو دہریہ بھی ہو جائے تب بھی ہندو ہی رہے گا میرے پتا جی کہتے ہیں رام مورتی! مسلمانوں کے ساتھ مت بیٹھا کرو مگر میں کہتا ہوں کہ ہندوؤں میں میرا دم گھٹتا ہے تم مسلمان ہو تمہارا کچھ ہندوؤں سے اتنا مختلف ہے کہ تم لوگ ان کے ساتھ ایک جگہ دو دن بھی نہیں گزار سکتے۔ اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو میں نہیں ایک نظم سناتا ہوں۔“

جب امرتسر میں تحریک پاکستان کا آغاز ہوا اور جلوس نکلنے لگے تو ایک روز رام مورتی طائر نے کہا۔

”یہ ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا تم دیکھتے نہیں ہمارے امرتسر میں کتنے پاکستان بنے ہوئے ہیں۔ شریف پورہ بھی ایک پاکستان ہے جہاں کے امرتسر مسلمان اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں چوک فرید بھی ایک پاکستان ہے اسی طرح کڑواہ کرم سنگھ کا ایک حصہ بھی ایک پاکستان ہے۔ یہ حصہ ہندو اور سکھوں سے لگ تھلک ہے پاکستان اس ملک کے سیاسی اور تہذیبی ارتقاء کا ایک قدرتی نتیجہ ہے تم دیکھ لینا پاکستان بن جائے گا۔“

پھر امرتسر میں تحریک پاکستان کا عمل تیز سے تیز تر ہوتا گیا قائد اعظم کی خلع خانہ اور بے لوث قیادت میں مسلمان اپنی جدوجہد آزادی میں کامیاب ہو گئے اور قیام پاکستان کا اعلان کر دیا گیا مجھے یاد ہے جس رات آل انڈیا ریڈیو سے قائد اعظم نے تشکیل پاکستان کے اعلان کے بارے میں تقریر کی میں پٹھان کوٹ

میں تھا۔ وہاں میں اصفہانی چائے کمپنی میں سیزمیں کی حیثیت سے ملازم تھا ایک چائے خانے کے ریڈیو پر میں نے قائد اعظم کی تقریر سنی۔ پٹھان کوٹ کے مسلمانوں میں بے حد جوش و خروش تھا پاکستان زندہ باد قائد اعظم زندہ باد کے نعرے لگاتے جلوس گزرتے مجھے پٹھان کوٹ کی سڑکوں کے نام یاد نہیں رہے میں زیادہ دیر وہاں رہا بھی نہیں۔ ایک نشیبی آبادی تھی جہاں مکانوں کے آنگن تھے اور ان میں سفیدے اور چیرمھ کے درخت ہوا میں جھوماکرتے تھے۔ پیچھے دور ڈلیوز کی پہاڑیوں کی برف پوش چوٹیاں نظر آتی تھی مجھے سیاسی شعور بھی نہیں تھا۔ اسی لئے میں جسے جلوسوں میں کبھی شریک نہیں ہوتا تھا رام مورتی طائر کہتا تھا کہ پاکستان بن کر رہے گا۔ ہمارے محلے کی مسجد کے امام پیر جی بھی یہی کہتے تھے کہ پاکستان ضرور بنے گا جہاں مسلمانوں دینی آزادی کے اسلامی ماحول میں زندگی بسر کریں گے۔ مجھے یاد ہے ایک بار رام مورتی طائر نے اپنی عینک کے موٹے شیشوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا تم کبھی جنگ اور پنجاب کے دیہاتوں میں گئے ہو؟ میں نے کہا کہ نہیں تو وہ بولا۔ ”پھر تمہیں کیا پتہ کہ جب پاکستان بن جائے گا تو ہندو ساہوکار کی زنجیریں کسی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گی۔ پھر وہ سگریٹ کا کش لگا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔“

پنجاب میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی مارچ ۱۹۴۷ء کی دوسری یا تیسری تاریخ تھی کہ امرتسر شہر میں پہلا کرفیو لگا دیا گیا امرتسر ہمارا اپنا شہر تھا کرفیو کے دوران تو ہم گلی میں بند رہتے۔ جونہی کرفیو کھلتا ہم ہندو سکھوں کے محلوں میں بھی آوارہ گردی کرنے نکل جاتے ایک روز میں تحصیل پورے کی طرف گیا تو دیکھا کہ اس آبادی میں جو چند ایک سکھوں کے گھر تھے وہ خالی ہو چکے تھے رام مورتی طائر کا مکان بھی لٹ لٹا کر خالی پڑا تھا۔ فسادات کی آگ تشدد اختیار کرتی چلی گئی ہمارے اپنے محلے میں جو چند ایک ہندو سکھوں کے مکان تھے وہ بھی خالی ہو گئے ہندو سکھ شہر کے اندر غیر مسلم محلوں میں چلے گئے کبھی کبھی کرفیو کھلتا تو کوئی نہ کوئی ہندو یا سکھ پولیس کی معیت میں اپنا مکان دیکھنے یا وہاں سے کوئی شے اٹھانے ضرور آتا مگر رام مورتی طائر نہ آیا۔

اسی طرح وقت گزرتا چلا گیا امرتسر میں چاروں طرف آگ لگی تھی شہر ہندو اور مسلم آبادی میں بٹ کر رہ گیا تھا دیہات اور پنجاب کے دوسرے شہر سے مسلم ہاجرین کے قافلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ ایک الگ انتہائی دور داستان ہے بہر حال اتفاق سے گیارہ اگست کو میں ہوڑہ ایکسپریس میں بیٹھ کر امرتسر

سے لاہور گیا امرتسر کے درمیان ریل گاڑیاں ابھی تک چل رہی تھیں کشیدگی اگرچہ بہت زیادہ تھی مگر امرتسر کے مسلمانوں کی جرأت دلیری اور جاننازی ہندوؤں کو ان کے محلوں کی طرف ایک انچ بھی بڑھنے نہیں دے رہی تھی۔ یہ اسی بے خوفی کا ثبوت تھا کہ میں گیارہ اگست کو ہونڈہ ایکسپریس میں سوار ہو کر لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔

چھوڑنے کی سٹیشن پر ہندو سکھ دور جنگ کے باہر کھڑے تواریں لہا لہا کر پاکستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ لاہور پہنچا تو یہاں جو ہمارے رشتے دار تھے وہ فخر پر برس پڑے کہ تم کیا سوچ کر امرتسر میں بیٹھے ہو؟ کیا تم سب کا دماغ مرنے کا ارادہ ہے؟ فوراً واپس جاؤ اور ان سب کو لے کر لاہور آ جاؤ۔ میں نے دوسرے دن صبح آٹھ بج کر چالیس منٹ والی گاڑی پکڑ لی اور واپس امرتسر پہنچ گیا ریلوے سٹیٹ پر مسلمان عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم دیکھا جو پلیٹ فارموں پر پڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ شہر میں ساڑھے دس بجے سے کر فیو گئے والا ہے اس وقت دس بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے مجھے ریلوے سٹیٹ پر شیخ قیوم مل گیا اس کا مکان مال بازار کے پہلو میں ایک گلی میں واقع تھا اس نے کہا ابھی کر فیو گئے میں پانچ منٹ ہیں چلو نکل چلتے ہیں ہمارے محلے کے بودی نے کہا خبردار سٹیٹ سے باہر نہ نکلنا گورکھا اور ہندو جاٹ رجمنٹ کے فوجی پھر رہے ہیں وہ دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ مگر نوجوانی کا خون تھا۔ ہم نے کوئی پروا نہ کی اور ریلوے یارڈ کی گول باغ والی دیوار چاند کر سڑک پر آ گئے پانچ منٹ پہلے ہی بازار سنان ہو گئے تھے ایک جگہ ہندو فوجی گشت کرتے نظر آئے ہم نے کوئی پروا نہ کی اور سکندر گیٹ کی طرف چلنے لگے ایک مکان کی کھڑکی میں سے ایک شخص نے سر باہر نکال کر اوپر سے کہا۔

”اے منڈیو! مرنا ہے؟ کر فیو لگن والا اسے اندر آ جاؤ۔“

ہم نے دوڑنا شروع کر دیا شیخ قیوم کا مکان وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا ہم دوڑتے دوڑتے اس کی گلی میں داخل ہو گئے اس کے ساتھ ہی کر فیو کا بھونپو چیخ اٹھا۔ شیخ قیوم کا مکان تین منزلہ تھا اور کافی کشادہ تھا وہاں جاکر دیکھا کہ عورتوں بچوں اور مردوں سے بھرا پڑا ہے پیچھے جو ہندو آبادی تھی وہاں سے مسلمان اپنی جانیں بچا کر اس مکان میں آ گئے تھے ان میں زنانہ چہرے والے ایک سرخ و سپید آدمی بھی تھے جن کے سر پر ترکی ٹوپی تھی وہ سخت خوف زدہ تھے اور بار بار شیخ قیوم سے

کہتے۔

”قیوم پتر نچے کسی طرح سٹیٹن پر پہنچا دے۔“

کر فیو کے گتے ہی پیچھے جو ہندوؤں کے محلے تھے اور سے فائرنگ شروع ہو گئی شام تک یہ فائرنگ ہوتی رہی ہمارا محلہ وہاں سے قریب ہی تھا۔ میں اور قیوم چھوٹی سی شہر تھیں میں درمی پر بیٹھ گئے دوپہر کو دال روٹی کھانی رات کے نو بجے ریڈیو پر خبریں سن رہے تھے کہ ایک دم بجلی چلی گئی مکان میں عورتوں اور بچوں نے رونا شروع کر دیا مرد انہیں جو صلہ دینے لگے ہم نے کوٹھے پر جا کر دیکھا سارا شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں ہمارے محلے کی جانب کسی مکان میں آگ لگی ہوئی تھی جس کے شعلے اوپر اٹھ رہے تھے۔ شیخ قیوم نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

”حمید امیر خیال ہے گلی انگریزوں کا کوئی مکان جل رہا ہے۔ باغ راماندر کے ہندوؤں نے یہاں آگ لگائی ہوگی۔“

مجھے اپنے گھر والوں کی فکر پڑ گئی۔ مگر وہاں تو سہر کوئی پریشان تھا خدا کر کے رات گزری کمری باغ اور بازار کبر واناں کے سارے مسلمان گھرانے گھر بار چھوڑ کر تھوڑا بہت سامان سروں پر اٹھا بھاری گلی میں آ گئے تھے گلی میں گزرنے کو جگہ نہیں تھی میں لوگوں کے ٹرنکوں اور بستروں کے اوپر سے گزرتا اپنے گھر پہنچا انہیں کہا کہ جس طرح ہو سکے یہاں سے نکل چلو۔ کوئی بھی امرتسر چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔ صرف والدہ لڑکیوں کو لے کر چلنے پر تیار ہو گئیں ایک بھائی انہیں لے کر ریلوے سٹیٹن کی طرف روانہ ہو گیا ہم باقی بھائی والد صاحب اور دوسرے رشتے داروں کے ساتھ مکان پر ہی رہے ان سب کا ابھی تک یہی خیال تھا کہ حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں گلی میں اپنے محلے کے دوستوں کے پاس آ گیا ابھی تک ہندوؤں سے مقابلہ کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں آدمی لاطھیل بلین لئے پھر رہے تھے گلی کے دروازے پر لوہے کا جنگلا چڑھا ہوا تھا جو اندر سے بند تھا وہاں محلے کا جاناں بد معاش بندوق لئے پہرہ دے رہا تھا کر فیو کھلے بمشکل ایک گھنٹہ ہوا ہو گا کہ شہر میں مار دھاڑ شروع ہو گئی اس کے فوراً بعد دوبارہ کر فیو لگا دیا گیا ساتھ والے محلوں سے چستوں کچھ مسلمانوں کی لاشیں لگی ہیں آئیں تو وہاں کہرام مچ گیا۔ گلی انگریزوں اور بازار کبر واناں کے مسلمان علاقے میں باغ راماندر کے ہندوؤں کا قبضہ ہو چکا تھا انہوں نے مکان کو لوٹ کر آگ لگا دی

تھی۔ گلی انگریزوں کی مسجد میں کئی مسلمان شہید ہو گئے۔

اسرتر کی وہ رات بڑی خوف ناک رات تھی ساری رات تھری ناٹ تھری کی گولیوں کے دھماکے ہوتے رہے ان میں بم پھٹنے کے دھماکے بھی شامل تھے اسی رات ہماری مسجد کے امام پیر جی کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے روز ۱۴ اگست کا دن تھا صبح ہوئی کر فیونہ کھلا مگر ہندو سکھوں نے ہندو سکھ فوج کو ساتھ لے کر ہماری گلی پر بازار والے دروازے کی طرف سے حملہ کر دیا۔ گلی میں بھگدڑ مچ گئی فوج کا مقابلہ نیم نہتے مسلمان کہاں کر سکتے تھے لوگ اپنا اسباب وئیں پھینک گئی کی، دوسری جانب لال حویلی اور گجروں کے دیڑھے کی طرف بھاگے ہندو فوج نے ہینڈ گرنیڈ مار کر گلی کا دروازہ اڑوایا اتنی دیر میں مسلمان گلی سے بھاگ کر لال حویلی اور گجروں کے دیڑھے سے ہوتے ہوئے باہر جی ٹی روڈ کے بد رو پر پہنچ چکے تھے اور بھی ہندو فوج گشت لگا رہی تھی اس نے بھاگتے مسلمانوں پر فائرنگ شروع کر دی موسیٰ اپنے شیر خوار بچے کو گود میں اٹھا لے کر شریف پور سے کی طرف بھاگ رہا تھا کہ گولی لگنے سے وہیں شہید ہو گیا۔ بہت سے مسلمان بچے عورتیں اور مرد شہید ہو کر گرے باقی پاتھی گراؤنڈ والی سڑک پار کر کے شریف پور سے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ شریف پور سے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ شریف پور سے کو مسلم مہاجرین کمیپ قرار دیا گیا تھا۔ وہاں بلوچ رجمنٹ مسلمان مہاجرین کی حفاظت پر مامور تھی بلوچ رجمنٹ کے سپاہیوں نے فائرنگ کا کر دیا اور سینکڑوں مسلمان عورتیں اور مرد ہندو فائرنگ سے بچ گئے بلوچ رجمنٹ کی فائرنگ سے ہندو فوجی پاتھی گراؤنڈ سے بھاگ گئے تھے۔

شریف پور سے نے باقاعدہ مہاجر کمیپ کی شکل اختیار کر لی تھی شریف پور سے میں جو مسلمان آباد تھے انہوں نے اپنے مسلمان مہاجر بھائیوں کے لیے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیئے تھے لاہور سے مسلم لیگ کے ٹرک آنا شروع ہو گئے جی ٹی روڈ کی جانب سے مسلم لیگ کے سڑکوں کے ذریعے اور ریوے لائن کی طرف سے قالی مال گاڑیاں کے ذریعے شریف پور سے سے مسلمانوں کی پاکستان کی طرف ہو گئی۔ کمیپ کو سکیرٹوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور بلوچ رجمنٹ کے جوان اپنی لگرائی میں بھی بلوچ رجمنٹ کے مسلح جوان موجود ہوتے تھے ہماری باری تین چار روز کے بعد آئے والی تھی ایک روز میں پھرتے پھرتے تحصیل پور سے والی آبادی کی طرف نکل گیا

وہاں سے لوگ ایک مکان کے باہر جمع تھے میں بھی تماشا دیکھنے وہاں پہنچ گئے۔ بلوچ رجمنٹ کے دو جوان موجود تھے۔ دو سکھ فوجی بھی تھے ایک تانگہ گلی کے باہر تحصیل کی عمارت کے پاس کھڑا تھا ایک لوگ رام مورتی طائر کے مکان کے باہر کھڑے تھے۔ میں نے رام مورتی طائر کے پتا کو دیکھا کہ سکھ فوجی اور پولیس والوں کے ساتھ اپنے مکان میں داخل ہو رہا تھا۔ اچانک آگے کے پائیدان کے پاس مجھے رام مورتی طائر نظر آ گیا۔ وہ تحصیل کی قلعہ نما عمارت کی طرف منہ کئے سگریٹ پی رہا تھا میری طرف اس کی بیٹھ تھی۔ میں لپک کر اس کے پاس گیا۔ اس نے گردن گھما کر میری طرف اپنی عینک کے موٹے ٹیشوں سے دیکھا وہ کچھ دبا ہوا تھا۔ ایک سیکنڈ میری طرف ساکت کھڑا دیکھتا رہا پھر مسکرایا اور مجھے لگایا میں نے پوچھا کہ وہ اپنے خالی مکان پر کیا کرنے آیا ہے؟ اس نے ہنس کر کہا۔

”میرے پتا جی مکان کی پرھتی میں رکھی ہوئی کرشن کی مورتی نکالنے آئے ہیں“

میں نے کہا ”کیا وہ ابھی تک مکان میں ہی ہوگی“

رام مورتی طائر نے سگریٹ کا کش لگایا اور دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

”مسلمان بت شکن ہے اسے مورتی سے کیا سروکار؟ ظاہر ہے مکان میں ہی کسی جگہ پڑی ہوگی“

پھر رام مورتی طائر کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور کہنے لگا۔ ”میرے پتا جی کٹر

ہندو ہیں تم ہندوؤں کو پوری طرح نہیں جانتے میں جانتا ہوں وہ جو مورتی لینے آئے ہیں اس کے اندر

لالہ جی یعنی میرے پتا جی کے قیمتی جواہرات بھرے ہوئے ہیں میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم یہ راز

بلوچ رجمنٹ کو بتا دو مگر اس سے کیا فرق پڑے گا ہندو تو لاہور کے مکانوں سے کروڑوں روپے

کے خزانے ساتھ ہی لے کر یہاں آ گئے تھے تم لوگوں کو تو لاہور میں ملی ہوئی شاہ عالمی ملے گی“

پھر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

لیکن پاکستان کی زمین خزانوں سے بھری ہوئی ہے جیسے اب ہندو لالہ کہیں نہیں لوٹ سکے

گا۔ دیکھو میں ہندو ہو کر تمہیں ایسی باتیں بتا رہا ہوں مگر میں ہندو نہیں ہوں تم کو پاکستان مبارک ہو

میری ایک بات یاد رکھنا پاکستان کی حفاظت کرنا ایک جان اور متحد ہو کر رہنا نہیں تو ہندو بننے کی

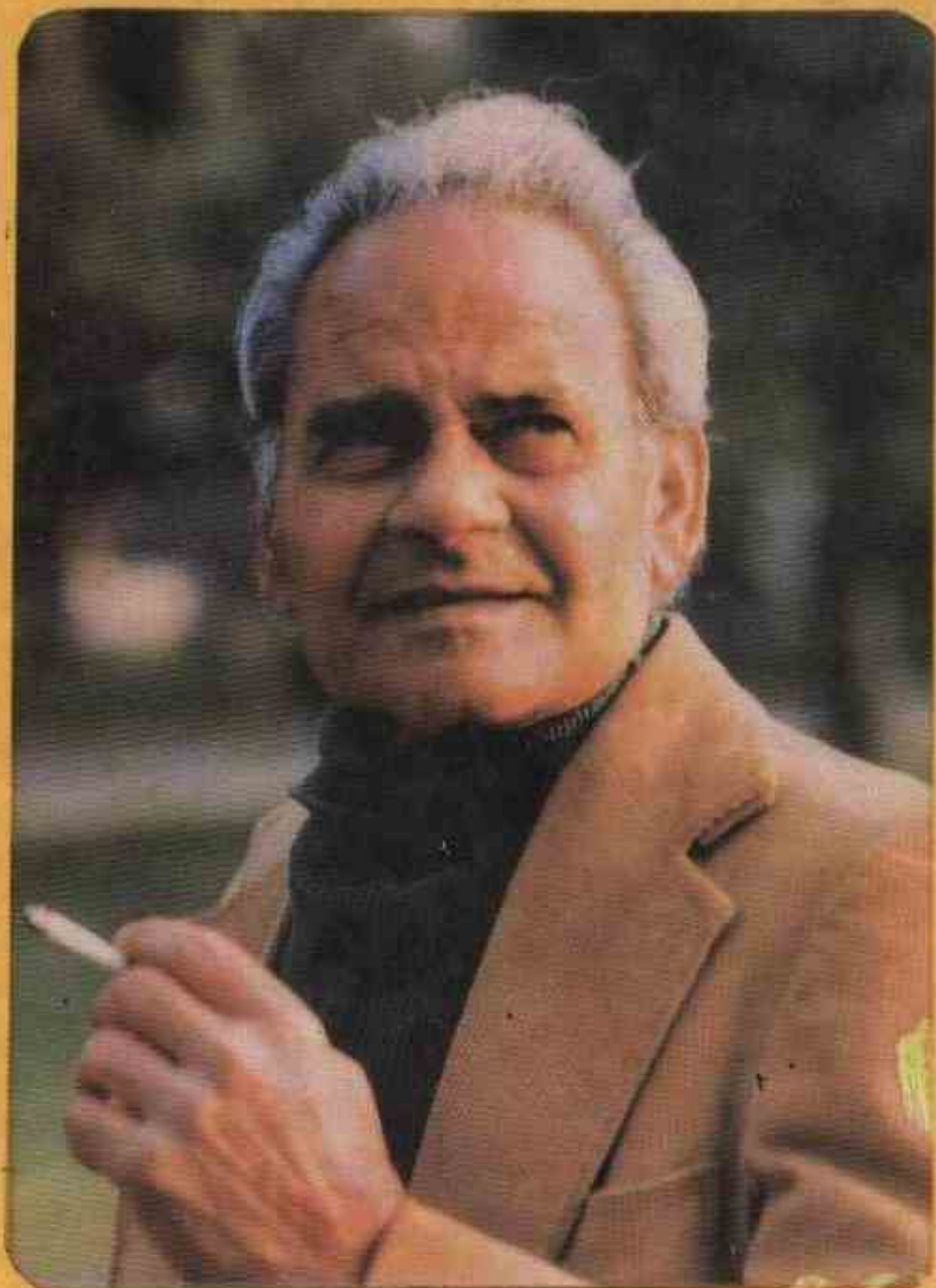
سیاست تمہیں بڑپ کر جائے وہ ہنسے لگا۔

”یار..... تم ہندو کو نہیں جانتے یہ برہمن ہے آریہ نہیں ہے لو سگریٹ پٹو“

رام مورتی طاٹر کا باپ مکان سے مورتی نکال کر لایا تو مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ مورتی کو توڑا جائے
لوگوں کو شک پڑ گیا تھا صورتحال ایسی ہو گئی کہ مورتی کو تھوڑی سی توڑنا پڑا اندر مر جان اور زمر وہی زمر و بھرے
ہوئے تھے ان جہاں ہرات کو بلوچ رجمنٹ نے اپنی تحویل میں لے لیا اور بعد میں مسلم لیگ کے حوالے کر دیا۔
آخر ایک روز ہماری بھی باری آگئی ہم تمام گھروں کے ایک ٹرک میں سوار ہو گئے دوپہر کا وقت تھا آسمان
پر دھواں سا پھیلا ہوا تھا مسلم لیگ کے ٹرک آہستہ آہستہ جی ٹی روڈ پر لاہور کی طرف ریٹرنے لگے میں ٹرک
میں بیٹھنے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوا ہر تک رہا تھا امرتسر مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہا تھا مسلم ہائی
سکول گزر گیا اور بھائیوں والی نہر کاریوں سے بھاٹک نظر آیا اس نہر میں ہم چلا گئیں لگایا کرتے تھے۔ ٹرک ریل
کے پل کی چڑھائی چڑھ رہے تھے پل کے اوپر جا کر سٹیشن کی طرف مڑنے تو مجھے روز کمپنی باغ کا کرٹل ہوٹل
والا دروازہ نظر آتا درخت جیسے ہاتھ بلا کر مجھے الوداع کہہ رہے تھے یہ درخت میرے بڑے بھائی کے ہوتے
تھے کمپنی باغ بھی گزر گیا ٹرک پتلی گھر کے قریب سے نکل گئے چھ بڑے بھی گزر گیا کھیتوں میں ویرانی
برس رہی تھی کئی جگہوں پر جھاڑیوں میں انسانی لاشیں اوندمی پڑی تھیں پھر یہ سب کچھ گزر گیا امرتسر گزر
گیا اور دور باڈر پر ایک درخت میں پاکستان کا پرچم لہراتا نظر آیا پڑمروہ چہروں پر زندگی کا تروتازہ خون
دوڑنے لگا فضا پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی ہم پاکستان کی پیاری اور اپنی سرزمین میں
داخل ہو گئے اس وقت مجھے رام مورتی طاٹر کا فقرہ یاد آگیا۔

”پاکستان کی زمین خزانوں سے بھری ہوئی ہے جیسے اب ہندو لاکھ بھی نہیں لڑی سکے گا پاکستان
کی حفاظت کرنا ایک جان اور متحد رہنا۔“

اس واقعے کو کتنا عرصہ گزر گیا ہوگا؟ آپ سب جانتے ہیں اور اس وقت میں اپنے ماضی کو یاد کر
کے کیا سوچ رہا ہوں؟ یہ بھی آپ سب جانتے ہوں گے۔ خدا پاکستان کی حفاظت کے لیے سیر پائی
دیوار بن جائیں۔ اختلافات ختم کر دیں کیونکہ ہمارا سب کچھ پاکستان ہی ہے۔



”امرتسر کی مسجدوں پر پیارا مضمون لکھنے والے اے حمید کو میرا سلام پہنچے۔ کتنی پیاری تصویر کھینچی ہے، آپ نے امرتسر کی معاشرت کی کس قدر آباد بھینس، قرطبہ کی بیٹیاں، کتنے اچھے تھے، امام صاحب اور ان کے بیٹے۔ قرطبہ کے حوالے سے تاریخ کے درپے کھول دیے، جن سے اس ملک کے مستقبل پر دھندلی دھندلی روشنی۔ ذرے کچھ چمکتے، کچھ بجھتے نظر آتے۔ اشاریت نے چودہ طبق روشن کر دیے۔ پرانا اے حمید پھر جاگ اٹھا ہے کاش ایسی شاہکار تحریریں دوہیں اور لکھ ڈالے۔“

(ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے ایک خط سے)

اے حمید۔ پھولوں، تتلیوں اور خوشبوؤں کے تعاقب میں ہم سے دور جاتا مصنف

راشد اشرف۔ ۹ اپریل ۲۰۱۱

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ انسان جب کسی اسپتال کے آئی سی یو میں وینٹیلیٹر کے سہارے سانس لے رہا ہوتا ہے تو بے ہوشی کے عالم میں وہ کیسے کیسے مناظر دیکھتا ہوگا۔۔۔ اور بیہوشی کی سرحدوں سے ہوش میں آنے کے مختصر درمیانی عرصے میں وہ کن کن باتوں کو یاد کرتا ہوگا۔۔۔ یقیناً وہ تمام باتیں اسے یاد آتی ہوں گی جو اس کی زندگی سے جڑی تھیں!

اپنی تحریروں میں تو اتر کے ساتھ جنگل، خوشبو، بارش، ناریل، درخت اور چائے کا ذکر کرنے والا پاکستان کا درویش صفت، ایماندار اور ہر دلعزیز مصنف پچھلے ایک ماہ سے بھی اسی کیفیت سے دوچار ہے۔ جناب عبدالحمید جو اے حمید کے نام سے جانے جاتے ہیں، لاہور کے ایک نجی اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ایک ایسی جنگ جس میں زندگی کے غالب آ جانے کا امکان روز بروز کم سے کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مجھ جیسے ان کے ان گنت چاہنے والوں کے یہ ایک اذیت ناک صورتحال ہے۔ یہ تو خدا سلامت رکھے جناب عطاء الحق قاسمی کو کہ جن کی تگ و دو کی وجہ سے اے حمید کے علاج کا تمام خرچہ حکومت پنجاب برداشت کر رہی ہے ورنہ ان کے اہل خانہ میں اس کی سکت نہ تھی۔ اس ملک میں ہر کوئی ان جیسا خوش قسمت کہاں جس کو اس کڑے وقت میں کوئی عطاء الحق قاسمی نصیب ہو جائے۔۔۔ کتنے ہی ادیب و شاعر کسمپرسی کے عالم میں دم توڑ گئے۔ شاعر و ادیب کیا، یہاں تو اساتذہ کا حشر بھی اس سے مختلف نہیں ہوتا۔ ۷ دسمبر ۲۰۰۳ کو ملیر، کراچی میں واقع ایک تاریخی درسگاہ میں علم کی روشنی پھیلانے

والے پروفیسر غازی خان جا کھرائی اور ان کی اہلیہ کی پندرہ روز پرانی لاشوں کا ملنا تو آج بھی کچھ لوگوں کو یاد ہوگا جو بھوک سے دم توڑ گئے تھے۔ عدالت میں دائر کیس کے تفصیلات اور اس میں ملوث لوگوں کے نام و دیگر تفصیل یہاں پڑھی جاسکتی ہے:

<http://archives.dawn.com/2006/05/16/local4.htm>

کل شام مجھے اے حمید کے بیٹے مسعود حمید اپنے والد کے علاج کے سلسلے میں کی جانے والی عطاء الحق قاسمی صاحب کی کوششوں کے بارے میں آگاہ کر چکے تھے۔۔۔۔۔ آج صبح جب مجھ سے رہانہ گیا تو لاہور میں عطاء الحق قاسمی صاحب کو فون کر ڈالا۔۔۔۔۔ وہ مجھے حمید صاحب کے علاج کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں اور ان کے مثبت نتائج کے بارے میں بتاتے رہے۔ لیکن ہر آن پر اُمید باتیں کرنے والے عطاء صاحب، اے حمید کی صحتیابی کے بارے میں تذبذب کا شکار نظر آئے۔ جو شخص چند دن وینٹیلیٹر پر گزار لے، اس کی صحت کے بارے میں ڈاکٹر بھی زیادہ پر امید نہیں رہتے اور ادھر اے حمید تو پورے ایک ماہ سے وینٹیلیٹر (ventilator) پر ہیں۔۔۔۔۔ لیکن بقول عطاء صاحب، ہمیں خدا کی ذات سے امید نہیں چھوڑنی چاہیے!

مارچ ۲۰۰۸ کی ایک شام میں لاہور میں واقع اے حمید صاحب سے ملاقات کی عرض سے سمن آباد لاہور میں واقع ان کی رہائش گاہ پر گیا تھا۔ وہ ایک گھنٹہ پلک جھپکتے گزر گیا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا، وہ کتابوں سے گھرے چھوٹے سے کمرے میں اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں بے صبری سے اس شیفٹنگی کا ذکر کر رہا تھا جو ایک زمانے سے مجھے ان سے ان کی تحریروں کے تعلق سے ہے۔ وہ میری باتیں سن کر انکساری سے مسکرا رہے تھے۔ میں ان کو شہاب نامہ میں قدرت اللہ شہاب کی ان کے بارے میں رائے

یاد دلاتا ہوں کہ کس طرح شہاب صاحب جو اس زمانے میں پنجاب ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے عہدے پر فائز تھے اور حمید صاحب کو پاور لومز کا پرمٹ دے چکے تھے (ان دنوں پاور لومز کا کاروبار انتہائی منفعت بخش کہلاتا تھا اور قدرت اللہ شہاب کے پاس دن بھر اسی سلسلے میں سفارشوں کا بیزار کن تانتا بندھا رہتا تھا) اور کچھ عرصے بعد حمید صاحب، جو ان پرمٹس کو باآسانی بلیک مارکیٹ میں فروخت کر کے ایک بڑی رقم بنا سکتے تھے، شہاب صاحب کو وہ پرمٹس واپس کرنے آئے تھے۔

میں اس کاروبار کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کام میرے بس کا روگ نہیں ہے۔۔۔ وہ قدرت اللہ شہاب سے کہہ رہے تھے۔

یہ شہاب صاحب کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔۔۔ اور پھر انہوں نے قلم اٹھایا اور شہاب نامہ میں حمید صاحب کے لیے یہ جملہ لکھا:

اس کی دلنشین تحریروں کی طرح اس صاحب طرز ادیب کا کردار بھی اتنا ہی صاف اور بے داغ تھا کہ اس نے اپنے پرمٹ کو بلیک مارکیٹ میں بیچنا بھی گوارا نہ کیا۔۔۔۔۔ شہاب اس محکمے میں اپنی تقرری کے تمام عرصے کے احوال کے اختتام پر لکھتے ہیں: پنجاب کے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی حیثیت سے اے حمید، آتا پیسنے کی چکی والا محمد دین، آغا حسن عابدی اور ابن حسن برنی کے ساتھ میری ملاقاتیں اس زمانے کی خوشگوار یادیں ہیں۔ باقی متروکہ صنعتوں کی الاٹمنٹوں کا سارا کام ایک متعفن دلدل کی ناگوار سرانڈ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔



اے حمید۔ پاک ٹی ہاؤس کے باہر

شہاب نامہ میں درج اس واقعے کے ذکر پر حمید صاحب ہنسنے لگے اور کہا:
”یار! جب کبھی میری بیوی مجھ پر ناراض ہوتی ہے تو میں اسے شہاب نامہ دکھا کر کہتا ہوں کہ دیکھو
قدرت اللہ شہاب جیسے انسان نے میرا ذکر کتنے اچھے انداز میں کیا ہے“

پھر میں اے حمید کو ان کے لکھے ناول ڈربے کے اقتباسات سنانے لگتا ہوں جو میرہ پسندیدہ ترین ناول
ہے۔ میں ان سے اس ناول کے کرداروں کے بارے میں دریافت کرتا ہوں ورنہ نہیں یہ بات بتاتا ہوں
کہ کالج کے زمانے میں کس طرح ایک لائبریری سے ۱۹۶۰ کا شائع ہوا یہ ناول مجھے ملا تھا جسے میں نے
منہ مانگی قیمت (تیرہ روپے) دے کر اس کے مالک سے خرید لیا تھا اور پھر ایک روز اس ناول کو میرے
والد

مرحوم نے پڑھا اور اپنے ہاتھوں سے اس کو محفوظ کرنے کی خاطر اس پر گرد پوش لگا دیا۔ حمید صاحب
میرے ہاتھ سے اس ناول کو لے کر بغور دیکھتے ہیں، میری درخواست پر ناول پر اپنے آٹو گراف ثبت
کرتے ہیں

اور اس کے تازہ نسخے کے حصول کے لیے مقبول اکیڈمی کے مالک کے نام مجھے ایک رقعہ لکھ دیتے ہیں۔
میں نے اس رقعے کو تبرک سمجھ کر حفاظت سے رکھا اور ایک جگہ محفوظ کر دیا، ملاحظہ ہو:

<http://www.flickr.com/photos/41786707@N05/5109237158/>

اس ملاقات کی تصویر اور ایک مختصر سی ویڈیو (انٹرنیٹ پر موجود واحد ویڈیو ریکارڈ) بھی یہاں دیکھی جاسکتی ہے:

<http://www.flickr.com/photos/41786707@N05/4371908038/in/photostream/>

حمید صاحب کو اپنی یادداشتیں لکھنے کی درخواست کے ساتھ ان سے ملاقات کی خوشگوار یادیں لے کر میں وہاں سے لوٹا تھا!

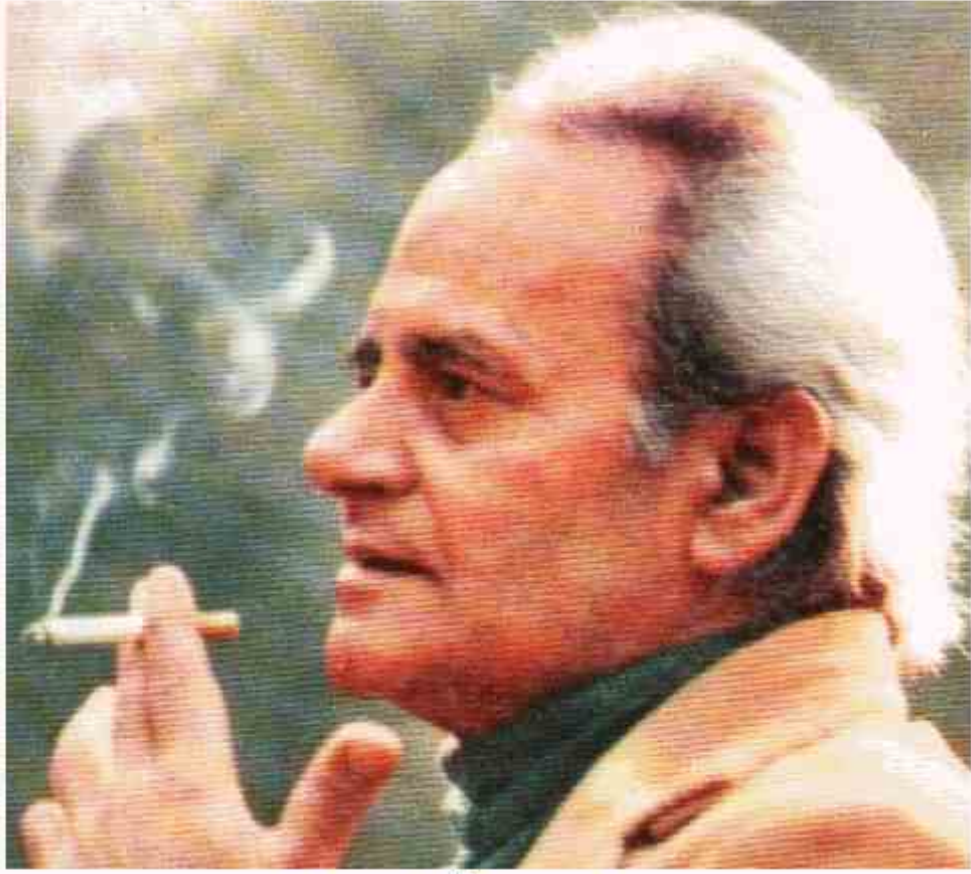


اے حمید (دائیں جانب) اور احمد راہی

اس دن کے بعد سے حمید صاحب سے مستقل فون پر رابطہ رہنے لگا اور گا ہے گا ہے کراچی سے ان کو لاہور کتابیں ارسال کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اپنی بیماری سے چند ماہ پیشتر انہوں نے مجھ سے ابن انشاء پر اپنی لکھی کتاب کی فرمائش کی جو لاہور میں نایاب ہے اور حمید صاحب کے پاس بھی اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا۔ یاد رہے کہ اے حمید ابن انشاء کے گہرے دوست رہے ہیں اور ابن انشاء کے خطوط پر مبنی کتاب خط انشاء جی کے^۲ میں اے حمید کے کئی بے تکلفانہ خطوط موجود ہیں۔ ایسے ہی ایک خط میں (اقتباس) انشاء جی رقم طراز ہیں:

ارے حمید، میری جان! تمہارے یادوں کے گلاب سب کے سب میں نے پڑھے ہیں بلکہ سونگھے ہیں اور پرانے دنوں کی یاد پر دل کو کچھ کچھ ہوتا ہی رہا ہے۔ تم ڈنڈی مار جاتے ہو۔ عشق و عاشقی اور لڑکیوں کے تذکرے میں بھی تم ڈنڈی بلکہ ڈنڈا مار جاتے ہو۔ لڑکیاں تمہاری بھولی بھالی صورت رومانیک تحریر کے چکر میں آ جاتی ہیں۔ خیر میاں ہم تو تمہارے عاشق ہیں۔ فی زمانہ اور کوئی ہمیں اپنے اوپر عاشق ہونے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔^۲

حمید صاحب کی لکھی ایک کتاب امرتسر کی یادیں^۳ میں عرصہ پندرہ برس سے تلاش کر رہا تھا لیکن ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ حمید صاحب کے پاس بھی اس کتاب کا ایک ہی نسخہ باقی رہ گیا تھا۔۔۔۔۔ کچھ عرصہ پیشتر کراچی سے ایک شناسالاہور جا رہے تھے، میں نے ان کے ذمے یہ کام لگایا کہ حمید صاحب سے وہ نسخہ لے کر اس کی فوٹو کاپی بنوا کر لے آئیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کام سرانجام پایا اور



اے حمید۔ پچیس برس قبل کی ایک تصویر

میں نے حمید صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

حمید صاحب کا سن پیدائش ۱۹۲۸ ہے، اس حساب سے وہ ۸۳ برس کے ہوئے۔ امرتسر میں پیدا ہونے والے اے حمید نے ۱۹۴۸ میں اپنا پہلا افسانہ منزل منزل لکھا جسے راتوں رات مقبولیت حاصل ہوئی۔ بہت جلد ان کے افسانے لاہور سے شائع ہونے والے معیاری جریدوں کی زینت بننے لگے۔ وہ ایک کثیرالتخیر مصنف ہیں، انہوں نے کم وبیش ۲۰۰ ناولز لکھے جبکہ بچوں کے لیے ان کی لکھی مشہور زمانہ سیریز امبرناگ اور ماریہ کے ۱۰۰ ناولز منظر عام پر آئے۔ ان کی چند دیگر کتابوں کے نام یہ ہیں:

منزل منزل

لاہور کی یادیں

داستان گو

امریکا نو

چاند چہرے

گلستان ادب کی سنہری یادیں

دیکھو شہر لاہور

جنوبی ہند کے جنگلوں میں

اردو شعر کی داستان

اردو نثر کی داستان

مرزا غالب لاہور میں

اے حمید نے ریڈیو پاکستان میں عرصہ دراز تک ملازمت کی، بعد ازاں وہ وائس آف امریکہ سے وابستہ ہو کر واشنگٹن چلے گئے جہاں سے واپسی پر انہوں نے وائس آف امریکہ کی دلچسپ یادوں کی قلم بند کیا جو پہلے کراچی کے ایک جریدے نیارخ میں قسط وار شائع ہوئی اور بعد ازاں اسے کتابی صورت میں امریکا نو کے عنوان سے سنگ میل پبلیکیشنز لاہور نے شائع کیا۔ انہوں نے ٹیلی وژن کے لیے ڈرامے بھی لکھے، خاص کر بچوں کے لیے لکھا گیا سیریل عینک والا جن بہت مقبول ہوا۔ وہ پچھلے کئی برس سے لاہور کے روزنامے نوائے وقت میں اتوار کے روز کا لم لکھ رہے تھے۔۔۔ ۲۰۰۳ میں ابوالحسن نعیمی کی خودنوشت یہ لاہور ہے منظر عام پر آئی جس میں نعیمی صاحب نے اے حمید کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح دسمبر ۲۰۱۰ میں لاہور

سے ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ رہے ناصر قریشی صاحب کی خودنوشت ادبیات نشریات شائع ہوئی جس میں قریشی صاحب نے حمید صاحب کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔



مارچ ۲۰۰۸ء۔ اپنی رہائش گاہ پر۔ راقم نے محفوظ کی

اے حمید ان لوگوں میں سے ہیں جن کی شخصیت کا مکمل عکس پڑھنے والے کو ان کی تحریروں میں گا ہے بگا ہے نظر آتا ہے اور یوں مزید معلومات کے حصول کے لیے کسی خارجی سہارے کی چنداں ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ کڑکی کے زمانے میں بھی حمید صاحب اچھا لباس پہنتے تھے اور احباب کی محفل میں الگ ہی نظر آتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہمیشہ بہترین لباس پہنو، بہترین خوشبو استعمال کرو اور بہترین لڑکی سے محبت کرو۔

ان کی تحریروں میں ایک عجب دلکشی ہے، پڑھنے والا کچھ دیر تمام غموں سے نجات پا کر گھنے جنگلوں، درختوں، پرندوں، خوشبوؤں کی ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں سے وہ نکلنا نہیں چاہتا لیکن کیا کیجیے کہ دیکھتے ہی دیکھتے کتاب ختم ہو جاتی ہے اور اسے دنیاوی بکھیڑوں میں لوٹنا پڑتا ہے۔

وہ لاہور شہر کی روایات کے امین ہیں۔ لاہور کی محفلوں، کھانوں، ناشتوں، پہلوانوں، تلوکوں، اکھاڑوں، لائبریریوں اور تھیٹر کمپنیوں کا جس انداز سے اے حمید نے اپنی تحریروں میں ذکر کیا ہے وہ کسی

اور کو کہاں نصیب۔۔۔۔۔ اسی طرح امرتسر شہر کے ذکر میں بھی یہی موضوعات ان کی تحریر کا خاصہ رہے ہیں (دیکھئے: امرتسر کی یادیں۔ سن اشاعت: ۱۹۹۱)۔ ممتاز مفتی جب ہندوستان کا سفر نامہ لکھ رہے تو اے حمید کے ذکر کے بغیر آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ پاک ٹی ہاؤس کی محفلوں کا تذکرہ جس طرح اے حمید نے کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ سعادت حسن منٹو کے آخری دنوں کا احوال ہر حساس پڑھنے والے کو افسردہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس افسوسناک احوال کی منظر کشی یا تو اے حمید نے کی ہے یا پھر معروف مزاح نگار محمد خالد اختر کے مضمون منٹو کے آخری دن سے اس کا پتہ ملتا ہے۔

اے حمید کی خاکہ نگاری کا ڈھنگ بھی دوسروں سے جدا نظر آتا ہے۔ اپنی کتاب چاند چہرے میں انہوں نے فیض احمد فیض، سیف الدین سیف، پروفیسر وقار عظیم، اخلاق احمد دہلوی، ابن انشاء، ناصر کاظمی، احمد ندیم قاسمی، عبدالمجید عدم، احمد راہی، ابراہیم جلیس، راجہ مہدی علی، چراغ حسن حسرت، مرزا سلطان بیگ وغیرہ پر خاکے لکھے ہیں اور ان خاکوں میں ایسے ایسے واقعات تحریر کیے ہیں جو کہیں اور پڑھنے میں نہیں آتے۔ اسی طرح ان کی کتاب ”گلستان ادب کی سنہری یادیں“ بھی حقیقتاً سنہری یادوں اور باتوں کا ایک ایسا مرجع ہے جو ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اے حمید اوائل عمری ہی میں گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے

اور انہوں نے یہ عرصہ بمبئی میں گزارا تھا۔ اسی طرح جنوب مشرقی ایشیاء کے بھی کئی ممالک بھی انہوں نے اچھی طرح دیکھ رکھے تھے۔ آگے چل کر اس آوارہ گردی کے تجربات ان کی تحریروں کو جلا بخشنے میں خوب کام آئے اور ان ممالک کے تجربات، رہن سہن، بول چال اور ثقافت کو انہوں نے اپنی تحریروں میں لگا دیا ہے بگا ہے استعمال کیا اور ان کی تحریروں کا یہی وصف ان کے قارئین کے دل میں گھر کر گیا!

اب دیکھئے کہ بھلا اس انداز تحریر کو کون پسند نہ کرے گا:

میں کبھی اکیلا اور کبھی کسی دوست کے ساتھ کسی نہ کسی بہانے ٹولٹن مارکیٹ کا ایک چکر ضرور لگاتا تھا۔ اس کی وجہ ٹولٹن مارکیٹ کی وہ مخلوط ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبو تھی جو وہاں فضا میں ہر طرف بسی ہوئی ہوتی تھی۔ میں جنوب مشرقی ایشیاء کے ملکوں سے نیا نیا جدا ہوا تھا۔ ان ملکوں کی بارشوں کی آواز اور استوائی پھولوں کی گرم خوشبوئیں میرے ساتھ سانس لیتی تھیں۔ جب میں ٹولٹن مارکیٹ میں داخل ہوتا تو مجھے ایسا لگتا کہ جیسے میں رنگون کی اسکاٹ مارکیٹ اور کولمبو کے ساحل سمندر پر بارش میں بھگتے ناریل کے درختوں میں آگیا ہوں۔

لاہور کی سڑکوں کا احوال بیان کرتے ہوئے انداز تحریر ملاحظہ ہو:

سردیوں کے موسم میں جب مطلع صاف ہوتا تھا تو ڈیوس روڈ سنہری دھوپ میں ایک ایسی روشن سڑک لگتی جو مستقبل کے حسین سبزہ زاروں کی طرف جا رہی ہو۔ رات کو یہ سڑک کسی گمنام جزیرے کا خواب انگیز راستہ معلوم ہوتا تھا۔ جب ساون کی جھڑیاں لگتی تھیں تو بارش میں اس پر سکون خالی خالی سڑک پر ایک ایسی جنگلی عورت کا گمان ہوتا تھا سنسان جنگل میں اکیلی بارش میں نکل آئی ہو۔

جوں جوں لوگوں کے دل تنگ ہوتے گئے، ڈیوس روڈ کشادہ ہوتی گئی۔ درختوں پر کلہاڑے چلتے گئے۔ اور پھر وہ وقت آیا کہ اصل سڑک کی جگہ ایک ایسی سڑک نمودار ہو گئی جس کا اصل سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ کبھی یہ سڑک فطرت کی آغوش میں سانس لینے والی ایک آزاد جنگلی لڑکی تھی جو جنگل کی بارش میں بے فکری سے نہایا کرتی تھی اور آج یہ سڑک مجھے ایک ایسی بھکاری عورت کی طرح دکھائی دیتی ہے جس

کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں، جس کے بالوں میں گرد جمی ہے اور جو خوفزدہ آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سڑک پار کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ (یادوں کے گلاب)

اپنے مخصوص انداز میں ماضی کے کسی دلچسپ واقعے کا ذکر کرنا تو اے حمید سے سیکھئے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

غفور بٹ ہفت روزہ اسکرین لائٹ کا مالک اور ایڈیٹر تھا۔ دوسری منزل پر اس کا دفتر تھا جہاں ہم شاعر ادیب تقریباً روزانہ شام کو مل بیٹھے تھے۔ ہم سب فاقہ مست ادیب تھے۔ کبھی کبھی اشفاق احمد بھی میرے اصرار پر یہاں آ جاتا تھا۔ مبارک سینما کے مالک ملک مبارک صاحب کا انتقال ہو گیا۔ غفور بٹ سیڑھیاں چڑھ کر ہانپتا ہوا آیا اور اپنے ایڈیٹر سے مخاطب ہو کر بولا:

تجمل! ملک مبارک کی وفات پر معذرت کا چوکھٹا لگانا نہ بھولنا
تجمل نے جان بوجھ کر کہا "معذرت کا چوکھٹا؟"

غفور بٹ بولا: "ہاں یار! وہی کہ ملک مبارک کے انتقال پر ادارہ اسکرین لائٹ ان کے لواحقین سے معذرت خواہ ہے۔ (داستان گو)

اے حمید ایک اور دلچسپ واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ریگل سینما میں فلم مادام بوارے لگی۔ میں نے اور احمد راہی نے فلم دیکھنے اور اس کے بعد شیزان میں بیٹھ کر چائے اور کریون اے کے سگریٹ پینے کا پروگرام بنایا۔ اتفاق سے اس روز ہماری جیبیں بالکل خالی تھیں۔ ہم فوراً ادب لطیف کے دفتر پہنچے۔ ان دنوں ادب لطیف کو میرزا ادیب ایڈٹ کیا کرتے تھے۔

ہم نے جاتے ہی مرزا ادیب سے کہا:

میرزا صاحب! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس سال کے بہترین ادب کا انتخاب ہم کریں گے

میرزا ادیب بڑے شریف آدمی ہیں، بہت خوش ہوئے، بولے:

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ احمد راہی صاحب حصہ نظم مرتب کر لیں گے اور آپ افسانوی ادب کا انتخاب کر لیں۔“

ہم نے کہا: ”تو ایسا کریں کہ ہمیں پچھلے سال کے جس قدر انڈیا اور پاکستان کے ادبی رسالے دفتر میں

موجود ہیں، دے دیجیے تاکہ ہم انہیں پڑھنا شروع کر دیں“

میرزا صاحب خوش ہو کر بولے: ”ضرور۔۔ ضرور“

اس کے آدھے گھنٹے بعد جب ہم ادب لطیف کے دفتر سے باہر نکلے تو ہم نے ادبی رسالوں کے دو بھاری

بھر کم پلندے اٹھا رکھے تھے۔ آپ یقین کریں کہ ہم وہاں سے نکل کر سیدھا موری دروازے کے باہر

گندے نالے کے پاس ردی خریدنے والے ایک دکاندار کے پاس گئے اور سارے ادبی رسالے سات

یا آٹھ روپوں میں فروخت کر دئے۔ اس شام میں نے اور احمد راہی نے بڑی عیاشی کی۔ یعنی مادام بوارے

فلم بھی دیکھی اور شیزان میں بیٹھ کر کیک پیسٹری بھی اڑاتے اور کریون اے کے سگریٹ بھی پیتے رہے۔

اس کے بعد تقریباً دوسرے تیسرے روز میرزا ادیب ہم سے پوچھ لیتے:

”بھئی انتخاب کا مسودہ کہاں ہے“

ہم ہمیشہ یہی جواب دیتے: ”بس دو ایک دن میں تیار ہو جائے گا۔ ہم دراصل بڑی ذمہ داری سے کام

کر رہے ہیں۔“ (یادوں کے گلاب)

ہمارے ممدوح کو اپنی تحریر کے ذریعے پڑھنے والے کو اس کرنے کا فن بھی آتا ہے۔ سعادت حسن منٹو

سے اپنی آخری ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میو اسپتال کی دوسری منزل کے میڈیکل وارڈ میں دروازے کے ساتھ ہی ان کا بستر لگا تھا۔ منٹو صاحب بستر پر نیم دراز تھے اور ان کی بڑی ہمشیرہ ان کو چچ کے ساتھ سوپ پلانے کو کوشش کر رہی تھیں۔ میں خاموشی سے بستر کے ساتھ بیچ پر بیٹھ گیا۔ منٹو صاحب بے حد نحیف ہو گئے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل کو بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ منٹو صاحب نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا:

اب کیسی طبیعت ہے منٹو صاحب ؟

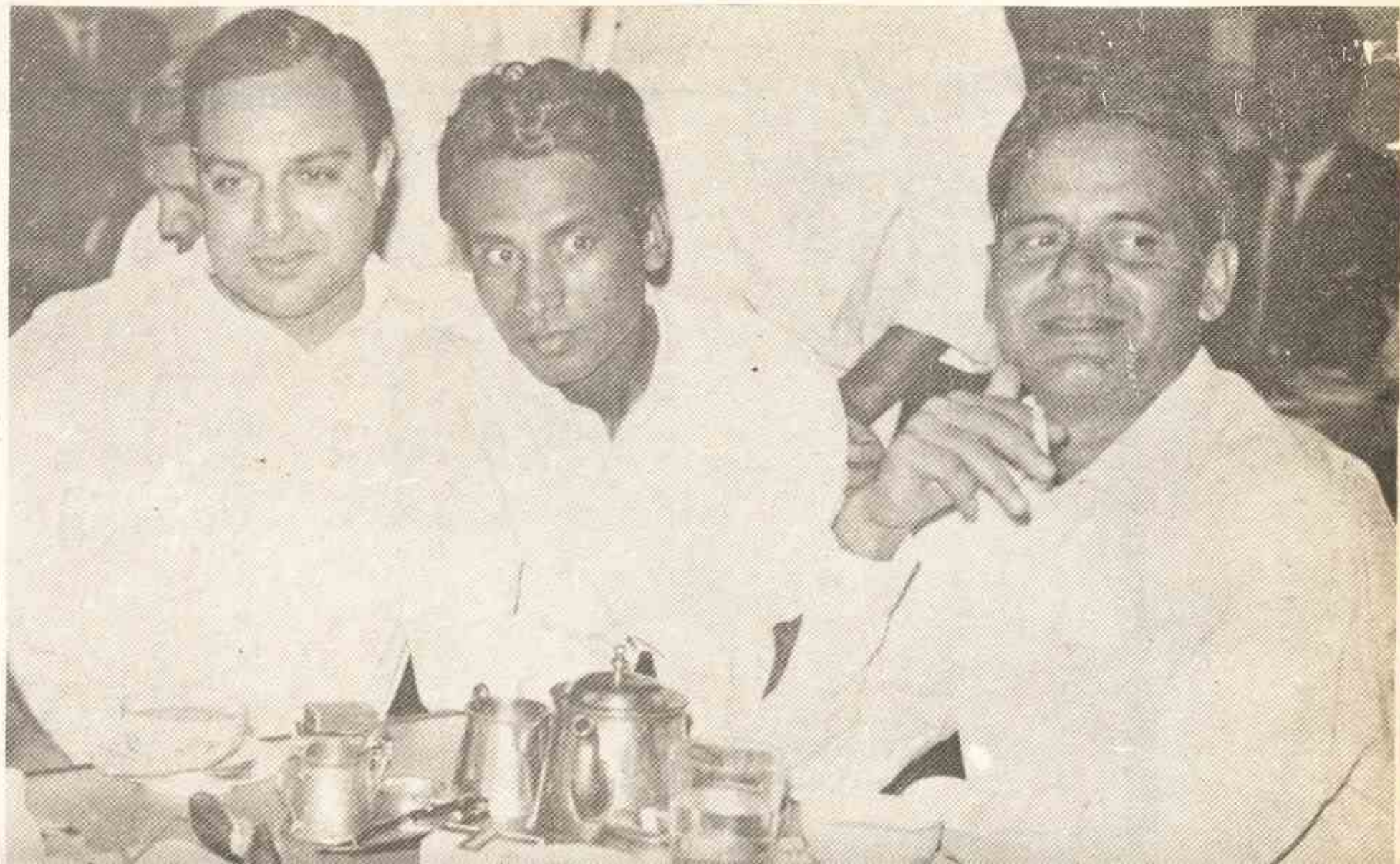
اس عظیم افسانہ نگار کے کمزور چہرے پر ایک خفیف سا اداس تبسم ابھرا اور صرف اتنا کہا:
دیکھ لو خوجہ!

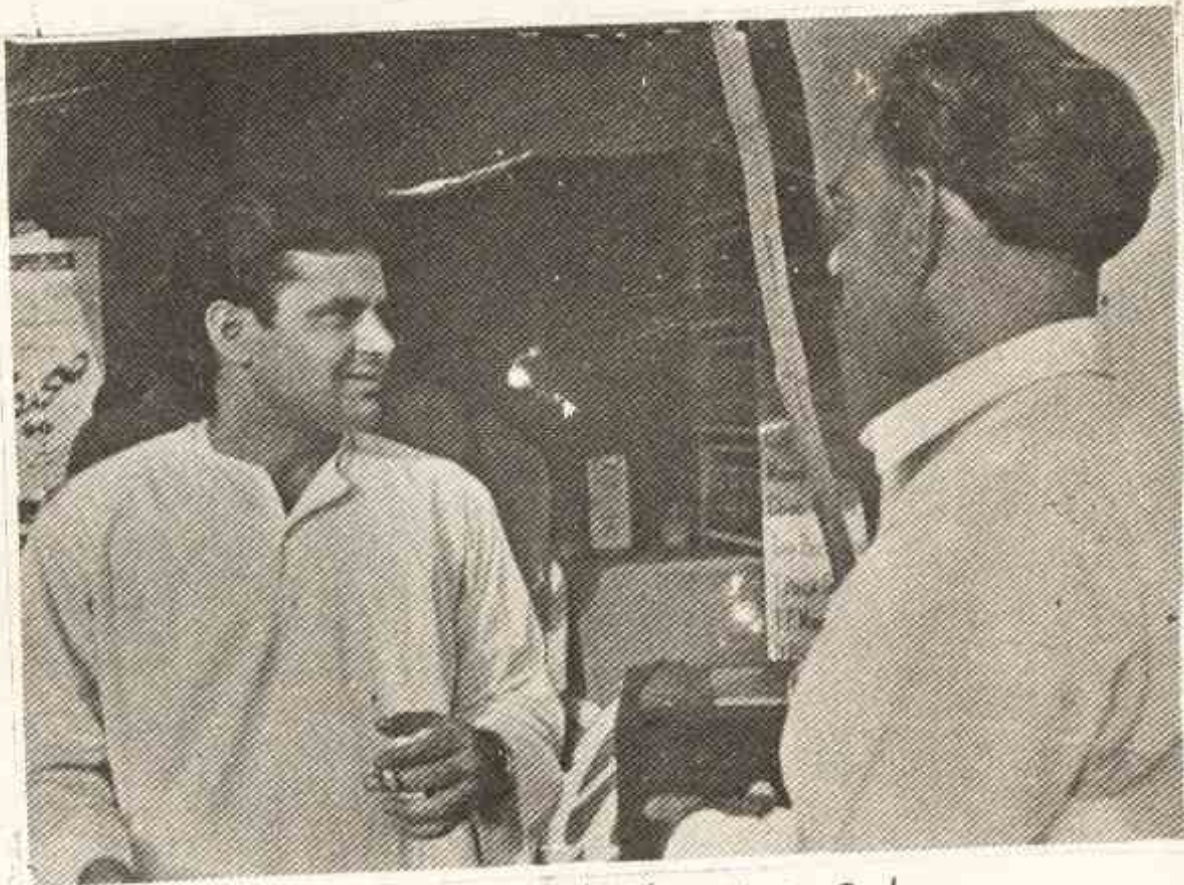
اور اس کے کچھ ہی روز بعد سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔ (یادوں کے گلاب)

اے حمید لکھتے ہیں کہ نریش کمار شاد جب دہلی سے لاہور آیا تو سعادت حسن منٹو کی قبر پر جا کر بہت رویا اور پھر کہا: ”خدا مسلمانوں کو خوش رکھے۔ ہمارے پیاروں کا نشان (قبر) تو بنا دیتے ہیں۔“

اپنی ایک تحریر میں اے حمید نے یہ بات لکھی تھی کہ میں اپنے فلاں بیمار دوست کو بستر مرگ پر دیکھنے نہیں گیا اس لیے کہ میں جن سے محبت کرتا ہوں ان کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔
حمید صاحب! ہم آپ کو اس حالت میں دیکھنے کا حوصلہ کہاں سے لائیں ؟

اے حمید
ابراہیم جلیبی
ایک
چائے
کی
دعوت
میں





اے حمید اور اصغر سلیم
(پاک فٹے ہاؤس کے باہر)

اے حمید کی دوسری برسی راشد اشرف۔ ۷ مئی ۲۰۱۳۔ کراچی

ناول آپ نے پڑھا۔ یہ تحریر اس مصنف کی ہے جس نے تمام عمر سوائے لکھنے کے، اور کوئی کام نہ کیا۔ جناب اے حمید نے ریڈیو کی ملازمت تو روٹی تو کما کھائے مچھنڈر کے مصداق اختیار کی تھی۔ ان کی اصل دلچسپی تو صرف اور صرف لکھنے ہی میں رہی تھی۔ لاکھوں معصوم ذہنوں کی تربیت کرنے والے اس درویش صفت مصنف کی دوسری برسی بھی ۲۹ اپریل ۲۰۱۳ کو خاموشی سے گزر گئی، گویا برسی نہ ہوئی، بے حسی ہو گئی۔ حمید صاحب کے پرستار کسی ٹی وی چینل پر، کسی اخبار میں ایک کالمی خبر کے منتظر ہی رہ گئے۔ شاید ان میں سے کئی ایسے رہے ہوں جنہوں نے اس شخص کی تحریروں کو پڑھ کر ہی زندگی میں کوئی مقام پایا ہو، چار لوگوں میں بات کرنے کا سلیقہ اپنایا ہو۔

شہرت بخاری نے اپنی خود نوشت کھوئے ہوؤں کی جستجو میں لکھا تھا کہ یہ موت مجھے کہیں مجسم حالت میں مل جائے تو میں اس کا منہ نوچ لوں، کلیجہ چبالوں۔ یہ ڈائن بار بار ہمارے پیاروں کو ہم سے جدا کر دیتی ہے۔

موت لے جائے گی مہ پاروں کو
ہائے یہ لوگ بھی مرجائیں گے

لیکن صاحبو! موت تو برحق ہے۔۔۔ اپنا وار کرتی رہے گی۔ علم تصوف میں بتایا جاتا ہے کہ زمانے میں ہمہ وقت ”حشر نشر“ کا سلسلہ جاری ہے۔۔۔۔۔ ایک سمت سے ہر لحظہ مخلوقات کو دنیا میں نشر کیا (پھیلایا)

جار ہا ہے اور دوسری جانب انہیں حشر (جمع ہونے/سمیٹے جانے) کا سامنا ہے۔ یوں زمانے کی گود میں ازل سے ترتیب و ابتری حرکت میں ہیں، اور رونے زمین پر اسی طور ابد تک محبت اور موت کی نبرد آزمائی جاری رہے گی۔ اللہ تعالیٰ کافر مان ہے (ترجمہ): "یہی ہے ازل سے تیرے رب کا طریقہ اور تو ابد تک اس میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا۔"

فیض لدھیانوی (وفات: ۶ جنوری ۱۹۹۵ء لاہور) کا کیا خوب اور منفرد شعر ہے:

میں ہوں ناواقف مگر ہر سال آتی ہے ضرور
فیض جس کو کل کہیں گے میری تاریخ وفات

اے حمید صاحب نے اپنے ایک یادگار ناول ڈربے (مطبوعہ ۱۹۶۰ء) میں ایک گورکن کی زبانی موت کے فلسفے پر سادہ و دلنشین انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اس گورکن کی ہر نصیحت کسی نہ کسی مقولے پر ختم ہوا کرتی۔ وہ پڑھا لکھا بالکل نہ تھا مگر اس کی باتیں دور دور کی خبر لایا کرتیں۔ موت کے فلسفے پر وہ اس قدر آسانی سے روشنی ڈالا کرتا کہ ہر لفظ جگنو کی مانند چمک چمک کر اپنا مفہوم بتا دیتا تھا:

"لوگ موت سے خواہ مخواہ ڈرتے ہیں۔ سچ پوچھو تو زندگی کے لیے یہ بڑی ضروری شے ہے۔ ہمیں پھول کیوں اچھے لگتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے کھلتے ہیں۔ اور پھر مرنے سے ہمیں نقصان ہی کیا ہوتا ہے۔ یہی نا کہ ہم اس دنیا میں باقی نہیں رہتے، تو اس میں حرج کی بات کیا ہے۔ اگر موت نہ ہوتی تو لوگ پہاڑوں سے کودتے، پتھر باندھ کر دریاؤں میں چھلانگ لگاتے،

انجن تلے سر دیتے۔ پھر سوچو زندگی کتنی گھناؤنی ہوتی۔ بھئی میں تو ہنسی خوشی جان دوں گا۔ موت کا استقبال تھوڑی صورت ہونا چاہیے۔ برخوردار یہ سب دکھوں کا آخری علاج ہے۔

کہتے ہیں اگلے وقتوں میں روح قبض کرونے پر مامور فرشتے کو آتا دیکھ کر لوگ دشنام طرازی کیا کرتے تھے۔ طے پایا کہ اس سے بچنے کے لیے موت کے مختلف ذرائع مقرر کر دیے جائیں۔ لہذا ہم نے دیکھا کہ اے حمید صاحب نمونیہ کے شدید حملے کا شکار ہوئے اور تقریباً دو ماہ تک اسپتال میں داخل رہنے کے بعد ۲۹ اپریل ۲۰۱۱ کی رات دو بجے انتقال کر گئے۔ انا اللہ وانا علیہ راجعون

وہ تمام عمر سکرآت کے اس عالم سے محفوظ رہے جس سے خاص کر ہمارے معاشرے کا کم و بیش ہر ادیب و شاعر گزرتا ہے یعنی زندگی میں قدر نہ ہونے کا احساس۔ اے حمید صاحب کو ان کے چاہنے والوں سے بے اندازہ محبت ملی!

ان کی اہلیہ اسپتال میں پچھلے دو ماہ سے مقیم تھیں جہاں پنجاب حکومت نے ان کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیا تھا۔ ان کو اسپتال انتظامیہ نے رات دو بجے اطلاع دی کہ حمید صاحب کی حالت نازک ہے۔ جب وہ کمرے میں پہنچیں تو حمید صاحب جاچکے تھے!۔۔۔ اچانک ان کے جسم میں پانی بھرنا شروع ہو گیا تھا اور دو بجے ان کا انتقال ہو گیا۔ مجھ سے گفتگو کرتے وقت حمید صاحب کی اہلیہ کا لہجہ پرسکون تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں:

حمید صاحب کے چہرے پر بڑا سکون تھا اور اس کئی لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ انتقال کے بعد ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

میں نے دریافت کیا کہ اس وقت ان کا جسدِ خاکی کہاں ہے تو ان کی اہلیہ نے بتایا کہ ابھی ابھی ان کو اسی کمرے میں لایا گیا ہے جہاں میں (رقم) ۲۰۰۸ میں ان سے ملاقات کی غرض سے دیر گئے تک بیٹھا رہا تھا۔

چشمِ تصور سے میں نے وہ منظر دیکھا اور بوجھل دل کے ساتھ روایتی تعزیتی جملے کا سہارا لیا:
اللہ آپ کو وقت کے ساتھ صبر دے!

پیٹا! وقت تو میرے لیے رک گیا ہے، ختم ہو گیا ہے، تو یہ صبر کیسے آئے گا؟
حمید صاحب کی اہلیہ کے اس جواب سے میری آواز میرا ساتھ چھوڑ گئی۔

اے حمید صاحب اپنی خودنوشت تحریر کر رہے تھے اور میں اکثر ان سے اس بارے میں فون پر دریافت کر لیا کرتا تھا۔

بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ انہوں نے اپنی خودنوشت کا نام ”چھوڑ آئے ہم وہ گلیاں“ تجویز کیا تھا۔

فارغ بخاری کی خودنوشت ”مسافین“ کا آخری باب ان کے پیٹے قمر عباس نے تحریر کیا تھا جو خود بھی ایک مصنف تھے اور بعد ازاں ۷ مئی ۲۰۰۷ کے روز پشاور میں قتل کر دئے گئے تھے۔

حمید صاحب! اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی عنایتوں کے سائے تلے ہمیشہ رکھے۔۔۔ لیکن آپ کی خودنوشت کا آخری باب کون تحریر کرے گا؟